اردو ادب میں

طنز و مزاح

غلام احمد فرقت کاکوروی

شائع کردہ ——

ادارۂ فروغ اردو ۳۷ امین آباد لکھنؤ

پاکستان میں ملنے کا پتہ ——

مبارک بک ڈپو بندر روڈ مقابل
ڈینسو ہال کراچی ۲

قیمت —— دس روپیہ صرف

مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ

سنہ ۱۹۵۷ء

فہرست

حصۂ نظم

نمبر شمار	مصنف	صفحہ
۱	مقدمہ	۹
	ہجویات	
۱	جعفر زٹلی	۲۶۹
۲	سودا	۲۷۱
۳	انشاء	۲۷۶
۴	مصحفی	۲۷۸
	ریختی گو	
۱	مرزا سعادت یار خاں رنگین	۲۸۷
۲	انشاء اللہ خاں انشاء	۲۸۸
۳	جان صاحب	۲۹۳
۴	نظیر اکبر آبادی	۲۹۷
۵	شیخ ولی محمد نظیر اکبر آبادی	۳۰۰
۶	غالب	۳۰۳
۷	اکبر الہ آبادی	۳۰۹

نمبر شمار	مصنف	صفحہ
	اودھ پنچ کے شعرا کا پہلا دور	
۱	سجاد حسین	۳۱۴
۲	مرزا مچھو بیگ ستم ظریف	۳۱۵
۳	پنڈت تربھون ناتھ ہجر	۳۱۶
۴	شہباز	۳۱۷
۵	منشی جوالا پرشاد برق	۳۲۰
۶	ظریف	۳۲۳
۷	اودھ پنچ کی شاعری کا دوسرا دور متفرق اشعار	۳۲۶
۸	اقبال کے طنزیہ اشعار	۳۵۶
۹	جوش ملیح آبادی	۳۶۰
۱۰	علامہ شبلی	۳۶۵
۱۱	ظفر علی خاں	۳۶۸
۱۲	بوم میرٹھی	۳۷۰
۱۳	سید مقبول حسین ظریف	۳۷۱
۱۴	عبداللہ صاحب ناصر	۳۷۴
۱۵	برگزیدہ شعرا شہباز بلند پرواز	۳۷۵
۱۶	سید محمد جعفری	۳۷۶
۱۷	فرقت کاکوروی	۳۸۱
۱۸	کنھیا لال کپور	۳۹۷

فہرست حصۂ نثر

صفحہ	مصنف	عنوان	نمبر شمار
۴۰۵	غالب	خطوط غالب	۱
۴۲۳	منشی سجاد حسین	انڈے بچے والی چیل چلہاڑ	۲
۴۳۵	نواب سید محمد آزاد	مولانا آزاد کی پرانی روشنی کی نئی ڈکشنری	۳
۴۴۰	پنڈت تربھون ناتھ ہجر	نشہ کی ترنگ	۴
۴۴۳	احمد علی شوق	عشق کیا شے ہے کسی کامل سے پوچھا چاہیے	۵
۴۴۹	رتن ناتھ سرشار	میاں آزاد اور بانکے	۶
۴۶۵	منشی جوالا پرشاد برق	البرٹ بل	۷
۴۷۹	حکیم ممتاز حسین عثمانی	منطق آرا بیگم بنام مسٹر چرچل	۸
۴۸۷		مولانا پنچ کی نوٹ بک	۹
۴۹۷	مولانا ابوالکلام آزاد	الغاشیہ	۱۰
۵۰۹	ظفر علی خاں	ایڈیٹر کا حشر	۱۱
۵۱۷	سلطان حیدر جوش	قرض و مقراض	۱۲
۵۲۵	مولانا عبدالماجد دریابادی	ایک مکالمہ	۱۳
۵۴۱	خواجہ حسن نظامی	خرام بکری	۱۴
۵۴۵	مرزا عظیم بیگ چغتائی	الشذری	۱۵
۵۵۵	ریاض خیر آبادی	حسن وضع	۱۶
۵۶۱	سید محفوظ علی بدایونی	مسٹر صاحب دین	۱۷
۵۷۷	قاضی عبدالغفار	تمیسواں خط	۱۸

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۱۹	محاسن و معاصی	سجاد انصاری	۵۸۵
۲۰	پٹنا	مرزا فرحت اللہ بیگ	۵۹۳
۲۱	لندھن کا عتابی دربار	ملا رموزی	۶۰۵
۲۲	معترضہ جملے	میاں عبدالعزیز	۶۱۳
۲۳	ارہر کا کھیت	رشید احمد صدیقی	۶۲۷
۲۴	مرحوم کی یاد میں	پطرس بخاری	۶۳۹
۲۵	چھلانگ	شوکت تھانوی	۶۶۳
۲۶	غالب اور گوئٹے	حاجی لق لق	۶۷۵
۲۷	گھر	آوارہ	۶۸۷
۲۸	غالب جدید شعراء کی ایک مجلس میں	کنھیا لال کپور	۶۹۵
۲۹	فلمی قاعدہ	کرشن چندر	۷۱۵
۳۰	عینک اتر جانے کے بعد	علامہ مضحک	۷۲۹
۳۱	ہم نہیں پٹے	تمکین کاظمی	۷۵۳
۳۲	بے پر کی	ایم اسلم	۷۶۴
۳۳	چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ	نیاز فتح پوری	۷۷۱
۳۴	بیوی آخر بیوی ہے	ناکارہ حیدرآبادی	۷۸۹
۳۵	تعاون	سعادت حسن منٹو	۸۰۲
۳۶	جشن جمہوریت کی ایک دوپہر	غلام احمد فرقت کاکوروی	۸۰۷

معنون

"اُن تنقید نگاروں کے نام

جو

میری طرح یتیم ہیں"

عرض کرنے سے پہلے

اس کتاب کی خامیوں کی جملہ ذمہ داریوں کو اگر نیک نیتی، فراخ حوصلگی اور "خلبنسہت" کے ساتھ حسب مراتب تقسیم کیا جائے تو اخلاقی نقطۂ نظر سے اُن کی تقسیم اس انداز میں ہونا چاہیئے۔

۱۔ اگر مصنف کی خامیاں ہوں تو آنکھ بند کر کے اُنھیں کاتب کے سر تھوپ دیجئے مصنف کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔

۲۔ اگر تصنیف یا تالیف میں مواد کی کمی محسوس ہو تو اُس کی ذمہ دار ہندوستان کی بدمذاق مائیں ہیں جنھوں نے ظرافت نگار پیدا کرنے میں بُخل سے کام لیا۔

۳۔ اگر شعراء یا نثر نگاروں کی ترتیب میں کوئی خامی محسوس ہو تو اُس کا ذمہ دار براہ راست پروفیسر سید ظہیر الدین علوی رجسٹرار جامعہ اُردو علی گڑھ کو قرار دیا جائے جنھوں نے مجھ "بے خبر کو راہبر منزل بنا دیا۔"

۴۔ اگر کتاب خفی لکھی گئی ہو تو اُسے قلم کی خفیف الحرکاتی پر محمول کیا جائے۔

۵۔ اگر لکھائی چھپائی صاف ستھری نہ ہو تو اس کے ذمہ دار سرفراز برقی پریس کے مہتمم انصار حسین صاحب رضوی پاٹی تم لکھنوی اور ان کی نفاست پسندی۔

۶۔ کتاب میں اگر کوئی اجتہادی غلطی سرزد ہو گئی ہو تو اس کی ذمہ داری "قریب الجہد" مولانا سید سلیمان عباس پر عاید ہوتی ہے جو کتاب کے مسودہ پر طائرانہ نظر ڈال چکے ہیں۔

۷۔ اگر کاغذ خراب لگ گیا ہو تو اس کی ذمہ دار کاغذ پر ڈیوٹی بڑھانے والی ان

ڈپوٹی حکومت وقت۔

۸۔ گرد پوش اور ٹائٹل کے آرٹ پیپر کی خرابی کی ذمہ داری سائنس والوں پہ عاید ہوتی ہے جنھوں نے ہر اُس چیز کی لٹیا ڈبو رکھی ہے جو آرٹ سے متعلق ہے۔

۹۔ اگر کتاب کم بکے تو اس کی ذمہ دار ہندوستانیوں کی اُردو سے عام بیزاری اور بکری ٹیکس کی کشادہ دلی۔

۱۰۔ اگر اقتباسات کے دونوں ناکوں پر واوین رہ گئے ہوں تو اِس کا ذمہ دار حسن ظرافت کو قرار دیا جائے۔

۱۱۔ اگر کتاب خریدنے کے بعد کسی ادیب یا شاعر کے چہرے سے افسردگی کے آثار ظاہر ہوں تو اس کی ذمہ دار اُن کی رونی صورت ہوگی۔

۱۲۔ جو شعرا یا نثر نگار اس کتاب کو تشنہ قرار دیں تو سمجھ لیجئے کہ اس میں اُن کا ذکر نہیں ہے اور اس کی ذمہ دار اُن کی صلاحیتوں کی کمی ہے جس نے اُنھیں اس مجموعے میں شامل نہ ہونے دیا۔

۱۳۔ اگر یہ کتاب کسی انعام کی مستحق نہ قرار پائے تو اس کی ذمہ دار اُن حضرات کی بالغ نظری ہوگی جن کو نابالغ کتابوں سے شغف ہے۔

۱۴۔ اور اگر مذکورہ بالا خامیوں میں سے کوئی خامی بھی اس کتاب میں نہ نظر آئے جو ناممکن ہے تو

سرِ دوستاں سلامت تو بہ خنجر آزمائی

غلام احمد فرقت کاکوروی

۱۹۵۷ء

اقسام ظرافت

آسکر وائلڈ نے ظرافت کی تعریف اس طرح پر کی ہے کہ "اگر کسی سے سچی بات کہلوانا ہو تو اُسے ایک نقاب دے دو۔ ظرافت ایسی ہی ایک نقاب ہے" فرائڈ نے اسے sense in nonsense کہا ہے، یعنی بے تکی بات میں تک کی بات۔

فارسی میں ظرافت کے لغوی معنے دانائی اور خوش طبعی کے ہیں مگر اُردو میں لفظ ظرافت بڑے وسیع معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے تحت ہزل، پھکڑ، فحاشی، ضلع جگت، فقرے بازی، پھبتی، لطیفہ، تمسخر وغیرہ سب ہی چیزیں آ جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی میں ایک لفظ Humoor ہے جسے اُردو میں مزاح کہتے ہیں اور اس مزاح ہی میں ایک چیز طنز ہے اور طنز سے بڑی حد تک ملتی جلتی چیز تعریض ہے جسے انگریزی میں Wit کہتے ہیں۔ وٹ بھی ایک طرح کا طنز ہے مگر یہ طنز سے ہلکے درجے کی چیز ہے۔ اس کے بعد اُردو میں ہجو اور ریختی

تحریات بھی اسی مزاح کے تحت آتی ہیں۔

ہزل۔ پھکڑ اور فحاشی فارسی میں ہزل کے لغوی معنی ہیں سخن بیہودہ و مسخرگی کے۔ اردو میں ہزل ظرافت کے اس آخری درجہ کو کہتے ہیں جس میں کلام مذاق سلیم سے گر جائے مگر تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے نہ جانے دے اور عریانی اور ہزل کے بعد پھکڑ اور پھکڑ کے بعد فحاشی کے حدود شروع ہو جاتے ہیں۔ پھکڑ فحاشی اور عریانی میں بھی بہت ہی باریک فرق ہے مثلاً آپ کسی کو ابے تبے سے مخاطب کریں اور اس کے بعد آپ اُو سالا کہہ دیں۔ ابے تبے تک پھکڑ ہے "سالے" کے استعمال سے اس میں پھکڑ پن پیدا ہو گیا اور سالے کے حدود سے تجاوز کر کے آپ فحاشی میں داخل ہو جاتے ہیں، عریانی ہزل سے ہلکے درجہ کی چیز ہے۔ ان کا فرق مندرجہ ذیل اشعار سے پورے طور پر واضح ہو جائے گا۔

ظرافت:۔
کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ہزل:۔
پہلے عورت جفتی تھی اب سارا عالم جفتا ہے

عریانی:۔
بھی کلیاں کام کی ہوتی نہیں
کیوں مرا جاتا ہے کمسن کے لئے

پھکڑ:۔
یورپ کی لیڈیاں بھی ترکی حرم میں آئیں
ملحوظ رکھے دنیا اس رشتۂ بہم کو

پکڑ کر کے اس پہ قبضہ کر دیں گے اہلِ یورپ
نسا لونگا سے اب تو بدلا جاتا ہے ہم کو

تجاہلِ عارفانہ:۔
ایک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو ابھارا
اک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا
پتلون میں یہ تن گیا وہ ساڑے میں پھیلی
پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اتارا

ضلع جگت ضلع اور جگت اصل میں دو زبانوں کے دو جدا جدا لفظ ہیں اور لغت میں بھی دونوں کے معنے ایک دوسرے سے جدا ہیں مگر مناسبت کے سبب دونوں کو ایک ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔

ضلع ۔ عربی زبان میں بسلی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اُردو میں اسے رعایت لفظی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں ۔ مثلاً اُردو میں کہتے ہیں کہ فلاں صاحب ضلع بولتے ہیں یا فلاں آدمی ضلع باز ہے ۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان کے کلام میں رعایت لفظی پائی جاتی ہے۔

جگت ہندی کا لفظ ہے جس کے اصلی معنے حکمت اور دانائی کے ہیں لیکن اُردو میں اہلِ زبان اسے ظرافت اور بذلہ سنجی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں اسی لئے اُردو زبان میں لطیفہ گو کو جگت باز اور لطیفہ گوئی کو جگت بازی کہتے ہیں جگت لڑنا بھی محاورہ ہے ۔ مرزا شوق اپنی مثنوی میں ایک جگہ کہتے ہیں۔

جو ٹی بیٹی تھی باسی ہاروں سے
لڑ رہی تھی جگت کہاروں سے

ضلع جگت کی مثال ملاحظہ ہو۔

قیمت بوسہ جو پوچھی بولے۔ بے قیمت ہے یہ
آج بے قیمت ہی لیں گے جنس بے قیمت کو ہم (احسان دہلوی)

ٹپک رہی ہے جو یہ پھڑی سی بھوں میں جب سے
اس کی ابتک نہ گلی دال نہ چانول کے کا (انشا)

پھبتی اور فقرے بازی

نقرہ چست کرنا۔ آوازہ کسنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے یہ بھی ظرافت کی ایک قسم ہے۔ اس میں کسی مزاحیہ یا سنجیدہ بات میں ایک قسم کی ظریفانہ چوٹ شامل ہوتی ہے۔ جس سے انسان سن کر ہنس پڑتا ہے۔ مثلاً کسی دبلے آدمی کو دیکھ کر کہیں جناب آپ آدمی ہیں یا کسی کا لگھا۔ اسے پھبتی کہیں گے۔ پھبتی تقریباً دنیا کی تمام زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ عرب میں ناموں اور کنیتوں کے ذریعہ پھبتی کسی جاتی تھی۔ فارسی زبان میں پھبتی کا رواج قدیم زمانے سے تھا مگر عربوں سے مختلف تھا اور فارسی میں پھبتی ویسی ہی تھی جیسی کہ ہماری زبان میں ہے۔ چنانچہ ایک شاعر پر جس کا تخلص تنگی تھا حکیم ابو الفتح نے پھبتی کہی "تنگی مادر زاد"۔ محمد رضائے کاشی کی عادت تھی کہ جب کوئی بات کہتا تو نہایت قرأت کے ساتھ کہتا اس پر لوگوں نے پھبتی کہی (قاری روزمرہ) پھبتی اور فقرے بازی میں بہت باریک فرق ہے۔ ایک بہت زیادہ تن و توش کے آدمی کو ایک کرسی میں پھنسا ہوا دیکھ کر رشید احمد صدیقی نے کہا۔

تو گوئی ہمہ تخت مہراب بود

لطیفہ اُن چھوٹے سے واقعہ کو کہتے ہیں جس میں ظرافت کی چاشنی خواہ الفاظ سے یا کسی فقرے سے پیدا کرکے اس انداز میں بیان کی جائے کہ سننے والوں کو ہنسی آجائے لطیفہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اختصار سے کام لیا جائے حسن بیان اور حسن ادا کی قید بہت ضروری ہے اس میں دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ فی نفسہٖ واقعہ کا دلچسپ ہونا اور اندازِ بیان کی ندرت۔ مثلاً اکبر الٰہ آبادی کے پاس ایک صاحب تشریف لائے حاضرین میں سے ایک نے اطلاع دی کہ ان کے گھر میں پانچویں اولاد پیدا ہوئی ہے سبھوں نے مٹھائی طلب کی اسپر اکبر نے کہا نہیں ان سے کچھ نہ طلب کرو یہ انھیں زوجہ کو بہ زمانہ عشق اپنا پورا اثاثہ نذر کر چکے ہیں، دیکھو میں نے انھیں کی مثال سے کیا شعر کہا ہے ؎

عاشقی قید شریعت میں جب آجاتی ہے
جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے

تمسخر تمسخر میں متین اور سنجیدہ چیزوں کو مضحک یا مضحک چیزوں کو مصنوعی طور پر متین بنا کر پیش کیا جاتا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کسی شخص کے بارے میں کوئی ایسی بات کہی جائے جس میں اُس شخص کا ہلکا پن اور انسانی معیار سے پست ہونا پایا جائے۔ غالب کا مندرجہ ذیل شعر اس کی ایک مثال ہے۔

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

مزاح

ظرافت کی سب سے اعلیٰ قسم مزاح ہے۔ برگساں کا کہنا ہے کہ "مزاح کی اپیل براہ راست ذہانت سے ہے۔" ہر مزاح قہقہا پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے مگر ہر قہقہے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ مزاح سے پیدا ہو۔ مزاح نگار پہلے اپنے اوپر ہنسنے کی کیفیت طاری کرتا ہے تب دوسروں کی کمزوری پر ہنسنا شروع کرتا ہے۔ وہ صرف تماشائی نہیں ہوتا بلکہ مبتلا تماشہ بھی ہوتا ہے۔
مزاح کا تعلق ہنسی سے تو ضرور ہے مگر اس کا خاص تعلق ہمدردی Sympathy سے ہے یعنی مزاح ایک بات یا ایک فقرے میں نہیں چھپا ہوتا بلکہ ایک مکمل بیان میں جس کے مختلف جزئیات مضحکہ خیز ضرور ہوتے ہیں مگر جس کا مکمل تاثر ہمدردی کا جذبہ طاری کرتا ہے۔

جعفر علی خاں اثر مزاح کے سلسلہ میں لکھتے ہیں

"(Humour) زندہ دلی یا بذلہ سنجی کسی بات کے مضحک اور دلچسپ پہلو کا احساس اور اس انداز سے بیان کردینا ہے کہ سننے والے کو بے اختیار ہنسی نہ آجائے تو ہونٹوں پر تبسم کی ایک لہر ضرور دوڑ جائے۔ یہ صفت کسی کسی آدمی میں ودیعت ہوتی ہے ایک نوع کی افتاد طبیعت ہے سیکھ کر یہ چیز نہیں بن سکتی۔"

George Meredeth says :-
"It is the sympathy, the appreciation the love which include the follies of Dan Quixat, the prosaic

absurdities of Sancho Panza, the oddities of Bradwardine Dr. Primorse or Monk-barns and the jovial animalism of Falstaff in an embrace of contract beyond the scope of a comic poet"

جارج میریڈتھ مزاح کے مدعا کے بارے میں لکھتا ہے کہ

"ہمدردی، پسندیدگی، اور حسیت ہی تو ہیں جن میں ڈان کوئکزوٹ کی حماقتیں سینکو پینزا کی غیر شاعرانہ بیہودگیاں، بریڈوارڈائن، ڈاکٹر پرمروز یا مانک برنس کی بوالعجبیاں اور فالسٹاف کی حیوانی سطح پر خوش فعلیاں شامل ہیں جو متضاد اشیاء کو بغلگیر (متحد) کر دیتی ہیں اور جو بہنسوڑ (تمسخر پسند) شاعر کے حدود تخیل سے باہر ہیں۔"

شوخی اور مزاح کی مثال ملاحظہ ہو۔

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

طنز

طنز جسے انگریزی زبان میں Satire کہتے ہیں اس کے لئے اردو زبان میں کوئی لفظ نہیں ہے جس کے ذریعہ اس کا صحیح مفہوم ادا ہو سکے۔ لے دے کر ہجو، ہلیح یا طنز کا لفظ اس کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے جو اس کے معنوں سے قریب تر ہے۔ Satire کی اصلی جولان گاہ سماج یا سوسائٹی کی برائیوں کمزوریوں اور حماقتوں کو مضحکہ خیز بنا کر پیش کرنا ہے مگر اس میں

تہذیب اور ادبیت کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی ضرورت ہے ورنہ طنز نگار پھکڑ پنے اور بھنڈیتی کے حدود میں داخل ہو جائے گا۔ صحیح طنز وہ ہے جس میں تمسخر زیادہ ہو، زہرناکی کم اور کم سے کم احساس برتری ہو۔

غالب زاہد پر طنز اس انداز میں کرتے ہیں

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

یا اپنے اوپر طنز کرتے ہیں۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

نغز جس طرح humour کے لئے اردو میں کوئی لفظ ابھی تک وضع نہیں ہو سکا اسی طرح wit کے لئے کوئی لفظ اردو زبان میں ایسا نہیں ملتا ہے جو اس کا پورا پورا مفہوم ادا کر سکے۔ نغز ذہانت اور متین شوخی سے ملی ہوئی ایک چیز ہے جو برجستہ اور برمحل استعمال ہو۔ wit یعنی نغز ایک طرف تو ذہانت سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری طرف متین شوخی سے ایک ذہین آدمی سمجھ کی تیزی کی بنا پر دو چیزوں میں ہنسی اڑانے کے قابل نکتہ نکال لیتا ہے اور اس کو جس بات کے ذریعہ ادا کرتا ہے اُسے witty بات کہتے ہیں۔ وٹ کو ایک حد تک برمحل فقرہ یا برجستہ حاضر جوابی کہا جا سکتا ہے۔ مگر wit مزاح سے مختلف چیز ہے اور اسی طرح طنز اور نغز میں بڑا فرق ہے۔ مزاح اور طنز کی بہ نسبت نغز میں سنجیدگی اور فکر کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ یہ چیز نہ اصل

ذہانت اور ادب کی پیداوار ہے۔ مقصد یہ کہ کوئی بات اس انداز میں کہی جائے کہ سننے والا پہلے حیران ہو اس کے بعد اُس سے لطف اندوز ہو۔ مثلاً اکبر ہی نے ایک ہی مفہوم کو دو طریقے سے ادا کیا ہے جس میں ایک میں مزاح ہے اور دوسرے میں لغز یا WIT ہے ملاحظہ ہو۔

مزاح:۔
حسرت بہت ترقیٔ دختر کی تھی انھیں
پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

لغز:۔
بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اسی طرح طنز و مزاح میں فرق ہے۔ مثلاً

مزاح:۔
دخترِ رز نے اٹھا رکھی ہے آفت سر پر
خیریت گذری کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا

طنز:۔
فکر ساری کی ہے نہ کمنگن کی
اب تو دھن ہے انھیں فر نگن کی

طنز کی دوسری مثال

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر

مزاح:۔
اک غل مچا کہ اس کو بھی لیسنس سے ضرور
منہ کھل چکا تھا ورنہ مرا آہ کے لئے

ریختی ریختی اُردو شاعری میں ظرافت کا ایک جزو بن گئی ورنہ یہ چیز دراصل ہندی شاعری سے لی گئی ہے جس میں عورت عاشق اور مرد معشوق کی حیثیت رکھتا ہے اُردو کے ریختی گو شعراء نے اس میں عورتوں کی زبان میں شاعری کر کے ایک مزاح پیدا کیا ہے ریختی میں عورتوں کی زبان میں اُن کے رسم و رواج اُن کے محاورات ضرب الامثال اور ان کی اصطلاحات نظم کی جاتی ہیں دراصل محض اثر آفرینی کے لئے شاعر عورت کی زبان سے اظہار عشق کرتا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو۔

اری ناداں تیں اپنے سجن کو کیوں رٹھایا ہے
رٹھا کر یوں کو جگ میں کسی نے ذوق پایا ہے

ہجو ہجو میں کئی چیزیں شامل ہوتی ہیں مثلاً طنز، طعنہ، ملامت، غصہ استہزا اور پھبتی اور دل آزار ظرافت کیونکہ اس کا مقصد محض اپنے مخالف کی مذمت کرنا ہوتا ہے۔

سودا۔
ضاحک کی اہلیہ نے ڈھول اپنے گھر دھرایا
بوجہ رات ساری ہمسایوں کو جگایا
بیٹھک میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب بلایا
تب شیخ سدو اُس پر غصہ کو کھا کے آیا
بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا

خمریات اُردو میں یہ چیز براہ راست فارسی زبان سے لی گئی ہے جس میں واعظ اور محتسب پر رندوں کی شراب نوشی کے سلسلہ میں طنز ہوتا

ہے فارسی شعراء نے اپنے یہاں۔ شیخ و واعظ، زاہد اور محتسب کو ہدف ملامت بنایا ہے اس لئے اُردو شاعری میں بھی اُن کا ذکر ملتا ہے۔ وہ لعن طعن، تمسخر اور استہزاء سے خالی نہیں ہوتا اُن کا مذاق اڑانے میں تمام شعراء نے نئی نئی راہیں اور نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں۔ ان کی عبادت ریاضت، اُن کے زہد و تقوےٰ، ان کی پاک بازی اور پاک منشی کو ریاکاری پر محمول کیا ہے۔ اُن کے جبہ و دستار ان کی عبا و قبا اُن کی خلوت و جلوت اور ان کی نشست و برخاست پر اس انداز میں آوازے کسے ہیں کہ اگر واقعی اس قسم کے لوگوں کا وجود ہوتا تو ان کو زندگی بسر کرنا دشوار ہو جاتا پھر شعراء سے اچھی خاصی خون خرابے کی نوبت آجاتی۔ میر درد کہتے ہیں

ترِ دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں (میر درد)

دینِ خدا کو زاہد رنگیں بنا رہا ہے
دنیا بدل رہی ہے مسجد کی کوٹھری میں (شوق بہرائچی)

اُردو شاعری میں طنز و ظرافت

گلستانِ ادب میں طنز و مزاح، ظرافت اور خوش طبعی، لطائف اور نغز گوئی کے بیل بوٹے ہمیشہ اُس وقت کھلے ہیں جب زبان اپنی معراجِ کمال کو پہنچی ہے جب شوخ الفاظ، منچلے محاورات اور نازک اصطلاحات نے اُس میں جنم لیا ہے اور جب الفاظ کی دستکاریاں، جواہرِ ادب کی تراش و خراش کا ملکہ پیدا ہوا ہے۔ طنز و مزاح کا پودا بڑا نفاست پسند اور نازک مزاج ہوتا ہے۔ ذرا میں سبزہ شاداب ذرا میں خشک اور بدقطع۔ پھر تربیت بھی سنتا ہے نہ چاہتا ہے اس کو تہذیب و تمدن، امن و عافیت، خوشحالی اور فارغ البالی ہی کی فضا راس آتی ہے۔ وہ بڑی ریاضت چاہتا ہے۔ اس کی پرداخت ہر باغبان کے بس کی بات نہیں۔

دراصل ہنسی جس سے ظرافت کے پودے کی آبیاری ہوتی ہے ایک فطری جذبہ ہے جو مخصوص لمحاتِ زندگی میں ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ دنیا کی ذی روح چیزوں میں صرف انسان ہی ایک ایسا حیوان ہے جو ہنستا ہے۔ بعض قدیم ماہرینِ نفسیات کا گمان تھا کہ بندر جس کو عرفِ عام میں لنگور بھی کہتے ہیں ہنستا ہے مگر جدید تحقیق کی روشنی میں یہ چیز پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ بندر ہنستا نہیں ہے بلکہ بعض اوقات اُس کے

چہرے کے اتار چڑھاؤ اُن کیفیات سے مشابہ ہو جاتے ہیں جو ہنستے وقت انسان پر طاری ہوتی ہیں۔ چہرے کے اسی اتار چڑھاؤ نے غالباً اِن ماہرین کو شک و شبہ میں ڈال دیا۔

غرض ہنسی اور دلگی کی تلاش میں ماہرین نفسیات نے تخیلات کے صحراؤں میں جو بادیہ پیمائی کی ہے انہی صحراؤں اور بیابانوں سے گذر کر ہم کو اُن شعراء اور ادباء کی بزم نشاط تک پہنچنا ہے جو تحقیق اور تدقیق کی دنیا سے بے پرواہ ہو کر ہنستے مسکراتے اور قہقہے بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی وہ برگزیدہ اور مقدس ہستیاں ہیں جنھوں نے دنیا کے آلام و مصائب کی دہکتی آگ کو اپنی مسکراہٹوں اور قہقہوں کے خنک چھینٹوں سے سرد کر کے اپنی زندگیوں کو رشک گلستاں بنایا اور بزم ادب کو ایسے حسین اور دلکش گلدستوں سے آراستہ کیا جنکی دلکشی بہت سے کمھلائے ہوئے دلوں کو ہمیشہ دعوتِ تبسم دیتی رہے گی۔

اُردو شاعری میں سب سے پہلے ہم کو ظرافت کا پرتو واعظ اور محتسب پر طنز کی صورت میں اُس وقت سے ملتا ہے جب اُردو زبان کے منہ سے دودھ کی بو آتی تھی اور جب اُردو شعراء کا کلام نیم فارسی یا نیم ہندی کے گہوارے میں پروان چڑھ رہا تھا اور اُردو کو برائے نام ہی اُردو کہا جا سکتا تھا۔ چنانچہ قلی قطب شاہ کے وقت سے جسے ابتک اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا گیا ہے اس وقت تک عام شعراء کے یہاں کم و بیش واعظ اور محتسب پر طنز ملتا ہے۔ چونکہ اُردو زبان اپنے اوزان کے اعتبار سے زیادہ تر فارسی اور عربی کی خوشہ چیں رہی ہے اس لئے علمائے سو اور عام نام نہاد واعظوں پر طنز، لعن طعن

اور پھبتیاں اُردو زبان میں خمریات کی صورت میں ظہور پذیر ہوئیں۔ اور یہ چیز فارسی ہی سے براہِ راست اُردو میں آئی۔ ظرافت جو ہنسی، دل لگی کے جذبے سے وابستہ ہے اس کے بارے میں بعض مفکرین کا کہنا ہے کہ ہنسی کا کام صرف اجتماعی تہذیب (social desciplne) ہے کیونکہ ہم صرف اُنہی چیزوں پر ہنستے ہیں جو انسان کے اطوار اور رویہ میں بے تکی بھونڈی اور عام روش سے ہٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ غالباً اسی نظریہ کی روشنی میں اگر آپ جبہ و دستار والوں کو اجتماعی تہذیب کے قوانین سے روگردانی کرتے دیکھتے ہیں تو آپ ان میں ایک بھونڈا پن پاکر ہنس دیتے ہیں اور خمریات میں چونکہ علمائے سو پر طعن ہوتا ہے اسی لئے آپ اس میں ظرافت محسوس کرتے ہیں۔ پروفیسر برگساں کے نظریہ کا اطلاق اسی وجہ سے نام نہاد محتسبین اور واعظین پر ہوتا ہے جن کے بارے میں اُردو کا ایک دل جلا شاعر کہتا ہے۔

دینِ خدا کو واعظ رنگین بنا رہا ہے
دنیا بدل رہی ہے مسجد کی کوٹھری میں

اسی واعظ اور محتسب پر طنز کے بعد اُردو میں ریختی کا رواج ہوا اور بڑے بڑے شعراء نے جبہ و دستار اور نورانی داڑھیوں کے ساتھ ہندی شاعری کے تتبع میں جب عورت کا سوانگ بھر کر عشق و محبت کے جذبات، رسم و رواج، محاورات اور اصطلاحات مزے لے لے کر اُن ہی کی زبان میں بیان کرنا شروع کیں تو فطرت انسانی کو یہ چیز اجتماعی تہذیب میں بھونڈی اور بے ہنگم نظر آئی اس لئے یہ بھی پروفسر برگساں کے نظریہ کی روشنی میں ہنسی اور تبسم کا محرک بنی۔

بعد میں محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جب زمانہ اپنی عیاشیوں اور رنگینیوں میں سرابور ہو گیا اور تفنن طبع کے طریق پر لوگوں نے اس عہد کی رسم کو تازہ کرنے کے لئے اور عیش و عشرت میں رچے ہوئے عیش نواز اور عیش پسند امراء اور بادشاہ کو خوش کر کے جب نام و نمود اور عزت و شہرت کے لئے اُن میں فحش اور بدکاری کے جذبات نظم کرنا شروع کر دیئے تو انھوں نے آپس میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے اپنی زندہ دلی کو اس منزل پر پہنچا دیا جہاں آداب مجالس اور مذاق سلیم ساتھ دینے سے قاصر رہے۔

تمدن انسانی کی ابتدا سے اہل دولت کے دربار ایک حد تک اس تفریح نما شغلے کی ترقی کے ذمہ دار ہیں کیونکہ ان کے تفریح پرور رجحانات نے ظرافت طبع افراد میں ایک قسم کی غیر معمولی گدگدی پیدا کر کے اس جذبہ کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ اور یہ صورت دنیا کے ہر متمدن گوشے کے اہل دولت کی صحبتوں میں شدت سے پائی جاتی ہے۔ اس سے یورپ، عرب، عجم کوئی خطہ خالی نہیں۔ امرائے عالم کے درباروں میں بے شمار مسخر نواز اصحاب ملتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جذبۂ ظرافت قدما میں بھی درجۂ کمال پر موجود تھا۔ جس سے زیادہ تر ہجو۔ بدگوئی۔ تمسخر و استہزا کا کام لیا جاتا تھا۔ چنانچہ دوسرے ممالک سے قطع نظر ہمارے ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے ہندوستان آنے سے قبل بھاٹ مقرر ہوتے تھے۔ جو راجاؤں کی قصیدہ خوانی ان کے مخالفین کی ہجو اور جن کو راجہ کی نگاہوں سے گرانا ہوتا تھا اُن کا تمسخر و استہزا کرتے تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے کے بعد علاوہ امیر خسرو علیہ الرحمۃ کے اس فہرست میں سیکڑوں نام

ملتے ہیں۔ مثلاً شہنشاہ اکبر کے عہد میں روغنی استرابادی، ظریفی، سابو جی اور
ملادو پیازہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح دوسرے بادشاہوں کے دربار میں
ظریف ہستیوں کی کمی نہیں۔ سودا۔ انشا۔ میر ضاحک جن کے آخری فرد ہیں۔

جہاں تک درباری تفریحات کا تعلق رہا ظرافت تمدنی اور اخلاقی دائرے
تک محدود رہی لیکن جس نقطے سے زوال سلطنت اور ارباب دولت کی سرد بازاری
شروع ہوتی ہے وہاں سے ظرافتِ شعر مذاق وقت کے مطابق دوسرے
مضامین اختیار کر لیتی ہے۔ میاں جرکین کے لباسِ کلام میں کثافت طبع کی بو
آتی ہے۔ جان صاحب نسائیات کی اوڑھنی اوڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔
لیکن جس وقت سے ہندوستانی تمدن پر مغربیات کا رنگ چڑھا ہمارے شعرا و
نثار حضرات بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کسی نے مغربی فیشن پر
پھبتیاں اڑانی شروع کر دیں تو کسی نے سیاسیات وقت پر ظریفانہ پہلو سے
تبصرہ کرنا شروع کر دیئے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آخری صنف ظرافت کے موجد
اور خاتم ادب اُردو میں اکبر الہ آبادی مرحوم ہیں جنھوں نے پردہ ظرافت میں اصلاح
معاشرت اور نظریہ سیاست وغیرہ کے متعلق بہت کچھ کہہ ڈالا ہے۔ کلام میں
شوخی اور شگفتگی، ضحکہ اور ہنسی مختلف رنگ برنگ کے روپ بدل کر سامنے آتی ہے۔
گو ایک ناواقف اور اجنبی کو بادی النظر میں وہ سب ایک جیسی معلوم ہوتی ہیں
مگر در اصل اُن میں بڑا نازک اور لطیف فرق ہوتا ہے۔ ہجو، ہزل، مزاح،
طنز، ظرافت، لطیفہ گوئی، فحاشی، ریختی، ضلع جگت، پھبتی، پھکڑ اور
نغز گوئی اُردو ادب کے وہ شگفتہ اور شوخ عناصر ہیں جن پر اُردو طنز و ظرافت

کی بنیاد ہے۔ جب تک ایک فنکار اِن عناصر کی جملہ خصوصیات سے بخوبی واقف نہ ہو اور اُن کے حدود نہ سمجھتا ہو وہ اونچے درجہ کا طنز نگار یا ایک بلند پایہ فنکار ظریف نہیں بن سکتا۔

اُردو ادب میں ظرافت کا آغاز مثل دُنیا کی دوسری زبانوں کے نظم ہی سے ہوا اور عروسِ ادب کے گلے میں سب سے پہلے شوخی اور شگفتگی کی مالا شاعرانہ نظم ہی نے ڈالی لیکن جہاں تک اس دنیا میں اس صنفِ ادب کے آغاز کا سوال ہے تمام ادبا اِس امر میں متفق ہیں کہ طنز و مزاح کا آفتاب سب سے پہلے یونان کے اُفق سے طلوع ہوا اُس کے بعد یہ روم اور لاطینی فضا کو منور کرتا ہوا دوسری باشعور زبانوں میں ظہور پذیر ہوا۔

اُردو نثر و نظم میں اگر طنز و ظرافت کا تاریخی حیثیت سے تجزیہ کیا جائے تو ہم پورے ادب کو چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اُردو میں پہلا دور جعفر زٹلی سے شروع ہو کر سوداؔ پر ختم ہوتا ہے۔ جس میں سوداؔ کو اپنے دور کا مسلّم الثبوت استاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ دوسرا دور جو غدر کے بعد تک کا دور ہے اُس میں نثر و نظم میں شوخی اور ظرافت کی دستار اسد اللہ خاں غالب کے چہرے پر بھلی لگتی ہے۔ تیسرا دور اکبر الہ آبادی سے شروع ہوتا ہے جو اودھ پنچ کے مزاح نگار شعراء اور نثار کا دور ہے جس میں اودھ پنچ کے اڈیٹر سجاد حسین مرحوم کی سرکردگی میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، مولوی عبد الغفور شہباز، منشی جوالا پرشاد برق، اکبر الہ آبادی، منشی احمد علی شوق اور مولوی احمد علی کسمنڈوی نے اخبار کے ذریعہ

ادب اور ظرافت کے پھول کھلائے۔ چوتھا دور جس میں دور حاضر بھی شامل ہے اور جسے قدیم اور جدید کے درمیان کی کڑی کہنا چاہیئے اس دور کے ابتدائی لکھنے والوں میں محفوظ علی بدایونی، سلطان حیدر جوش، مولانا ظفر علی خاں میں جو قدامت کے پرستار اور خمخانۂ علی گڑھ کے مےخوار ہیں اس دور کے آخری مزاح نگار فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، ملا رموزی اور کنھیا لال کپور ہیں۔

اُردو نظم میں جعفر زٹلی کو پہلا ظریف شاعر یا ہزال مانا جاتا ہے۔ اُن کا زمانہ عہد عالمگیر کا آخری دور ہے چونکہ اُس زمانہ میں دربار کی زبان فارسی تھی اور اُردو کا رواج بہت کم تھا اس لئے اُن کی شاعری میں زیادہ فارسی کے الفاظ بلکہ پورے پورے فارسی کے مصرعے پائے جاتے ہیں جہاں تک اس دور کے مذاق کا تعلق ہے ہر وہ بات جس سے انسان ہنس پڑے خواہ وہ فحش ہی کیوں نہ ہو مزاح و ظرافت تصور کی جاتی تھی۔ نثر و نظم دونوں میں جعفر کا انداز بالکل ایک سا ہے زٹلی کی ہجویات سے نہ صرف اُمرا بلکہ بادشاہ اور شہزادے تک ڈرتے تھے۔ انھوں نے شرارت کے نام سے جو مضمون نثر میں لکھا ہے اُس میں بہت سی اچھوتی اصطلاحات ہم کو ملتی ہیں شعر و سخن کے میدان میں بھی اُنھوں نے انوکھی اضافتیں اور نئے نئے محاورات استعمال کئے ہیں شہزادے کام بخش کی مدح میں اُنھوں نے جو غزل لکھی اُس کے تین شعر ملاحظہ ہوں۔

اے روئے تو چوں ماہ شب تار جو ہے تو

تجھ سا نہ کہیں دلبر دلدار جو ہے تو
از عاشق بیچارہ مکن نخرہ و گھونگھٹ
تا کے بود این گرمی بازار جو ہے تو
تا چند کنی عشوہ بریں رنگ گلابی
یہ رنگ تلنگی سا اوڑھن ہار جو ہے تو

سوداؔ جو شعرائے متقدمین میں اپنے رنگ کے ایک مسلّم الثبوت استاد ہیں ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جب بے چینی اور پریشاں حالی کا دور دورہ تھا۔ سلطنت مغلیہ دم توڑ رہی تھی طوائف الملوکی کا زور تھا۔ شرافت سر بازار لٹ رہی تھی۔ امن و امان دلّی کی گلی کوچوں سے فرار ہو چکا تھا۔ ادباء کو اپنی اپنی پگڑیاں سنبھالنا دشوار تھا۔ پرانی تہذیب پر جدید تہذیب کا پرتو پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ قدامت جدت سے دست و گریباں تھی۔ سوداؔ کو کچھ اس زمانہ کے حالات اور افلاس نے، کچھ اُن کی خود داری، شوخی اور چلبلے پن نے اور کچھ زمانہ کی ناقدری اور امراء اور رؤسا کی بے توجہی نے اس درجہ چڑچڑا بنا دیا تھا کہ باوجود حد درجہ شگفتہ مزاج ہونے کے ہجو نگار بن کر رہ گئے۔ اُن کا بچپن نہایت اطمینان اور سکون سے گذرا تھا۔ ظرافت اُن کو ورثہ میں ملی تھی۔ نعمت خاں عالیؔ جیسے بذلہ سنج کے نواسے تھے جو اپنے دور کے مزاح گو، مضمون پرداز اور حاضر جواب تھے چنانچہ سوداؔ بھی اگر نہ تواند پسر تمام کند جیسے لوگوں میں سے تھے۔ اکثر مزاح اور لطیف ظرافت سے گذر کر تمسخر اور فحش کے حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی ہجویات اور ان کے مطالعہ سے یہ چیز واضح ہوتی

ہے۔ اُن کے مزاج میں آخر عمر تک لڑکپن رہا۔ رسمی مشائخ اور زاہد خشک ہمیشہ اُن کے ہدف رہے ہے۔ وہ ہجو کی کرسی کمان اور سے ہمیشہ مسلح رہتے وہ لوگوں کو ہنساتے مگر آپ نہیں ہنستے۔ لوگ جس قدر ہنستے وہ اسی قدر سنجیدہ منہ بنا لیتے۔ اُن کی ہجویات میں تمسخر بھی ہے اور طنز بھی۔ پھکڑ پن بھی ہے اور گالی گلوج بھی۔ ہجو اور طنز میں فرق ہے۔ طنز کا مقصد اصلاح ہے اور ہجو کے ذریعہ دل کے پھپھولے پھوڑے جاتے ہیں بقول پروفیسر کلیم الدین" ہجو گو شاعر ناانصافی بے رحمی ظلم اور اسی قسم کے انسانی نقائص کے مشاہدہ سے متاثر ہوتا ہے اور اسی مشاہدہ سے متاثر ہو کر اُس کا جذبۂ نفرت و غضب جوش میں آتا ہے انھیں جذبات کا اظہار وہ اپنی نظم میں کرتا ہے اگر جذبۂ عشق ایک پرزور طاقت ہے تو جذبۂ نفرت بھی ایک طاقتور زور ہے سودا کی ہجویات دو طرح کی ہیں کچھ ایسی ہیں جن میں اُنھوں نے اپنے مخالفین کی بری طرح خبر لی ہے۔ مثلاً فاخر مکین، میر ضاحک اور دوسرے ہمعصروں کی ہجو میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اُس میں تمام تر تمسخر کو دخل ہے۔ اُن کی وہ نظمیں جو شکایت روزگار یا اہل روزگار پر مشتمل ہیں اُن میں انھوں نے پورے معاشرے یا اُس کے کسی طبقے کو اپنا ہدف بنایا ہے۔ یہ سب بھی اگرچہ ہجویات کے زمرے میں آتی ہیں مگر اُن میں گہرا اور شوخ طنز ہے۔ اُن کی ہجویات میں مضمون آفرینی اور بات میں بات پیدا کرنے والی خوبی تو ضرور ہے مگر اُن میں فکر و شعور کو بیدار کرنے والی کیفیت نہیں۔ اُن کے یہاں فن کی بلندی نازک خیالی اور ندرت خیال کے ساتھ ساتھ نادر تشبیہات تو ملتی ہیں مگر طنز کی شدت ظرافت کی شگفتگی پر اس طرح چھا جاتی

ہے کہ شگفتگی نہیں رہتی۔ سوداؔ کی بعض غزلوں میں بھی شگفتگی اور طنز کی آمیزش ہے۔ غزلوں میں ان کا طنز بہت ہی نازک اور لطیف ہے۔ اُس میں فکر کی روشنی اور بصیرت ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں آپ کو لطیف طنز ملے گا۔

جس نے سجدہ کیا نہ آدم کو
شیخ کا پوجتا ہے بایاں پاؤں
کیا شکر کیا شکایت اپنی ہے شکل یکساں
دونوں سے آپ ہی کو مقصود جانتے ہیں
سجدہ کیا صنم کو دل کے گفتست میں
کہ اس خدا سے شیخ با جو ہے سنگ و خشت میں

ہاتھی کی مذمت میں ندرت خیال کی اس سے بہتر مثال شاید ہی آپ کو کسی دوسرے شاعر کے یہاں ملے گی۔ فرماتے ہیں۔

ہوئی ہے ناتوانی اس کے در پے	کہ وہ ڈیل اب جوئیں کی سی گرہ ہے
سمجھنا فیل اسے دیوانہ پن ہے	کسی مدت کا یہ باب کہن ہے
اٹھے ہے خاک کا یا راکھ کا ڈھیر	کہیں ہیں اس کو ہاتھی یہ ہے اندھیر

شید فولاد خاں کوتوال کی ہجو کے چند اشعار جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں اس سے ان کی فنی بلندی کا اندازہ کیجئے۔

خلق جب دیکھ کر کے یہ بیداد	کرتے ہیں کوتوال سے فریاد
بولے ہے وہ کہ میں بھی ہوں ناچار	گرم ہے جوتیوں کا اب بازار
کرتے ہیں مجھ سے اب بجا کر ڈھول	میری پگڑی کا میرے سر پر مول

یارو کچھ چل سکے ہے میرا زور | دیکھو تو ٹک کہاں کہاں ہے چور
مٹ سکے مجھ غریب سے یہ خلل | ہے امیروں کے گھر میں چور محل
دیکھئے گر بتاں کو کبھی بخدا | ہاتھ میں اُن کے بھی ہے دزدِ حنا
کس کو ماروں میں کس کو دوں گالی | چوری کرنے سے کون ہے خالی

سودا میں باوجود شوخی شگفتہ مزاجی کے متانت اور سنجیدگی بھی ہے چنانچہ جب وہ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں تو سماج کے نقائص کے تار پود بکھیر دیتے ہیں جیسا کہ آپ نے مذکورہ بالا اقتباس میں ملاحظہ فرمایا مگر وہ اس متانت اور سنجیدگی کو برقرار رکھنے پر قادر نہ تھے، جب کسی سے خفا ہوتے تو اس کی ہجو لکھنے بیٹھ جاتے اور ہجو لکھنے میں جوں جوں ان کے دل کا غبار چھٹنا شروع ہوتا ان کی تخیل ایک دوسری دنیا میں پہنچ جاتی اور وہ انوکھے خیالات۔ رنگین تشبیہات اور جاذب نظر تصویروں کے بنانے میں سارا غصہ بھول کر ایک کیف آور ایک مسرت محسوس کرنے لگتے۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ اس دور ہی میں نہیں بلکہ اردو میں اس وقت تک سودا سے بہتر کوئی دوسرا ہجو گو شاعر نہیں پیدا ہوا۔ سودا کے ہمعصروں میں دوسرے ہجو گو شعراء فاخر مکین۔ ضاحک۔ فدوی۔ بقا تھے۔ مگر ان کی ہجویں محض ذاتی بغض و عناد کی ترجمان تھیں اور اس قسم کی ہجوؤں میں بھی اُن کا رتبہ بلند نہ تھا لہذا آخر میں گھوم پھر کر نگاہیں صرف سودا ہی پر پڑتی ہیں۔

سودا کے بعد دوسرا نمبر نظیر اکبر آبادی کا ہے جن کو ان کے ہمعصروں نے

شاعر ہی نہیں مانا اور تذکرہ نگاروں نے بھی ان کو شعرا کی فہرست میں جگہ نہ دی۔ نیاز فتحپوری نے ان کو "چٹکلہ باز شاعر" لکھا ہے اور بہت ٹھیک لکھا ہے کیونکہ وہ اپنے دور کے عوامی اور مقامی شاعر تھے۔ انھوں نے مرتے مرتے اکبرآباد نہ چھوڑا۔ اور زندگی میں مسخرے پن کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو ان کی شاعری کی زد سے بچا ہو۔ اُن کی شاعری ایک ایسے قدآدم آئینہ کی حیثیت رکھتی ہے جسے کسی چوراہے پر نصب کر دیا جائے جس میں ہر آنے جانے والے کا عکس پڑتا ہے۔ ان کی کلیات میں ہم کو اُس دور کے رہنے والوں کی تمام خصوصیات ملتی ہیں۔ ان کا کلام اس دور کی ایک ایسی لغت ہے جس میں اس زمانے کے لوگوں کے تمام حرکات و سکنات۔ رفتار و گفتار۔ رسم و رواج میلے ٹھیلے۔ اور ان کی رنگینیوں اور دلچسپیوں کا مظہر ہے۔ ان کے کلام میں ہم کو طنز و ظرافت کا بڑا اچھا امتزاج ملتا ہے۔

نظیر کے یہاں مزاح اور حقیقت، متانت اور ظرافت، بذلہ سنجی اور شوخی طنز اور سادگی ایک دوسرے سے گلے ملتی نظر آتی ہیں۔ درحقیقت جہاں جہاں ان کے کلام میں فحش اور غیر سنجیدہ باتیں ملتی ہیں وہ محض معاشرت نگاری اور حقیقت بیانی کی بنا پر ہیں اگر ان کو نظر انداز کر دیا جائے تو اُس دور کی زندگی کا ایک بہت بڑا پہلو ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ ہم کو سماج اور معاشرت پر طنز ملتا ہے چنانچہ روٹی نامہ پیسہ نامہ، آدمی نامہ، تندرستی نامہ، جوگی نامہ، جوگن نامہ، کوڑی یہ ساری کی ساری طنزیہ نظمیں ہیں جن میں بڑا لطیف طنز ملتا ہے بعض نظمیں، جنھوں نے

خالص اقتصادی نقطۂ نظر سے لکھی ہیں اُن میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم پر گہرا طنز ہے۔ کہیں پر یہ طنز بالکنایہ ہے اور کہیں اُس میں اتنی شدت اور تلخی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ بیزاری کے حدود میں داخل ہو گیا ہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے وقت مسلمانوں کے اخلاق میں جو پستی پیدا ہو گئی تھی اس کی بنا پر اہلِ دولت کی دست بوسی شروع ہو گئی تھی اِس قومی تنزل پر نظیر نے جو جو طنز کئے ہیں وہ طنز و مزاح کے شہ پارے ہیں کوڑی نامے کے دو بند ملاحظہ ہوں:۔

کوڑی ہے جن کے پاس وہ اہلِ یقین ہیں ۔۔۔ کھانے کو اُن کے نعمتیں سو بہترین ہیں
کپڑے بھی ان کے تن پہ نہایت مہین ہیں ۔۔۔ سمجھیں ہیں اِس کو وہ جو بڑے نکتہ چین ہیں
کوڑی کے سب جہاں میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی بغیر سوتے تھے خالی زمین پر ۔۔۔ کوڑی ہوئی تو رہنے لگے شہ نشین پر
ٹکے سنہرے بندھ گئے جاموں کی چین پر ۔۔۔ موتی کے گچھے ٹک گئے گھوڑوں کی زین پر
کوڑی کے سب جہاں میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

کوڑی نہ ہو تو پھر یہ جھمیلا کہاں سے ہو ۔۔۔ رتھ خانہ فیل خانہ طویلا کہاں سے ہو
منڈوا کے سر فقیر کا چیلا کہاں سے ہو ۔۔۔ کوڑی نہ ہو تو سائیں کا میلا کہاں سے ہو
کوڑی کے سب جہاں میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

روٹی نامے کے نام سے جو نظم ہے اُس میں اُن لوگوں پر طنز ملاحظہ ہو جو

کھانے کمانے کی غرض سے روحانیت اور تصوف دم بھرتے ہیں۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سُن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا میں نے کہئے یہ ہے دل کا نور کیا
اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سُن کے تیرا گیا ہے شعور کیا
کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا
جتنے ہیں کشف سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

نظیر کی ظرافت آزادی کی جملہ فضیلتوں سے مالا مال ہے۔ ان کی ظرافت کا سب سے پہلا مقصد نوع انسان کی اصلاح ہے معاشرت میں جو خامیاں انھیں نظر آتی ہیں وہ اُن کو اس طرح ہنس ہنس کر ظریفانہ انداز میں بیان کرتے ہیں کہ اُن کی ہنسی ایک کڑی تنقید بن جاتی ہے۔

سید انشا اللہ خاں انشا، اور نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں بھی ویسا ہی فرق ہے جیسا کہ اِن دونوں کی طبیعتوں میں۔ نظیر کے کلام میں ایک رچا بسا مزاح اور طنز پایا جاتا ہے۔ انھوں نے مختلف رنگوں کے پس منظر سے کام لے کر مزاح اور طنز کے پھول کھلائے ہیں۔ اُن کا کلام نفرت اور رکاکت سے پاک ہے۔ وہ بقول شخصے ننگا کر سکتے ہیں، بُرا بھلا کہہ سکتے ہیں لیکن سرِبازار جوتے مارنا اور ذلیل کرنا کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے مگر سوداؔ اور انشاؔ کے یہاں ایسی بات نہ تھی وہ اپنے مقابل کو نیچا دکھانے کے لئے کسی چیز میں بند نہ تھے۔ انشاء کی طبیعت بھی بہت کچھ سوداؔ سے ملتی جلتی تھی۔" دونوں

خوش باش، لاابالی اور منہ پھٹ قسم کے انسان تھے۔ دونوں بے حد نڈر اور بے باک تھے مگر سید انشاء کا نمبر سودا سے بڑھا ہوا تھا۔ بمقابلہ انشاء کے سودا میں نظر کی گہرائی اور جذبہ کی گرمی زیادہ ہے انشا کے یہاں بھانڈ پن زیادہ ہے اور جہاں تک بدگوئی کا تعلق ہے سودا اُن کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔

جہاں تک انشاء کی ظرافت کا تعلق ہے اُن میں مصاحبت اور ارباب نشاط کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اُن کی چھیڑ چھاڑ ہنسی اور دل لگی تک محدود نہیں رہتی بلکہ اُن کی چھیڑ چھاڑ ایک قسم کی نیش زنی کا رنگ لئے ہوتی ہے اور اس نیش زنی میں اگر ہاتھا پائی تک نوبت آجاتی ہے تو وہ اس میں بھی بند نہیں رہتے۔ اُن کی ظرافت میں تضحیک اور تمسخر پایا جاتا ہے۔ ظرافت اور بذلہ سنجی اگر ہنسی اور دل لگی تک محدود رہے تو اُسے ظرافت کہا جائے گا لیکن اگر ظرافت کسی کی تضحیک اور ناراضگی کا رنگ اختیار کرلے اور دوسرے دل کو اُس سے تکلیف پہنچے تو وہ ظرافت کی تعریف میں نہیں آتی۔ انشاء کی ظرافت میں سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ وہ جس کا مذاق اڑاتے ہیں تو اس کی پروا نہیں کرتے کہ وہ بھی اُن کے مذاق سے دلچسپی لے رہا ہے یا نہیں۔ وہ بیزار ہوکر چاہے خودکشی کیوں نہ کرلے مگر یہ اُس کو چھیڑنے سے باز نہیں آتے۔ اُن کی دل لگی کا مقصد صرف اپنے مربی کو خوش کرنے تک محدود تھا۔ وہ اپنی ظرافت میں اپنی عزت تک کی پروا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اگر کوئی رئیس اُن کو چپت مارے، اُن کی ناک میں بتی کردے منہ میں کاگ لگادے اور آخر میں کچھ دے دے تو وہ اُس کو اپنی ظرافت کی کامیابی سمجھتے

تھے۔ ان کے یہاں دراصل بھانڈوں والی ظرافت تھی۔ ان کی ظرافت کا مقصد محض چند لوگوں کو ہنسا دینا تھا اور بس۔ شاہی دربار میں ان کی حیثیت محض ایک درباری مسخرے کی سی ہوکر رہ گئی تھی مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بے حد صلاحیتوں کے حامل تھے۔ اور اُن کو اپنی صلاحیتوں پر اعتماد بھی تھا۔ انھیں صلاحیتوں کے بل بوتے پر بہتوں کو انھوں نے نیچا دکھایا اور بڑے بڑے معرکوں میں اُن کے آگے کسی کا چراغ نہ جلا۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ جہاں تک طباعی، ذہانت، شوخ طبعی، حاضر جوابی بدیہہ گوئی اور ظرافت کا تعلق ہے انشا اللہ خاں لکھنؤ اور دلی اسکول کے شعرا میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اُن کے یہاں بھی نظیر اکبر آبادی کی طرح ایک ایسی انفرادیت ہے جو مزاح نگار شعرا میں مفقود ہے۔ وہ صحیح اور شستہ زبان لکھتے تھے۔ ہندی، فارسی، عربی، انگریزی، مرہٹی، پنجابی، برج بھاشا گجراتی کئی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ انشا پہلے شخص تھے جنھوں نے اُردو کی نظم میں انگریزی الفاظ کا استعمال کیا۔ جہاں تک چٹکلہ بازی، ظرافت اور بذلہ سنجی کا تعلق ہے وہ بہت کچھ نظیر اکبر آبادی سے ملتے جلتے ہیں صرف علمیت کا فرق ہے۔ نظیر میں اتنی علمیت اور پھکڑ پن نہیں تھا جتنا کہ انشا کے یہاں پایا جاتا ہے دوسرے نظیر کے کلام میں انشا سے زیادہ موضوعات ملتے ہیں۔ نظیر اپنے تجربہ کے زور پر لکھتے ہیں اور انشا اپنی علمیت اور حاضر جوابی اور حد سے زیادہ خوش طبعی کے سہارے اپنے مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ نظیر کے کلام میں محاورات اور زبان کی غلطیاں ہیں۔ انشا کا کلام ان عیوب سے

پاک ہے ان کی زبان نظیر سے زیادہ مہذب اور شستہ ہے۔ انشا اپنے یہاں اگرچہ ہندی کے موٹے موٹے اور رکیک الفاظ استعمال کرتے ہیں مگر اُن میں صحت کا خیال رکھتے ہیں۔ نظیر ان بندشوں سے آزاد ہیں اُن کی ظرافت میں مصاحبت تضحیک اور چڑ چڑا پن پایا جاتا ہے۔ نظیر کے یہاں ظرافت میں انتہا پسندی نہیں ہے لیکن انشا اپنی فطری شوخ طبعی کے زور اور بادشاہ کے منہ چڑھے ہونے کی وجہ سے ظرافت کے حدود سے باہر نکل کر پھکڑ پن پر اتر آتے ہیں۔ اُن کے کلام میں ظرافت ہجو کا لباس پہن لیتی ہے اور ہجو میں رکاکت پیدا ہو جاتی ہے۔ نظیر کا کلام ہجو سے بالکل پاک ہے۔ انشا جب ظرافت اور طنز میں اپنے کو کمزور پاتے ہیں تو ہجو لکھ کر اپنے دل کا بخار نکال لیتے ہیں اسی وجہ سے ان کی ظرافت پر کبھی ہجو کے اثرات غالب نظر آتے ہیں۔ نظیر کی چٹکیوں اور چٹکلوں میں ہمدردی اور محبت کا عنصر زیادہ ہے اسی وجہ سے اُن کا کلام بمقابلہ انشا کے زیادہ تفریح بخش ہے اُن کی پوری پوری نظمیں لوگوں کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں نظیر کے یہاں ظرافت کے معنے نوع انسان کی اصلاح ہے مگر انشا کی ظرافت ذاتیات تک محدود ہے۔ بعض نظمیں دونوں کے یہاں ایسی ملتی ہیں جن میں نظیر اور انشا کے کلام میں امتیاز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ مثلاً

آئی تھی ایک حور مجھے دیکھ ہٹ گئی
دانتوں کے نیچے داب زباں جھٹ پلٹ گئی
آہٹ کو میری تاڑ کے چوکھٹ سے جھٹ اُچک

جھٹ پٹ وہ ہٹ کو اڑ کے پٹ سے جھٹ گئی

یا پھر انشا، کی مندرجہ ذیل غزلوں کے اشعار پر نظیر اکبر آبادی کے اشعار کا شبہ ہوتا ہے۔

گو صولتِ اسکندر و گو حشمتِ دارا، اے صاحب فطرت
پڑھ فاعتبروا یا اولی الابصار کا آیا، تا ہو تجھے عبرت
ہے نامِ خدا، وا چھیڑے کچھ نذر تماشا، یہ آپ کی رنگت
گات ایسی غضب قہر پھبن اور جھمکڑا، اللہ کی قدرت

دونوں چونکہ رند مشرب اور آزاد خیال ہیں اس لئے دونوں کے لہجے اور خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ ظرافت اور شوخی دونوں کے یہاں بدرجۂ اتم ہے۔ دونوں بہروپئے کا کردار پیش کرتے ہیں اور جس سوسائٹی کا کردار بیان کرتے ہیں اُس رنگ میں بالکل رنگ جاتے ہیں دونوں کی کئی کئی نظمیں ہم طرح ہیں۔ مثلاً نظیر کا مطلع ہے

عشق کا دور کرے دل سے جو دھڑکا تعویذ
اِس دھڑکے کا کوئی ہم نے نہ دیکھا تعویذ

انشا، کہتے ہیں،۔

لکھ دو آخون جی صاحب کوئی ایسا تعویذ
کہ مرے منہ سے لگے اُس کے گلے کا تعویذ
دل دھڑکنا ترے عاشق کا نہ جاوے ہرگز
گرچہ سو لاکھ طرح لکھ دے مسیحا تعویذ

نظیر کہتے ہیں۔

دیکھ عقد ثریا ہمیں انگور کی سوجھی
کیوں بادہ کشو ہم کو بھی کیا دور کی سوجھی

انشا کہتے ہیں۔

پھبتی ترے مکھڑے پہ مجھے حور کی سوجھی
لا ہاتھ ادھر دے کہ بڑی دور کی سوجھی

انشا کے بعض طنزیہ اشعار ملاحظہ ہوں

تری داڑھیوں پہ جب دلا یہ سب آہوؤں کی ہیں مبتلا
یہ شکار کھیلے ہیں برملا انھیں ٹٹیوں کی تو آڑ میں

انشا تو اینڈتے ہیں بڑے میکدے کے بیچ

کہہ دو سلام زاہد شب زندہ دار کو

وقت کے بادشاہ ہیں درویش

ان کا چھوٹا سا یہ نہ قد دیکھو

سودا کے بعد طنز و ظرافت کا جو دوسرا دور شروع ہوتا ہے اُس کی دستار اسد اللہ خاں غالب کے سر کو زیب دیتی ہے۔ ان کی نثر اور نظم دونوں میں شوخی، طنز اور ظرافت کے پھول کھلے ملتے ہیں۔ گوئٹے کا کہنا ہے کہ "صاحب فہم کے لئے دنیا کی ہر چیز مضحکہ خیز ہے لیکن عقل و اسباب کے پابند افراد کے لئے کوئی چیز بھی ایسی نہیں"۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ فہم اور اعلیٰ ظرافت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور دونوں کا

چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک بلند پایہ ظرافت نگار بننے کے لئے پہلی شرط یہ بھی ہے کہ وہ شوخ طبع ہی نہیں بلکہ نکتہ فہم اور نکتہ سنج بھی ہو۔ اس کا مشاہدہ قوی اور اس کی تخئیل بلند ہو اُس کے ادراک اور اُس کے احساسات تجربات کے آغوش میں پروان چڑھے ہوں۔ غالب شوخ طبع بھی تھے اور نکتہ سنج بھی مگر اُن میں شوخی کا عنصر کہیں زیادہ تھا چنانچہ مولانا نیاز فتحپوری نے یہ صحیح کہا ہے کہ "غالب کو جس چیز نے خالص مزاح نگار شاعر بننے سے بچا لیا وہ ان کا منطقیانہ استدلال تھا ورنہ اُن کے بقیہ فطری رجحانات اُن صلاحیتوں کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں جو ایک شاعر کو ممتاز اور اعلیٰ ظرافت نگار بناتے ہیں۔"

ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے پیش نظر اگر کسی بڑے سے بڑے شاعر سے ان کا مقابلہ اور موازنہ کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف گوئٹے ہے جس کی شاعری زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز نظر آتی ہے جس نے زندگی کے ہر داخلی اور خارجی پہلو کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ اور جو اپنے اندرونی خیالات کو سچی اور حقیقی ظرافت کا جامہ پہنا کر ظاہر کرنے کا پورا پورا سلیقہ رکھتا ہے۔ اُردو میں صرف غالب ہی اس بلند درجہ کا شاعر ہے جس کی وسعت خیال اور رفعت فکر زبان کی تنگ دامنی کا شکوہ کرتی ہے اور اس کی وسعت کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ غالب کو اپنی زبان کے محاورات اور اصطلاحات کا جامہ اپنی تخئیل کے جسم پر تنگ نظر آتا ہے۔ اس تنگنائے میں اُس کے خیالات ایک گھٹن اور ایک طرح کی گھٹن محسوس کرتے ہیں۔

غالبؔ کے کلام میں جو شوخی، ظرافت اور مزاح ہے اُس کے پیش نظر ایک جگہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے مخصوص انداز میں بڑے مزے کی بات کہی کہ

"اُردو شعر و ادب ہی میں نہیں بلکہ طنز و ظرافت کی محفل میں بھی غالبؔ اس طرح داخل ہوتے ہیں جیسے فلمی گانوں کے درمیان پکّے گانے والے کا کوئی اُستاد وارد ہو جائے"

یہ واقعہ ہے کہ غالبؔ کے کلام میں جو شوخی اور ظرافت ہم کو ملتی ہے جو اُن کے ماقبل کے تمام شعراء یا خود اُن کے ہمعصروں یا اُن کے بعد کے شعراء سے بالکل مختلف ہے۔ ولیؔ دکنی سے غالبؔ تک اُردو کے جتنے بھی سنجیدہ شعراء گذرے ہیں اُن سب کے کلام میں کم و بیش اگرچہ انبساطی رنگ پایا جاتا ہے لیکن اُن کے کلام کا انبساط اور اس کی شگفتگی محض تفنن کی حد تک محدود ہے اُن کی ظریفانہ اشعار پڑھ کر طبیعت میں ایک طرح کی گدگدی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تو ضرور پیدا ہوتی ہے مگر اُس مسکراہٹ کے بعد ہم کو فکر کا کوئی میدان نہیں ملتا۔ اُن کے معشوقوں کی ستم ظریفیوں ساقی کی کرامات، پیر مغاں کی خم نوازیوں حسینوں پر طعن و طنز، تشنیع اور پھبتی اور واعظوں پر طنز میں ہم کوئی پُر مغز لطافت یا معنویت نہیں پاتے ان کی ظرافت یا تو ہنسی کو پیدا کرنے والی ظرافت ہوتی ہے یا پھر اس میں اتنی تلخی ہوتی ہے جو مذمت یا ہجو کی صورت اختیار کر لیتی ہے اُن کے یہاں ہم کو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو مسکرانے کے بعد ہم کو دعوت فکر دے۔

اُن کا مقصد محض طبیعت کے بار کو ہلکا کرنے اور واہ کا موقع اور ہنسنے کی دعوت دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

مگر غالب کے مزاح میں ایک انفرادیت ہے اُن کے یہاں نہ تو اپنے ماقبل شعراء کی طرح افراط و تفریط کی بدسلیقگی اور بھونڈا پن ہے اور نہ ہلکا پھلکا ٹھٹھول۔ اُنھوں نے شعر میں شوخی پیدا کرنے کے انوکھے انداز وضع کئے ہیں۔ کبھی وہ اپنے انداز بیان سے شوخی اور مزاح پیدا کرتے ہیں اور کبھی ایک نئے انداز تخیّل سے ان کی فکر بلند سے شوخی کی نئی نئی کرنیں پھوٹتی ہیں اُن کے متین انداز میں بھی ایک سنجیدہ مسکراہٹ ہے بقول ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری: "زندگی کی خارجی کیفیات سے وہ اندرونی جذبات کا اندازہ نہیں کرتے بلکہ اپنے اندرونی جذبات سے خارجی کیفیات کا موازنہ کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کی مسکراہٹ کسی فریب کا ردعمل نہیں ہوتی اُن کے زیر لب تبسم نے کبھی قہقہے کی شکل نہیں اختیار کی ان کی شوخی ایک معنی خیز تبسم ہے"

غالب براہ راست طنز نہیں کرتے بلکہ اپنے انداز بیان میں وہ ایک ایسا تیکھا پن پیدا کر دیتے ہیں کہ گھوم کر کبھی نشانہ وہیں پڑتا ہے جہاں وہ چاہتے ہیں۔ عاشق و معشوق، زاہد اور واعظ ہی تک ان کا طنز محدود نہیں رہتا بلکہ اگر کہیں خضر اُس کا نشانہ بنے ہیں تو کہیں خود ان کی ذات اور ان کا دل بھی اس کا ہدف بنا ہے اس سلسلہ میں ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

بوسہ دیتے ہیں اور دلپہ ہے ہر لحظہ نگاہ
دلمیں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے جز آب و ہوا اور سہی

ستائش گر ہے زاہد اسقدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پہ مہرباں کیوں ہو

حریف مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

غالب نے ہمیشہ مبتذل تشبیہوں سے گریز کیا۔ اُن کا کلام جدید تشبیہوں سے پر ہے۔ ان کی تشبیہہ میں ایک ندرت، ایک شگفتگی ایک سنجیدگی اور ایک افت ہے انھوں نے حتی الامکان اُن مبتذل محاوروں کے استعمال سے بھی ز کیا ہے جو عوام الناس کی زبان پر آتے رہتے ہیں۔ انشا اور سودا کی طرح نھوں نے اپنی ذہانت خوش طبعی اور شوخی کو، ہجو گوئی اور فحش نگاری سے

آلودہ نہیں ہونے دیا۔ ہر جگہ ان کی شوخ نگاری پر سنجیدگی اور متانت کے
پہرے بیٹھے ہوئے ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کی شاعری کے بارے میں بہت خوب
کہا کہ

"ان کی حیثیت برزخ کی سی ہے جس میں ایک طرف سوداؔ اور
اُن کی ذریات اور دوسری طرف اکبرؔ اور ان کے لواحقین ہیں۔
گو اِس عمل یا سفر میں غالبؔ کی حیثیت اپنے کو اس طرح ڈھالتی
منواتی ہے کہ اکبرؔ تک پہنچتے پہنچتے جنت و جہنم (برعایت برزخ)
کی تفریق مٹتی نظر آنے لگتی ہے۔"

طنز و ظرافت کی وہ شمع جو غالبؔ کے ہاتھوں اکبرؔ تک پہنچی اس کی روشنی
اکبرؔ کے ہاتھ میں آنے کے بعد اور تیز ہو جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ کچھ تو اکبرؔ
اور غالبؔ کے مزاج اور طبیعتوں کا فرق تھا اور کچھ بدلا ہوا ماحول تھا ظرافت
میں طنز، مزاح، ہجو، تمسخر اور کتنی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ ان چیزوں کی کمی
اور زیادتی کبھی ہجو بن جاتی ہے تو کبھی طنز، کبھی مزاح کی شکل اختیار کر لیتی
ہے تو کبھی تمسخر کا۔ لیکن یہ چیزیں کسی زبان میں اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہیں
جب وہ زبان اپنی ترقی کے تکمیلی مدارج طے کر رہی ہو۔ اکبرؔ چونکہ اُس دور میں
پیدا ہوئے تھے جب اُردو زبان کمال کی سرحدوں کو پار کر رہی تھی اور جب
اس کے جاننے والے بھی فہم و فراست، شعور اور ادراک کے اُس نقطہ پر پہنچ
رہے تھے جہاں زبان میں طنز و مزاح کی اہلیت پیدا ہوتی ہے۔ اِس سے

اُن کے یہاں جو ظرافت پائی جاتی ہے وہ اُن سے پہلے کے ظریف شعراء میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ شروع شروع میں اکبر سنجیدہ شعر کہتے تھے اور بڑے بڑے مشاعروں میں جن میں ناسخ اور آتش کے ارشد تلامذہ، میر درد کے شاگرد اور دوسرے اساتذہ میں چشمکیں ہوتیں شریک ہوتے۔ ان مشاعروں میں اُن کی وضع بھی پرانے شعراء کی سی ہوتی۔ سر پر سپاہیانہ صافہ، جسم پر گہرے رنگ کی قمیص۔ قاب میں تلوار پورے خواجہ آتش کے جانشین معلوم ہوتے۔ ان شاعروں میں بھی اُن کے اشعار اہل مشاعرہ سے بہت زیادہ خراج تحسین حاصل کرتے مگر ۱۸۷۷ء میں جب منشی سجاد حسین مرحوم نے لکھنؤ سے اودھ پنچ نکالا تو انھوں نے اپنی شاعری کا چولا بدل دیا۔ ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۰ء تک وہ ا۔ ح کے الہ آبادی کے نام سے مضامین لکھتے رہے۔ ۱۸۷۷ء میں "نامہ بنام اودھ پنچ" کے نام سے انھوں نے ایک منظوم خط گلزار نسیم کی بحر میں شائع کرایا جس میں شوخی اور ظرافت پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

باریک ہے گو یا نکتہ اے دل — لازم ہے سمجھ لیں اس کو عاقل
مرضی تھی خدائے جسم و جاں کی — محدود ہوں شوخیاں زباں کی
دل میں جو ہے بہک نہ جائے — ہشیار چلو بھٹک نہ جاؤ
دریائے خیال موج زن ہے — دفتِ یزداں و اہرمن ہے
ہے شارعِ عام حق و باطل — ناظر اس کی ہے فکر عاقل
گذرے جو خیالِ بد بلا کہ — بازوئے خرد سے بس کرو رد
باطل پہ نہ جاؤ حق کو سن لو — کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لو

اکبر کے اودھ پنچ میں مضامین اور نظمیں لکھنے کی دو وجہیں تھیں۔ اول یہ کہ اودھ پنچ ہی اُس دور کے اخباروں میں ایک ایسا اخبار تھا جو اُس دور کی ظرافت اور مزاح کے معیار پر پورا اترتا تھا مرزا سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ اُس دور کے طنز و مزاح لکھنے والوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے دوسرے اس دور کے تقریباً تمام بڑے ظرافت نگار اودھ پنچ ہی کے دائرہ صحافت میں شامل تھے۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف۔ تربھون ناتھ، ہجر، منشی جوالا پرشاد برق، احمد علی کسمنڈوی، نواب سید محمد آزاد اور رتن ناتھ سرشار، احمد علی شوق کا شمار اودھ پنچ کے نورتنوں میں تھا گو سرشار کچھ عرصہ بعد اُس دائرے سے نکل گئے تاہم اس دور کے مزاح نگاروں میں وہ ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ اس کے ماسوا سیاسی نقطۂ نظر سے اودھ پنچ کانگریسی عقیدہ کا طرفدار تھا ورنہ اُس دور کے بقیہ اُردو اخبارات وطن۔ البشیر، مشرق۔ علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ علی گڑھ تحریک کے حامی تھے۔ اکبر چونکہ سرسید کی تحریک سے اتفاق نہیں رکھتے تھے اس لئے انھوں نے اودھ پنچ کو اپنی مخالفت کا آلہ کار بنا لیا۔ اودھ پنچ کے تعلق سے اگرچہ ان کی شہرت میں بڑا اضافہ ہوا اور وہ ایک ہردلعزیز طنز نگار بن گئے مگر ان کی شاعری میں وہ ادبی وقار نہیں پیدا ہوسکا جسے صحیح معنوں میں ادبی وقار کہتے ہیں۔ اکبر کو طنز و مزاح لکھنے میں جس چیز نے کامیاب بنایا وہ آزاد و شوخ فطرت اور متین و سنجیدہ ظرافت تھی۔

دراصل طنز و ظرافت کا رستہ بہت ہی خطرناک رستہ ہوتا ہے جس پر بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ قدم کی معمولی سی لغزش انسان کو کہاں

سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ اس میں ادنیٰ سی چوک بھی معاف نہیں کی جاتی۔ چنانچہ سوداؔ، اور انشاؔ، جیسے بڑے بڑے شعراء اس کوچہ میں ٹھوکر کھا ہی گئے لیکن اکبرؔ اس معاملہ میں بے حد خوش نصیب تھے کہ اس خطرناک رستہ پر بھی بڑی مضبوطی سے پاؤں جمائے رہے اور انھوں نے سنجیدہ ظرافت کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شرفاء، ادباء، اور معمولی ان پڑھ لوگوں میں اس کو یکساں طور پر مقبولیت حاصل ہوئی اس کی اول وجہ یہ تھی کہ اکبرؔ طنز و مزاح لکھنے والی ظریفانہ فطرت لے کر آئے تھے دوسرے اکبرؔ سے پہلے کے شعراء کے دور میں سماج کی وہ طنز یہ تنقید ممکن نہ تھی جو اکبرؔ کا مخصوص حصہ ہے کیونکہ ان کو ایک ایسا ماحول ملا تھا۔ جس میں ایک تہذیب دوسری تہذیب کا رنگ قبول کر رہی تھی تیسری وجہ یہ تھی کہ ان کی شاعری کا لب و لہجہ نہ تو عالمانہ ہے اور نہ عامیانہ بلکہ دونوں طبقوں کے بین بین ہے وہ اپنی شاعری میں اگر کسی ایک فرد کو بھی مخاطب کرتے ہیں تو اس میں سب اپنے کو مخاطب سمجھتے ہیں اسی لئے ہر حلقے اور ہر طبقہ کے لوگوں نے اُسے پسند کیا۔

اکبرؔ نے اپنی شاعری کے لئے ان لطافتوں کا پس منظر بنایا جس کا زمانہ گرویدہ تھا۔ چونکہ مشرقی اور مغربی تہذیب کے تصادم سے اسلامی تہذیب کا شیرازہ بکھر جانے کا پورا پورا خطرہ تھا اور اکبرؔ خود پرانی قدروں کے پرستار تھے اس لئے جب وہ طنز و مزاح کے تیر برساتے تو رجعت پسند طبقہ کی طرف سے بھی ان کو بھرپور سراہا جاتا اور ان کو خاطر خواہ داد ملتی رہتی

بڑا کمال تو یہ ہے کہ اکبر نے سرکاری ملازمت کی جکڑ بندیوں اور ایک ایسے ماحول میں رہ کر جس میں برطانوی سنگینوں کا سایہ تھا ہندوستان کو ایک جدید صنف سے روشناس کرایا۔ اُن کے اشعار میں ایک پوشیدہ طنز، ایک تنقیدی مزاح اور ایک روح افزا گدگداہٹ پائی جاتی ہے بقول ڈاکٹر اعجاز حسین "اُن کے احتجاج میں بھی ایک ایسی فرحت بخش شیرینی ہے جو احتجاج کی تلخی کو مٹا کر کام و دہن کو مزہ دیتی ہے۔"

اکبر کی ظرافت کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اُس میں تمسخر، طنز، زہرناکی، نغز، مزاح، پھبتی اور بہت سے ایسے تفریحی اشعار ملیں گے جو محض تفنن طبع کے لئے انھوں نے لکھے ان کے کلام میں بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جو محض قافیہ پیمائی اور کسی لفظ یا فقرے کو صرف کھپانے کی غرض سے کہے گئے ہیں۔ چونکہ اکبر فطرتاً ظریف واقع ہوئے تھے اور اُن کی زندگی میں بہت شوخی تھی اس لئے وہی شوخی ان کے کلام میں بھی ہم کو جگہ جگہ ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے دوستوں کو جس قدر خطوط لکھے ہیں اُن میں اکثر فی البدیہہ اشعار بھی کہے ہیں اُن کے کلام کے بارے میں یہ کہنا کہ اُن کے کلام میں ظرافت کا فلاں فلاں عنصر زیادہ یا کم ہے اور اس طرح ان کی ناپ تول کرنا غلطی ہے جس طرح ایک شخص کے بات کرنے کا ایک خاص اور مخصوص انداز ہوتا ہے وہی حال اُن کا ہے۔ وہ نہ تو کوئی سیاسی لیڈر تھے اور نہ مذہبی پیشوا۔ سیاست اور مذہب کے بارے میں جو کچھ اُن کے ذاتی رجحانات تھے اُن ہی کو قادر الکلامی کے بل بوتے پر وہ نظم کا جامہ پہنا دیتے تھے۔ اسی طرح سوسائٹی اور قومی معاملات میں ان کو جو چیز

اچھی معلوم ہوتی تھی یا بری لگتی تھی وہ اس کا اظہار نثر کے علاوہ نظم میں بھی کر دیتے تھے۔

غالبؔ کی طرح اکبرؔ کی ظرافت میں بھی انفرادیت ہے مگر دونوں کا رنگ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ غالبؔ کے یہاں مزاح محض استہزائی ہے اور جگہ جگہ معنوی ظرافت کے چٹخارے ہیں مگر اکبر کی ظرافت اصلاحی اور بنیادی ہے۔ غالبؔ اعتقادات، تصوّف اور اخلاقیات کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ والیان حکومت کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے ہیں اور اپنی ظرافت سے آپ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مگر اکبرؔ کے یہاں ایسا نہیں ہے وہ اپنی ظرافت سے فائدہ نہیں اُٹھاتے بلکہ اُس سے وطن اور قوم فائدہ اٹھاتی ہے۔ وہ ہماری آپ کی اصلاح چاہتے ہیں وہ حکومت کے ملازم ہوتے ہوئے بھی حکومت پر طنز سے باز نہیں آتے۔ ان کا مزاح زیادہ تخلیقی ہے ان کی ظرافت اور مزاح کا ہدف سوسائٹی ہے وہ غالبؔ کی طرح شخصیت کی اصلاح نہیں چاہتے۔

غالبؔ نے اپنے خطوط میں جس طرح اپنے دور کے واقعات اور اپنے ذاتی حالات لکھے ہیں اُسی طرح اکبرؔ نے بھی آپ بیتی لکھی ہے لیکن اکبرؔ نے ان کو مزاح اور طنز کا جامہ پہنایا ہے اور وہ چونکہ نظم میں ہیں اس لئے اُن کے اشعار غالبؔ کے خطوط سے زیادہ شوخ اور مزیدار ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور نے جہاں غالبؔ اور اکبرؔ کے مزاح کا تجزیہ کیا ہے اُس میں وہ لکھتے ہیں۔

"اکبرؔ کے یہاں وہ گہری سنجیدگی اور اعلیٰ نارسیلٹی نہیں ہے جو

غالبؔ کے یہاں ہے وہ کسی نشے کے سہارے ہی چل سکتے ہیں
زندگی کا نہ سہی تصوف کا سہی۔ وہ مادیت اور روحانیت علم و
عمل، اخلاق و تمدن کے مسائل سے دلچسپی ضرور رکھتے ہیں مگر وہ
گہری دلچسپی نہیں جو ایک مستقل خلش بنجاتی ہے۔ جس سے آتش
خانوں کی آگ روشن ہوتی ہے۔ جو ہمیں غالبؔ اور اقبالؔ
دونوں کے یہاں ملتی ہے اگر ان کے یہاں یہ بے چینی اور
خلش ہوتی تو وہ اول درجہ کے شاعر ہوتے اور ان کا اسلوب
حکیمانہ اور رفیع ہوتا۔ وہ دوسرے درجہ پر ہیں۔ اور زندگی
سے دلچسپی ایک مزاحیہ پیرایہ اختیار کر لیتی ہے۔ وہ تعمیر
نہیں کر سکتے ہاں، طنز کر سکتے ہیں "
ایک دوسری جگہ اکبرؔ کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد
سرورؔ نے دوسرے شعراء سے اُن کا موازنہ کرتے ہوئے بڑے مزے کی
بات یہ کہی کہ

"میرؔ عشق سے محبت کرتے ہیں، حسرتؔ فن سے غالبؔ زندگی
سے، نظیرؔ نعمتوں سے اقبالؔ توانائی اور تخلیق سے جوشؔ شباب
سے، اکبرؔ ایک تہذیب کے عاشق ہیں بشبلیؔ اقبالؔ اور ابوالکلام
آزادؔ کسی نے مشرقیت سے اس طرح کا عشق نہیں کیا جس طرح
اکبرؔ نے "
اس حقیقت سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اکبرؔ کے یہاں ہر طرح

کی ظرافت کے نمونے ملتے ہیں۔ اول وہ ظرافت جو ہر دور اور ہر زمانہ میں قائم رہنے والی ہے۔ دوسری وہ جو ان کے دور کے حالات واقعات اور زندگی کے تقاضوں سے متعلق ہے اور تیسری وہ جو محض تفریحی ہے۔ اور جس سے ہر طبقے کے افراد محظوظ ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے آج بھی غالبؔ کے بعد ان کو سب سے بڑا مزاح نگار شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

قوم کے بگڑے ہوئے کردار پر اکبرؔ کے چند طنزیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

پبلک میں ذرا ہاتھ ملا لیجئے مجھ سے   صاحب مرے ایمان کی قیمت ہے تو یہ ہے

اے خدا کر دے مجھکو صاحب لوگ   دور ہو مجھ سے اس جنم کا روگ
میرا قالب ہو قالب غربی   بھول جاؤں زبان بھی اپنی
سو کے اٹھوں جو آج صبح کو میں   سب یہ سمجھیں کہ لاٹ صاحب ہیں

مغربی کل نے مجھکو پیا ہے   میرا جوتا ہے اور کلیسا ہے
کونسلوں میں سوال کرنے لگے   قومی طاقت نے جب جواب دیا
یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام   یہ نہ ارشاد ہوا آپ کے کیا پھیلا ہے
مغربی نے خوردبین سے کمر ان کی دیکھ لی   مشرق کی شاعری کا مزا کرکرا ہوا
عزت ملی ہے شرکت کونسل سے شیخ کو   غازہ ملا گیا ہے رخ فاقہ مست پر
حسرت بہت ترقی دختر کی تھی انھیں   پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی
حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جاکے تھانے میں   کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

طفل میں بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبہ کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

چونکہ اکبر کی مزاحیہ شاعری کا محرک اودھ پنچ ہی تھا اِس لئے اقبال کا ذکر کرنے سے پہلے اودھ پنچ کے شعراء اور ان کے معیار ظرافت کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے یہ واقعہ ہے کہ طنز و ظرافت کے میدان میں بمقابلہ نظم کے اودھ پنچ کے لکھنے والوں نے نثر کی زیادہ خدمت کی اِسی وجہ سے اودھ پنچ کی بزم سخن میں شریک ہونے والے شعراء میں سوائے اکبر تربھون ناتھ ہجر۔ برق۔ سرشار اور دو ایک اور نامور شاعروں کے کوئی ایسا شاعر نہیں ملتا جس نے اپنے طنز و ظرافت میں کوئی خاص شہرت یا مقام حاصل کیا ہو۔ اِس کے لکھنے والوں میں چند نام جو آتے ہیں ان میں۔ م۔ ع۔ م۔ ح (ماسٹر باسط بسوانی) مشتاق سلونوی، لاابالی لاعلم۔ خدائے سخن۔ ضمیر الدین عرش۔ ظ۔ ح۔ مولانا شہباز۔ سرشار۔ ہجر مولوی احمد علی شوق وغیرہ وغیرہ۔

اِن شعراء میں زیادہ تر شعار تھے جو اپنا فرضی تخلص رکھ کر محض تفنن طبع کی غرض سے شعر کہتے تھے چنانچہ اِن کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

کالمہ دوئی کوس پہ اُن کا جو سُنا سب نے مکام
جیو ماں آوا کہ کرن جائیے کہ صاحب کا سلام
چڑھ کے گھوڑے پہ بڑے ٹھاٹھ سے تھامن جو لگام
گھوڑ کس پینگ بھرس کا کہی تم سے کا نام

پاؤں دھر دیں رکابن میں جو تھیلا ایسے
ہم چلے جات رہن راہ میں جھیلا ایسے (لاعلم)

لیلیٰ کے کہنے سننے سے آخر کو قیس نے — لکھوایا نام نجد کے انگلش سکول میں
اے بی کے بعد پڑھنے لگا ایسی ریڈریں — تعلیم خوش معاشی ہے جن کے اصول میں
از بر تھے یوکلیڈ کے تھورم پرابلم — اقلیم حافظہ تھی گرامر کے رول میں
لندن گیا تو اوک میں پانے لگا مزا — حاصل تھا وہ جو نجد کے بن کی ببول میں
آئی نظر جو اوک کی کرسی پہ ایک مس — کھٹمل کی طرح عشق گھسا دل کی جول میں
اُس کے سر پہ صاف شعاعیں تھیں مہر کی — ریشم کو جو شمار کریں جنس اذل میں
گردن شکست دیتی تھی ظبی الفلاق کو — قامت دبا کے سرو کو ابھرا تھا طول میں
پھل سیب نے لگائے تھے قامت کی شاخ میں — رنگت بھری تھی روزن عارض کے پھول میں
دیکھا جو یہ مجاز ہے قیس کے حواس — لگتی نہیں ہے دیر بلا کے نزول میں
مجنوں کو دھن کہ جلد پیوں وسکی وصال — میری پڑی تذبذب رد و قبول میں
میری کے کوٹ شپ کا بڑھا تازہ ذوق شوق — لیلیٰ کا عشق کہنہ ملا خاک دھول میں
شہباز ہے کلام کا اکبر کے یہ جواب — لیکن بڑا ہے فرق فروع و اصول میں

(شہباز)

کیوں نہ سترک میں رہے گرو ہراک فیوتی — ڈھیر گنوں کا زمیں پر ہے کہ تربت میری
میں یہ سمجھا حبشی دیکھ کے حلوا سوہن — جلوہ دکھلاتی ہے خاید شب وصلت میری

(پنڈت رتن ناتھ سرشار)

نالہ ہم نے بطرز دگر ایجاد کیا — ساتھ سائیں کو لے گاؤں میں فریاد کیا

عزیز و حق تعالیٰ کبریا ہے   شرف جس نے عدالت کو دیا ہے

ہوئے نکلے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ در گڑھیا
وہیں رہتے مثل مینڈک وہیں غائیں غائیں کرتے
(منشی سجاد حسین)

حضرت دل جو کسی مس کے حوالے ہوتے   جتنے گورے ہیں مقرر مرے سالے ہوتے

وہ بت تیغ نگہ سے سیکڑوں دل مار آتا ہے   نہ تحقیقات ہوتی ہے نہ تھانیدار آتا ہے

کہاں جائے گا اڑ کر اے پری رو اپنے عاشق سے   تری ٹم ٹم کے پیچھے میرا موٹر کار آتا ہے

عدو کمبخت کو سودا ہے کچھ ایسا جدائی کا   لئے سر پر پھرا کرتا ہے ڈھانچا چارپائی کا
(باسط بسوانی)

دکھلایا جیل ترک موالات نے مجھے   لیڈر بنایا میری حوالات نے مجھے
(مشتاق)

گر گیا لندن کو تو وہ معدن تہذیب ہے   بجھو یوں برج شرف میں دین کا کوکب گیا
(لاابالی)

خرافت تو ہے گو ہے بدکار بیوی   بھلا کھائے شوہر کی کیوں مار بیوی

کرے خاک تاکید پردے کی شوہر   نکلنے کو ہر دم ہے تیار بیوی
(عرشی)

مذکورۂ بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اودھ پنچ کے شعراء میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دیہاتی۔ پوربی، پنجابی، فارسی، برج بھاشا

غرض ہر زبان میں مضحک سے مضحک اشعار لکھنے پر قادر تھے۔ جس میں برق، سرشار
شہباز اور ہجر جیسے شعراء نے طنز و مزاح میں بڑے بڑے ساقی نامے اور
مثنویاں لکھ کر اپنا کمال دکھایا۔ یہ شعراء اگرچہ مختلف موضوعات پر قلم اٹھاتے تھے
مگر سب کی تان انگریزی تہذیب پر ٹوٹتی تھی۔ غزل، مثنوی یا مسدس۔
مخمس، رباعی میں دو چار شعر یا ایک آدھ مصرعہ سیاسی رنگ لئے ضرور ہوتا تھا۔
اودھ پنچ کی مقبولیت کی بھی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانیوں
کے ہاتھوں سے سلطنت نکلے بہت زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا اس لئے عوام اور
بالخصوص مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کی نفرت کی آگ ہنوز بجھی نہ تھی۔
وہ انگریزوں کی تہذیب اور معاشرت سے لیکر ہر اس چیز سے نفرت کرتے تھے
جس کا انگریز سے کوئی دور کا بھی تعلق تھا۔ پھر اودھ پنچ چونکہ کانگریس
کا ہمنوا تھا اس لئے اس میں بڑی جلی کٹی باتیں ہوتی تھیں جس کی وجہ سے
اس کی ہر اشاعت میں نثر و نظم کے جو مضامین شائع ہوتے وہ زبان زد عوام
ہو جاتے لوگ ہفتوں اور مہینوں ایک دوسرے سے اس کے لطیفے، چٹکلے، اشعار
اور فقرے بیان کر کے قہقہے لگاتے اور چٹخارے لیتے۔ پھر یہ کہ اس دور کی شاعری
میں ضلع جگت اور رعایت لفظی ہی کو شعر کا جوہر سمجھا جاتا تھا۔ اور چونکہ اودھ
پنچ کے شعراء جدید خیالات کو نئے نئے انداز میں نہایت خوش سلیقگی کے
ساتھ پیش کرتے تھے اس لئے اس کی نظمیں اور غزلیں ان کے مذاق پر پوری
اترتی تھیں اور ان کے کہنہ ذوق کو ان سے پوری پوری آسودگی حاصل ہوتی تھی۔
اودھ پنچ کی صحافت میں تین چیزیں خصوصیت سے نمایاں ہیں اول یہ کہ اودھ پنچ

نے سب سے پہلی مرتبہ اُردو میں مغربی طنز و مزاح کو رواج دیا۔ دوسرے سیاسی اور مجلسی مسائل پر سب سے پہلے اودھ پنچ کے ظرافت نگاروں نے بھرپور طنز کا حربہ استعمال کیا۔ تیسرے اپنے حریف کی تحقیر اور تذلیل کے لئے سب سے پہلے اودھ پنچ نے کارٹون استعمال کئے۔ اس کے بعد سرپنچ اور دوسرے مزاحیہ اخبارات جو ملک کے مختلف گوشوں سے نکلے انھوں نے بھی اپنے یہاں کارٹونوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

اقبال اکبر کے بعد دوسرے بلند پایہ طنز نگار ہیں۔ اقبال اور اکبر کی عمر میں کم و بیش تیس سال کا فرق تھا۔ اکبر کی شاعری جس وقت معراج کمال پر تھی اُس وقت اقبال شہرت کی ابتدائی منزل میں قدم رکھ رہے تھے۔ اقبال نے کچھ عرصہ اکبر کے رنگ سے متاثر ہو کر ظرافت کی طرف رخ کیا مگر وہ رنگ اُن سے نبھ نہ سکا۔ اُن کے چند ظریفانہ شعر جن میں انھوں نے اکبر کے رنگ میں سماج کی مزاحیہ تنقید کی ہے ملاحظہ ہوں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ
دفع مرض کے واسطے "بل" پیش کیجئے
تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض
جی چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

اقبال اور اکبر طنزیہ شاعری میں ضرور ایک دوسرے سے قریب تر ہیں وہ اس لحاظ سے کہ دونوں کی شاعری ذاتی عناد اور انفرادی جذبات کی پستی سے پاک ہے۔ دونوں کے طنز میں ایک اجتماعی مقصد ہے اور دونوں اجتماعی کمزوریوں کو دور کرنے کی طرف مائل ہیں۔ اقبال نے خالص ظرافت کو چھوڑ کر حکمت، متانت اور بصیرت کو طنز کا ہلکا رنگ دے کر جہاں جہاں سماج کی کمزوریوں کو طشت از بام کیا ہے۔ وہاں وہ ایک بلند پایہ طنز نگار معلوم ہوتے ہیں۔ مذہبی رہنماؤں کی بے گانگی اور زندگی سے گریز پر غلاموں کی نماز کے عنوان سے اقبال کی جو نظم ہے اُس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

کہا مجاہد ترکی نے مجھ سے بعد نماز
طویل سجدے ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام

وہ سادہ مرد مجاہد وہ مومن آزاد
خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نماز غلام

طویل سجدے اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اسکو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

ایک دوسری جگہ ان کے ہمدردانہ طنز کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

اے مرد خدا تجھکو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
بیچارہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

محکومی و مسکینی و نومیدی جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کو کر یاد

اکبر کی طرح بعض جگہ اقبال بھی خود اپنے آپ کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

کہا اقبال نے شیخ حرم سے — تہہ دیوارِ مسجد سو گیا کون
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی — فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون
کہیں ہنگامہ ہائے آرزو سرد — کہ ہے مردِ مسلماں کا لہو سرد
بتوں کو میری لادینی مبارک — کہ ہے آج آتشِ اللہ ہو سرد

اقبال بھی اکبر کی طرح کہیں صوفی، ملاّ، اور خانقاہ پر طنز کرتے ہیں اور کہیں تہذیب نو کی اندھی تقلید کرنے والوں اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مگر اس میں بھی دونوں کے طنز میں فرق ہے۔ اقبال کے یہاں محض طنز ہے اکبر کے یہاں طنز کے ساتھ ظرافت کی چاشنی بھی ہے۔ اکبر کے اشعار میں مغربی تہذیب سے ایک قسم کا تنفر ظاہر ہوتا ہے مگر اقبال کے یہاں اشعار میں ہجو یا تنفر کی بو نہیں آتی۔ اقبال کا طنز اگرچہ سادہ الفاظ میں ہوتا ہے مگر اس میں معنویت کا ایک دفتر ہوتا ہے۔ اکبر اور اقبال کے طنز میں وہی فرق ہے جو ایک مفکر اور غیر مفکر کی طبیعتوں میں۔ اکبر کے یہاں تلخی اور تمسخر ہے مگر اقبال کے طنز میں ایک مصلح اور خادم کی اولوالعزمی ہے اقبال کے طنز میں ہمدردی اور دلسوزی ہے وہ بنیادی کمزوریوں کی طرف توجہ کرتے ہیں ان کے طنز میں بھی پیام ہے مگر اکبر کے یہاں کوئی پیغام نہیں ملتا۔

اقبال کے بعد طنز نگاروں میں دورِ حاضر کے باکمال شاعر حضرت جوش ملیح آبادی ہیں۔ جوش کی اکثر نظموں میں جو انھوں نے پاکستان اور ہندوستان

کی تقسیم کے بعد لکھی ہیں ہم کو بڑا لطیف طنز ملتا ہے مگر اُن کی وہ نظمیں جو مولوی، خانقاہ یا ملّا پر ہیں ان میں طنز کم اور ہجو زیادہ ہے۔ اِن نظموں میں ایک قسم کی نفرت اور حقارت ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مذہبی طبقے سے وہ محض اس وجہ سے خفا ہیں کہ وہ اِن کی رندی پسند نہیں کرتے۔ شیخ، اور ملّا کی مذمت کرتے وقت وہ اپنے جذبات میں اتنا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ انھیں ادبی محاسن کی بھی پروا نہیں رہتی۔ جوش کی نظم خانقاہ کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

الاماں! خانقاہ کی دنیا — معصیت کی گناہ کی دنیا
دوڑتا ہے یہاں ٹھہر کے سمند — یاں توکل ہے حرص کا پابند
یا قناعت ہے عارفانِ خدا — کام لیتے ہیں سکّہ سازی کا
ہر ادا میں ہے تاجرانہ کمال — ہر بُن مو ہے ایک دستِ سوال
کون بہتر ہے ایزد باری — ان کا تقویٰ کہ میری میخواری

جوش کے کلام میں نشیب و فراز، اتار چڑھاؤ اور زیر و بم بہت زیادہ ہے، وہ نغمے اور چیخ، طنز اور تسخر، جھنکار اور للکار میں فرق نہیں سمجھتے ان کے طنز میں بھی جذباتیت ہے۔ مگر مسکراہٹ کی جگہ غیظ و غضب ہے۔

ہندوستان کی آزادی سے عوام کی نہ جانے کتنی آرزوئیں وابستہ تھیں اور کیسے کیسے حسین اور دلکش تصورات وہ اپنے دلوں میں لئے بیٹھے تھے۔ دیش کے نیتاؤں نے عوام سے کیا کچھ وعدے نہیں کئے تھے۔ مگر آزادی حاصل ہونے کے بعد عوام کو کن کن دشواریوں اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ امن و انصاف کی کتنی قدریں پامال ہوئیں اس کا اندازہ جوش کی اس نظم

ہوتا ہے جو انھوں نے ماتم آزادی کے عنوان سے لکھی ہے، اس میں ہمیں ایک ایسا طنز ملتا ہے جس میں درد ہی درد ہے۔ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے۔

اے ہم نشیں فسانۂ ہندوستاں نہ پوچھ
روداد جام بخشی پیر مغاں نہ پوچھ
بربط سے کیوں بلند ہوئی ہے فغاں نہ پوچھ
کیوں باغ پر محیط ہے ابر خزاں نہ پوچھ
کیا کیا نہ گل کھلے روش فیض عام سے
کانٹے پڑے زباں میں پھولوں کے نام سے

ہندوستان میں اردو کے ساتھ جو برتاؤ کیا جا رہا ہے اس کے بارے میں اسی نظم کے ایک بند میں لکھتے ہیں۔

چلنے لگی لغت پہ چھری انتقام کی
چھانٹی گئیں تمام جو لفظیں تھیں کام کی
رحمان ہی کی بات چلی اور نہ رام کی
گردن ہی سے کھنچ گئی جو زباں تھی عوام کی
حیوان بوکھلا گئے منہ کھولنے لگے
انسان بولیاں وہ نئی بولنے لگے

اس وقت عوام جس تنگ دستی، تنگ نظری اور تنگ دلی کے شکار ہیں اور فضا میں جو حبس اور گھٹن محسوس کر رہے ہیں اس کا ذکر کتنے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

سرو سہی، نہ ساز، نہ سنبل، نہ سبزہ زار
بلبل نہ باغباں، نہ بہاراں نہ برگ و بار
جیحوں نہ جام جم، نہ جوانی نہ جوئبار
گلشن نہ گل بدن نہ گلابی نہ گل عذار
اب بوئے گل نہ باد صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

غرض اکبرؔ کے بعد اقبالؔ اور جوشؔ کے یہاں ہم کو جو ضمنی طنز ملتا ہے ویسا طنز نہ دورِ حاضر کے کسی سنجیدہ شاعر میں ملتا ہے اور نہ موجودہ ظرافت نگار شعرا میں بظاہر اتنی صلاحیت نظر آتی ہے جو اُسے لیکر آگے بڑھ سکے۔ شبلی نعمانی اگرچہ باقاعدہ شعرا کی صف میں نہیں شامل ہوئے تاہم انھوں نے الہلال میں بعض طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں مسلم لیگ اور اس کی سیاست سے متعلق کہیں جو کشاف اور دوسرے ناموں سے شائع ہوئیں جو بہت دلچسپ ہیں جن میں سے ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

اب تک اسی طریق پہ ہیں بندگان خاص — گو صحبت عوام میں کچھ قیل و قال ہے
گردن جھکی ہوئی ہے زباں گو ہے شکوہ سنج — باطن ہے انقیاد جو ظاہر ملال ہے
الحاق سے کچھ اور نہ تھا مدعائے خاص — بس اک عموم درس وفا کا خیال ہے
یعنی یہ پھیل کر نہ زمانہ کو گھیر لے — اب تک جو مختصر یہ علی گڈھ کا جال ہے
پھر بھی حضور کی نہ گئیں سرگرانیاں — پھر بھی گناہ گار مرا بال بال ہے
تھی سی آرزو بھی پذیرا نہ ہو سکی — اب کیا کہیں گے اور کبھی کچھ عرض حال ہے
سنتے رہے وہ غور سے یہ داستانِ غم — جب ختم ہو گئی تو یہ لب پہ مقال ہے
حد سے اگر بڑھے گا تو ہو جائے گا ستم — وہ درسگاہ روئے وفا کا جو خال ہے

اس قسم کی سیاسی طنزیہ نظموں کے موجد دراصل علامہ شبلی تھے اُن کے بعد
نا ظفر علی خاں ہیں جنھوں نے اس انداز کی بہت سی نظمیں لکھیں جو ان کے مجموعہ کلام میں درج
ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کے کلام میں روانی پختگی اور قادر الکلامی کے ساتھ ساتھ

ایک ندرت اور جدت ہے۔ افسوس کہ جدید شعراء میں اس رنگ میں کہنے والا کوئی نہ پیدا ہو سکا۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"انسان سے چھین لی گئی آزادیٔ ضمیر
لیلیٰ کے ناقہ کے لئے محمل نہیں رہا

تھا دشنۂ حق کا تیز کبھی خونریز بھی مگر
کچھ دن سے درخورِ رگِ باطل نہیں رہا

لندن کی عافیت کبھی جس سے ہوئی تھی تنگ
زنداں میں اب وہ شورِ سلاسل نہیں رہا

سچ اور جھوٹ میں نہیں باقی رہی تمیز
اور امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

میں نے دیا جواب کہ ہیں یہ گلے فضول
جب سب ہیں عالم اور کوئی عامل نہیں رہا

ہم آپ اپنی راہ کے سنگِ گراں بنے
رہرو کو فکرِ دوریٔ منزل نہیں رہا

جو کوششِ آشتی کی ہوئی رائگاں گئی
اور کوئی اتحاد کا قائل نہیں رہا

پھر کس لئے یہ شکوہ کہ لطفِ خدائے پاک
ہندوستان کے حال کو شامل نہیں رہا

ظفر علی خاں کے بعد حاجی لق لق نے ماڈرن غزل اور پولیٹیکل غزلوں کے نام سے ظریفانہ لٹریچر میں اضافہ کیا۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

پولیٹیکل غزل:۔

آمادۂ پیکار ہیں وہ میرے جگر سے
ایسا ہی پتہ چلتا ہے روئٹر کی خبر سے

ارمانوں کی بھیڑ اور ترے گیسو کا تصور
جلسے میں یہ سانپ نکل آیا کدھر سے

چھائی ہے مرے سر پہ تری "چھاتا وزارت"
لعنت ہے کہو خوب گھٹا باندھ کے برسے

ہانکا ہے نگاہوں نے تری مرغِ دل اپنا
ہم سہمے ہوئے بیٹھے ہیں شہباز کے ڈر سے

ہم گفت و شنید ان سے نہ کریں ہو نہیں سکتا
عزت بھی کوئی چیز ہے دل ترسے تو ترسے

مانا کہ مرا مزرعِ دل چیز ہے اس کی
حق میرا تو مل جائے زمیندار کے گھر سے

لو کوئی کبھی بھر فوج میں تم جاؤ نہ جاؤ
حاصل نتیجہ ہو گا نہ ادھر سے نہ اُدھر سے

باڈرن غزل

جہاں کو قیس و لیلیٰ کا فسانہ یاد آتا ہے
مگر ہم کو تو کالج کا زمانہ یاد آتا ہے

نگہ پڑتی ہے جب اس شوخ کے رخسار رنگین پر
تو مجھ کو بینٹر کا کارخانہ یاد آتا ہے

بہاتی ہیں جب اشک غم مری آنکھیں تو اے ہمدم
مجھے دریائے جہلم کا دہانہ یاد آتا ہے

سگ لیلیٰ سے مجنوں کو محبت تھی تو مجھکو بھی
ترے کتے کا ڈر کھکر کاٹ کھانا یاد آتا ہے

اقبالؔ اور جوشؔ کا تذکرہ ظرافت نگار شعراء میں ان کے کلام میں بعض طنزیہ نظموں کے سبب آ گیا تھا ورنہ اکبرؔ کے بعد خالص ظرافت نگار شعراء میں سید مقبول حسین ظریفؔ لکھنوی رہ جاتے ہیں یا پھر ان کے بعد وہ ہزل گو شعراء رہ جاتے ہیں جن کے کلام میں کوئی اصلاحی یا اجتماعی مقصد نہیں۔

سید مقبول حسین ظریفؔ لکھنوی حضرت صفیؔ لکھنوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ طبیعت میں بلا کی شوخی اور ظرافت تھی مگر چونکہ ان کی زندگی نوابانہ فضاؤں میں بسر ہوئی تھی اس لئے سیاست سے ان کو دور کا لگاؤ نہ تھا۔ ان کی شاعری محض تفریحی شاعری تھی۔ ان کے یہاں اگر سیاسی رنگ کے دو چار شعر ہم کو ملتے ہیں تو وہ سنی سنائی باتوں کو ظرافت میں ڈبو کر عوام کی واہ واہ کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔ اُن کی شاعری ویسی ہی شاعری ہے جیسی کہ پرانے زمانے کے ظریف درباری شعراء کی ہوتی تھی۔ جس کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا تھا۔ ظریفؔ کے انداز بیان میں شوخی اور مسخرہ ہے۔ وہ اپنے ظریفانہ انداز میں ہو کر جب

کوئی بات کہتے ہیں تو وہ گوناگوں دلچسپیاں پیدا کر دیتی ہے۔ اُن کے یہاں ادنیٰ اور پیش افتادہ مضامین ایسے ہیں جن کا مقابلہ بڑے بڑے ظریف نہیں کر سکتے میونسپل الکشن میں کھڑے ہونے والوں کو نام نہاد رہبری اور قومی ہمدردی کا ڈھونگ رچا کر اپنی عزت و آبرو کو لٹا کر دیوانہ وار ووٹ کی تلاش میں جو دربدری حاصل ہوتی ہے اُس کا نقشہ ظریف نے ایک مسلسل نظم میں کمالِ طنز و ظرافت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مطلع کا بند ملاحظہ ہو۔

واہ بی میونسپلٹی جان کیا کہنا ترا تو ہے جی لیلیٰ کی عاشق تیرا مجنوں کا چچا
اپنی خودداری کو کھو کر تجھ پہ جو عاشق ہوا پھر زبانِ حال سے اس کو یہی کہتے سُنا

بس کہ دیوانہ شدم عقل رسا در کار نیست
عاشق میونسپلٹی را حیا در کار نیست

اکبرؔ کے بعد ظرافت نگاری میں سماج کی اصلاح، مقصد کی بلندی، متانت اور سنجیدگی کے لحاظ سے کوئی باکمال شاعر نہیں پیدا ہوا۔ صرف مقبول حسین ظریف کا ذکر ایک حد تک کیا جا سکتا ہے۔ جن کے یہاں مسلسل نظم کی نظم طنز و ظرافت اور کسی ایک خاص موضوع پر ملتی ہے۔ مشاعرہ۔ الکشن وغیرہ ظریف کی ایسی نظمیں ہیں جن کا مقصد صرف ہنسنا ہنسانا ہی نہیں بلکہ ایک خاص مقصد کو پیش کرنا ایک خاص کمزوری کو دور کرنا اور ایک خاص عیب کی اصلاح مدنظر ہے۔ اکبر کی طرح ظریف نے بھی مغربی تہذیب، بے پردگی وغیرہ کی خبر لی ہے۔ مشاعرہ کے عنوان سے ان کی جو نظم ہے اس کے چند بند ملاحظہ ہوں:۔

تجھ میں اے ہندوستاں کچھ آجکل حد سے سوا چار سو پھیلی ہوئی ہے شاعری کی اک وبا

اِس مرض میں اب تو اسّی فیصدی ہیں مبتلا　　مستند شاعر ہے جس نے اک تخلص رکھ لیا

شاعری گو عہدِ ماضی میں تھی پایانِ علوم
اب تخلص میں سمٹ کر آ گئی جانِ علوم

ہے بہت تکلیف دہ شاعر کی وہ جنسِ عجیب　　جو سنانے کے لئے بے چین رہتا ہو غریب
اس کو اچھا کر نہیں سکتا کوئی کامل طبیب　　شاعری کی جس کو بدہضمی ہو ہیضے کے قریب

چاہتا ہے سب سنا دوں جو کہوں اک سال میں
مبتلا ہے شاعری کے سخت تر اسہال میں

طرح کا مصرع نہیں بجلی کی ہو اک بیٹری　　جڑ دی شاعر میں جہاں اس نے غزل اک ڈھال دی
دعوتِ شعر و سخن اب دل لگی ہے دل لگی　　سال میں جتنے ہیں دن تعداد ان کی بڑھ گئی

جس جگہ شرکت نہ کی جائے وہی آزردہ ہے
سب کو خوش کرتا پھرے شاعر ہی کا دل گردہ ہے

کچھ صعوباتِ سفر ہوتے نہیں مانع تجھے　　محبتِ شعر و سخن میں فرض ہے جانا تجھے
کل شب بھر جاگنا مصرعے کو دہرانا تجھے　　ہر غزل کی داد دینا اور چلانا تجھے

تیری شرکت لازمی ہر شہر میں ہر گاؤں میں
سر میں سودائے سخن ہے اور سنیچر پاؤں میں

دیکھ تیری قدر یوں کرتے ہیں تیرے قدرداں　　کوئی میلا ہو کہیں برپا نمائش یا نہاں
جس میں سرکس بھی ہو دنگل میں لڑیں کچھ پہلواں　　یاد کر لیتے ہیں بھولے سے تجھے بھی مہرباں

دیتے ہیں لالچ میڈل کا تیری عزت کے لئے
تھرڈ کا تجھ کو ٹکٹ ملتا ہے شرکت کے لئے

وہ بھی جب کانی ضمانت ہو کہ شاعر آئے گا — یہ کرایہ تو کہیں لے کر نہیں کھا جائے گا
ایک بھرتی کرنے والا خود ٹکٹ دلوائے گا — اپنی ہمراہی میں تجھ کو ریل میں ٹھلائے گا

پڑھ نہ لے جب تک غزل ہوتی ہے گی دیکھ بھال
بعد اس کے ایک دنڈرا اور شاعر کا مآل

تیری بالی دیکھنے کو جمع ہوتے ہیں عوام — گرد تیرے طائفے کے اک گنوردل اژدحام
وہ غزل پڑھنا خوش الحانی سے تیرا وقت شام — واہ واہ کا شور پھر جھک جھک کے وہ تیرا سلام

جمع ہوتی ہے تجھے ساری خدائی دیکھنے
طرح کے مصرعے کے دانے پر لڑائی دیکھنے

اس طرح تعریف کرتے ہیں تری اکثر گنوار — کاہے رگھونندن کبھو دیکھے رہیو ایسی بہار
یو بڑا ساعر پڑھے آوا ہے کونو جوردار — اس پڑھے ماں لام باندھس بچ گئی کوراکھار

جن بریا پڑھس یا نکی گجل جھلائے کے
کوئی جھوٹے لاگ کو دورہ گوا منہ بائے کے

یاک بریا اور ہم دیا کہائے ہے کریا ندھان — جب گگن کیو ہاں جیسن ہوئی جیا گنگا نہان •
کانگریس کا ایک ٹم شیریہ کینس بکھان — آل انڈیا سبھا ہوئی ہے جلیں دیا کھے کسان

اس سماں دیا کہا کہی کا تم ہے ہم بھیا کدار
یاک بولا سب منی پچھیان جس بولیں سیار

اک کبڑیا سن کے یوں کرنے لگا اظہار رائے — یہ تو ساعر تھا بھسنڈی اور بڑھیا کوئی آئے
جو غزل میں جلیبت کا ماسوک کی نکسا دکھائے — ہم سے تو کھیتوں کے دل پر کچھ رعاب اپنا جمائے

ڈانٹ کے للکار کے ہر ایک سے بعل میں گھسے

جو مخجل ہو کے یہ کہہ ڈالے مقابل میں پڑھے

بھائی مولا بخش جس بستی میں ہم آباد ہیں
اس جگہ ساحر بڑے بڑھیا ہیں ماہر جادو ہیں

ان سبھوں میں ایک بدلو لال خجگت استاد ہیں
اُن کو ہر موکے کی گجلیں منہ جبانی یاد ہیں

جس جگہ استاد نے دو تین گجلیں جھاڑ دیں
ساحروں نے ہو کے سرمندہ بیاجیں پھاڑ دیں

یہ نمائش میں ابھی دیکھے گئے تھے پار سال
ایک حکاتی گجل ایسی سنائی بے مثال

حاکم اور نے سیل دار ایسے ہوئے سن کر نہال
دے دیا تمغا انھیں سونے کا جھٹ بے کیل و کال

اور جو ساعر نمائش میں گئے پھس ہو گئے
بس خجگت استاد بدلو گول ٹڈلس ہو گئے

پیسے والوں کی سمجھ میں آ گئی ہے اب یہ بات
صرف بے جا ناچ گانے کا ہے بالکل واہیات

جب کوئی جلسہ خوشی کا ہو کہیں یا ہو برات
منعقد بزم سخن ہوتی ہے تا کٹ جائے رات

پہلے ارباب نشاط آتے تھے گانے کے لئے
اب تو شاعر جاتے ہیں غزلیں سنانے کے لئے

اکبرؔ کے بعد سے اب تک کی درمیانی مدت میں جو شعراء پیدا ہوئے ان کی شاعری صرف ظرافت اور ہزل گوئی تک محدود ہے اور اُن ظریف طنز نگار شعرا میں ظریفؔ دہلوی۔ احمقؔ پھپھوندوی اور نیم ظریف اور نیم ہزل گو شعراء میں شوقؔ بہرائچی، بومؔ میرٹھی۔ اور ہاذلؔ لکھنوی اپنی ہزل گوئی اور ظرافت نگاری میں مشہور ہیں۔ ان شعراء میں احمقؔ پھپھوندوی۔ ظرافت میں حضرت ظریفؔ لکھنوی کے بعد اپنے فن میں استادانہ حیثیت رکھتے ہیں ان کے کلام میں پختگی اور

ستھرا انداق ملتا ہے۔ ان کے کلام سے دو دو چار چار شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

پڑھی نماز تیمم سے ہم نے دتی ہیں ۔۔۔ نکے کو آئی ہے بدھنی یہاں وضو کے لئے
بتائیں کیا تمھیں صرف کثیر شوقِ جمال ۔۔۔ ہزار جوتیاں ٹوٹیں اک آرزو کے لئے

(ظریف حسین ظریف دہلوی)

مرے سنبھالنے کی فکریں تو بعد کی ہیں ۔۔۔ ذرا تم اپنا پتلون تو سنبھالو
شام و عراق و تہ کی سب ہی تمھاری خاطر ۔۔۔ مرقد کی فکر کیا ہے جا ہو جہاں بنالو

(احمق پھپھوندی)

جس زمانہ میں مہاتما جی کھدر کا پرچار کر رہے تھے۔ اس وقت گاڑھے کی قیمت اچھے اچھے کپڑوں سے بڑھ گئی تھی۔ جولاہوں کے کپڑوں کا نرخ بڑھانے پر بوم میرٹھی فرماتے ہیں۔

پہلے سے نہیں مفلس و محتاج جلاہے ۔۔۔ اب بھرنے لگے کوٹھیوں میں ناج جلاہے
لیڈر تو گئے قید میں اک راج کی خاطر ۔۔۔ بیٹھے ہیں دبائے ہوئے سوراج جلاہے

دینِ خدا کو واعظ رنگیں بنا رہا ہے ۔۔۔ دنیا بدل رہی ہے مسجد کی کوٹھری میں

(شوق بہرائچی)

موجودہ نوجوان شعراء میں سید محمد جعفری بہت اچھے شعر کہتے ہیں اُن کا ایک مخصوص رنگ ہے ان کی بعض نظموں میں ہم کو ایک ایسا طرز ملتا ہے۔ جو اکبر کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ باوجود سرکاری ملازم ہونے کے وہ بڑی جرأت

کے ساتھ ارکانِ وزارت کو بھی نہیں بخشتے۔ "وزیروں کی نماز" کے عنوان سے ان کی نظم کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

عیدِ اضحیٰ کی نماز اور وہ انبوہِ کثیر — جبکہ اللہ کے دربار میں تھے پاک وزیر
وہ مصلّوں پہ مسلط تھے بحسنِ تقدیر — تھے "وزیرو" اُن کے مصلّے پہ سادات کبیر

آجکل یہ ہے نماز اور کبھی وہ تھی نماز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

صفِ اول میں کھڑے تھے جو خدایانِ مجاز — یہ امیر اور یہ غریب اور یہ نشیب اور یہ فراز
تجھ سے اے خالقِ کل چھپ نہیں سکتا ہے یہ راز — تو حقیقی وہ مجازی مجھے دونوں سے نیاز

"آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں"
کبھی رکھتے ہی نہیں اور کبھی رکھتے ہیں

عطر میں ریشمی رومال بسایا ہم نے — ساتھ لائے تھے مصلّی وہ بچھایا ہم نے
دور سے چہرہ وزیروں کو دکھایا ہم نے — ہر بڑے شخص کو سینے سے لگایا ہم نے

"پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں"
کون کہتا ہے کہ ہم لائقِ دربار نہیں

ذکر خطبے میں وزیروں کا جو پایا ہم نے — آسمانوں کو زمینوں سے ملایا ہم نے
کعبۂ دل کو صنم خانہ بنایا ہم نے — سامری کی طرح بچھڑوں کو سجایا ہم نے

خوگرِ پیکرِ محسوس ہے انساں کی نظر
"مان لیتا کوئی اُن دیکھے خدا کو کیونکر"

وہ وزیر جو گلے سے لبوں تک مساوات کا ڈھونگ رچاکر

اپنا سیاسی الّو سیدھا کرتے ہیں اُن پر مذکورہ بالا نظم ایک لطیف طنز ہے
جعفری کے طنز میں بھی ایک اچھے طنز نگار کی طرح تحقیر اور تنفر نہیں۔ وہ
نظام کی خامیوں پر انوکھے انداز میں احتجاج کرتے ہیں۔

یو۔ این او کی سیاسی چالوں پر انھوں نے جو طنزیہ نظم لکھی ہے اُس میں
غالب کے مصرعہ کو کس خوبی سے چسپاں کیا ہے۔

یو۔ اِن اُو کے پیٹ میں سارے جہاں کا درد ہے
وعدۂ فردا پہ ٹرخانے کے فن میں فرد ہے
گرچہ پٹوا تا فلسطین میں خود اپنی نمرد ہے
ایسی قوموں سے خفا ہے جن کی رنگت زرد ہے
کتنا اچھا فیصلہ کرتا رہا کشمیر کا
"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا"

جعفری کے طنز میں ایک نرمی ہے وہ اپنے دور کے سیاسی سماجی اور
معاشرتی حالات کو اپنے طنز کا ہدف بناتے ہیں۔ وہ افراد سے نہیں الجھتے
بلکہ اداروں اور اجتماعی زندگی میں جو خامیاں نظر آتی ہیں اُن کو کرید کر سامنے
لاتے ہیں اور اُن پر کچھ اس انداز میں قہقہے بلند کرتے ہیں کہ پڑھنے والے
بھی اُن کے ہمنوا ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خونیوں میں رچے ذوق
پر کلاسکی ادب کا صیقل دے کر ظرافت میں ایک انوکھا پن پیدا کیا ہے۔ کبھی
وہ اقبال کے مصرعوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں تو کبھی غالب کے مصرعوں کو
ایسے موقع سے استعمال کرتے ہیں کہ اگر غالب حیات ہوتے تو شاید وہ اپنے

اُن مصرعوں سے دست کشی اختیار کر لیتے۔ ان کا شعور جوان اور مشاہدہ اس درجہ قوی ہے کہ وہ گردو پیش کے واقعات پر ایک نگاہ ڈالتے ہی ان کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ قومی اور اجتماعی مسائل میں ذاتی اور شخصی دلچسپی کی تخلیق ان کا حصہ ہے۔ ان کی نظر آزاد شاعری کے اونٹ سے لیکر بھنگیوں کی ہڑتال تک گئی ہوئی ہے۔ ان کے طنز میں بڑی شگفتگی اور زندہ دلی ہے۔

جعفری نے سرکاری ملازم ہونے کے باوجود کلرک کا مطالعہ جس انداز میں کیا ہے اس میں ہم کو ایک اخلاص اور محبت کا پہلو ملتا ہے اس کے تین بند ملاحظہ ہوں۔

خالق نے جب ازل میں بنایا کلرک کو ‏ لوح و قلم کا جلوہ دکھایا کلرک کو
کرسی پہ پھر اٹھایا بٹھایا کلرک کو ‏ افسر کے ساتھ بن میں لگایا کلرک کو
مٹی گدھے کی ڈال کے اُس کی سرشت میں
داخل مشقتوں کو کیا سرنوشت میں

پھر اسی خلد میں جو بلائے گئے اُمے ‏ حوروں نے کچھ مذاق کیا، کچھ ملک ہنسے
حیران تھے کلرک کہ کیسے برے پھنسے ‏ ہاتف نے دی صدا کہ یہ کچھ دن نہیں ہنسے
آدم کا رف ڈرافٹ ہے کب تک بنوگے تم
ابرو و بو کے آیا تو سجدہ کروگے تم

جنت کو گرچہ ناز تھا اپنے مکین پر ‏ تھا اُن کی زندگی کا سہارا روٹین پر
ٹی اے وصول کرنے کو اترا زمین پر ‏ لفظ کلرک لکھا تھا لوح جبین پر
ابلیس راستے میں ملا کچھ سکھا دیا

اتر افلک سے تھرڈ میں انٹر لکھا دیا

فرش جعفری کو روزمرہ کے واقعات اور مشاہدات پر لکھنے تک کا بڑا سلیقہ

بعض نوجوان ترقی پسند اور جدید شعراء کے یہاں بھی بڑا لطیف سیاسی طنز ملتا ہے اگرچہ اُن کی تمام تر شاعری سنجیدہ ہے ان میں ن م راشد۔ مجازؔ۔ فیض احمد فیضؔ۔ علی سردار جعفری۔ علی جواد زیدی۔ کیفی اعظمی۔ وامق جونپوری۔ شمیم کرہانی اور معین احسن جذبی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اِن شعراء کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے غزل میں سیاسی طنز کو شامل کر کے اُردو ادب کو ایک نئی راہ دکھائی۔ ان میں فیض احمد فیض کے یہاں سب سے زیادہ اس کے بعد شمیم کرہانی اور اس کے بعد وامق اور جذبی علی سردار جعفری علی جواد کے یہاں ایسے اشارے ملتے ہیں۔ ان شعراء کے کلام کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

ن۔م۔ راشد (داشتہ)

میں ترے خندۂ بیباک سے پہچان گیا
کہ تری روح کو کھاتا سا چلا جاتا ہے
کھوکھلا کرتا چلا جاتا ہے، کوئی الم زہرہ گداز
میں تو اس پہلی ملاقات میں یہ جان گیا۔

آج یہ دیکھ کے حیرت نہ ہوئی

کہ تری آنکھوں سے چپ چاپ برسنے لگے اشکوں کے سحاب
اِس پہ حیرت تو نہیں تھی لیکن
کسی ویرانے میں سمٹے ہوئے خوابیدہ پرندے کی طرح
ایک مبہم سا خیال
دفعتہً ذہن کے گوشے میں ہوا بال فشاں
کہ تجھے میری تمنا تو نہیں ہو سکتی
آج لیکن مری باہوں کے سہارے کی تمنا ہے ضرور
یہ ترے گریۂ نمناک سے میں جان گیا
تجھ سے وابستگیٔ شوق بھی ہے۔
ہو چکی سینے میں بیدار وہ دل سوزی بھی
مجھ سے مہجورِ ازل جس پہ ہیں مجبورِ ازل!
نفسِ خود بیں کی تسلی کے لئے
تجھے اندوہ کی دلدل سے جو آزاد کرے!
کوئی اندیشہ اگر ہے تو یہی
تیرے اِن اشکوں میں اک لمحہ کی نومیدی کا پرتو ہو کہیں
اور جب وقت کی امواج کو ساحل مل جائے
یہ سہارا تری رسوائی کا اک اور سہارا نہ بن جائے
جس طرح شہر کا وہ سب سے بڑا مردِ لئیم
جسم کی مزدِ شبانہ دے کر

بن کے رازق، تری تذلیل کیے جاتا ہے
میں کبھی باہوں کا سہارا دے کر
تری آئندہ کی توہین کا مجرم بن جاؤں

مجاز

مجھے شکوہ نہیں اُن پاک باطن نکتہ چینوں سے
لبِ معجز نما نے جن کے مجھ پر آگ برسائی
مجھے شکوہ نہیں تہذیب کے ان پاسبانوں سے
نہ لینے دی جنھوں نے فطرتِ شاعر کو انگڑائی
مجھے شکوہ نہیں دیر و حرم کے آستانوں سے
وہ جن کے در پہ کی ہے مدتوں میں نے جبیں سائی
مجھے شکوہ نہیں افتادگانِ عیش و عشرت سے
وہ جن کو میرے حالِ زار پر اکثر ہنسی آئی
مجھے شکوہ نہیں ان صاحبانِ جاہ و ثروت سے
نہیں آئی میرے حصے میں جن کی ایک بھی پائی
زمانے کے نظامِ زنگ آلودہ سے شکوہ ہے
قوانینِ کہن آئینِ فرسودہ سے شکوہ ہے

جذبی (فطرت ایک مفلس کی نظر میں)

فطرت کے پجاری کچھ تو بتا کیا حسن ہے ان گلزاروں میں
ہے کون سی رعنائی آخر ان پھولوں میں ان خاروں میں
وہ خواہ سسکتے ہوں شب بھر وہ خواہ چہکتے ہوں شب بھر
میں نے بھی تو دیکھا ہے اکثر کیا بات نئی ہے تاروں میں
اس وقت کہاں تو ہوتا ہے جب موسم گرما کا سورج
دوزخ کی تپش بھر دیتا ہے دریاؤں میں کہساروں میں
بادل کی گرج بجلی کی چمک بارش میں وہ تیزی تیروں کی
میں ٹھٹھرا سمٹا سڑکوں پر تو جام بلب مے خواروں میں
کوئل کے رسیلے گیت سنے لیکن یہ کبھی سوچا تو نے
ہیں الجھے ہوئے نغمے کتنے اک ساز کے ٹوٹے تاروں میں
وہ لاکھ ہلالوں سے بھی حسیں کیسی زہرہ کیسی پروین
اک روٹی کا ٹکڑا جو کہیں مل جائے مجھے بازاروں میں
جب جیب میں پیسے بجتے ہیں جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے اس وقت یہ شبنم موتی ہے
اس چاند کی ٹھنڈی کرنوں سے مجھکو تو سکوں ہوتا ہی نہیں
مجھکو تو جنوں ہوتا ہی نہیں جب پھرتا ہوں گلزاروں میں
یہ چپ چپ نرگس کی کلیاں کیا جانے کیسی کلیاں ہیں

جو کھیلتی ہیں جو ہنستی ہیں اور رکھی بھی ہیں بہاروں میں
یہ لال شفق یہ لالہ و گل اک چنگاری بھی جن میں نہیں
شعلے بھی نہیں گرمی بھی نہیں تیرے آتش زاروں میں
جاڑے کی بھیانک راتوں میں وہ سرد ہواؤں کی تیزی
ہاں وہ تیزی وہ بے مہری جو ہوتی ہے تلواروں میں
دریا کے تلاطم کا منظر ہاں تجھکو مبارک ہو لیکن
اک ٹوٹی پھوٹی کشتی بھی جو ٹکراتی ہے منجدھاروں میں
سب ہوش و خرد کے دشمن ہیں سب قلب و جگر کے رہزن ہیں
رکھا ہے بھلا کیا اس کے سوا ان راحت جاں مہ پاروں میں

فیض احمد فیض

(صبح آزادی)

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لیکر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جاکے رکے گا سفینۂ غم دل

جوان لہو کی پر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رخ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا دبی دبی تھی تھکن

اِن میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
ہاں کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لٹا کے ہم
اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں
اہلِ قفس کی صبح چمن میں کھلے گی آنکھ
بادِ صبا سے وعدہ و پیماں ہوئے تو ہیں
ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پائے فیض
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں
پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرم وفا دیکھیے کس کس پہ ہو ثابت

وہ سارے خطا وار سیر دارِ کھڑے ہیں

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

شمیم کرہانی

(یہ گلی)

یہ گلی دلکش بھی ہے دنیا کی ٹھکرائی بھی ہے
شہر میں بدنام بھی ہے شہر پہ چھائی بھی ہے
سانپ کی کاٹی بھی ہے ناگن سی لہرائی بھی ہے
خود تماشا ہے زمانے کی تماشائی بھی ہے

اس گلی میں قید ہو جاتی ہیں کرنیں پھوٹ کے
پھینک جاتے ہیں یہاں پھولوں کو بھنورے لوٹ کے
آسمانوں سے یہاں آئے ہیں تارے ٹوٹ کے
کس طرف جائیں مسافر کارواں سے چھوٹ کے

موجِ زمزم اس جگہ روحِ ہمالہ اس جگہ
میری مسجد اس جگہ میرا شوالہ اس جگہ
زندگی آئی نظر چھالا ہی چھالا اس جگہ
خون جلتا ہے تو ہوتا ہے اُجالا اس جگہ

تلخیاں شیرینیوں میں گھولی جاتی ہیں یہاں
سستی مہنگی بولیاں سب بولی جاتی ہیں یہاں
دل کی کلیاں ناخنوں سے کھولی جاتی ہیں یہاں
شام کے کانٹے پہ صبحیں تولی جاتی ہیں یہاں

اس گلی کا موڑ ہے یا قسمتوں کا پھیر ہے
اس گلی کے اوج پر ٹوٹے دلوں کا ڈھیر ہے
اس گلی کی آنکھ میں سارا جہاں اندھیر ہے
اس گلی کی صبح میں کیا جانے کتنی دیر ہے

مجروح سلطانپوری

وہ لگا کے سینے سے فلسفہ تصوف کا
شیخ جی حسینوں میں پھرتے ہیں دوانے سے

گو خاکِ نشیمن پر اب بھی ہیں گریاں کناں اربابِ چمن
جب برق تڑپ کر ٹوٹی تھی اس وقت کا عالم کیا ہوگا

دشمنی کی دوستی ہے اب اہلِ وطن کے ساتھ
ہے اب خزاں چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ
سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

دستِ منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں، رسوا سرِ بازار سہی
بولی کچھ بول مقید لبِ اظہار سہی
سر ہمبر نہیں ممکن تو سرِ دار سہی
آنے دے باغ کے غدار مرا روزِ حساب
مانگے تنکا نہ ملے گا یہی گلزار سہی

فریبِ ساقیِ محفل نہ پوچھئے، مجروح
شراب ایک ہے بدلے ہوئے ہیں پیمانے

ہو قفس یا صیاد کی رسمِ زباں بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی اندازِ کلام آ ہی گیا

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
ہزاروں ماہتاب آئے ہزاروں آفتاب آئے
مگر ہمدم وہی بے ظلمتِ غم خانہ برسوں سے

کیفی اعظمی

(منظر خلوت)

ایک بیوہ سر بسر تصویر درد
دل شکستہ رخ کی رنگت زرد زرد
مضمحل سے خال و خد تیور ملول
سرد پیشانی نگوں عارض کے پھول

آئی اک دن ایک مولانا کے پاس
آکے یوں کہنے لگی وہ سوگوار
اے وحید عصر فخر روزگار
آپ کو اللہ عمر خضر دے
کوکب اقبال تابندہ رہے
مٹ رہی ہوں مٹ رہی ہوں المدد

مولوی صاحب کہ تھے استاد کید
دیکھ کر آیا ہوا پنجے میں صید
پونچھ کر عینک کا شیشہ مسکرائے
مسکرائے تھرتھرائے تلملائے
سرنگوں آنکھوں میں لالی آگئی
روئے زیبا پر بحالی آگئی

زہد کا لبریز پیمانہ ہوا
انگلیوں سے رشتیں میں شانہ ہوا
عارضی عصمت کو لے ڈوبی ہوس
خود بخود تپنے لگے تارِ نفس
تھرتھرا کر ہونٹ نیلے ہو گئے
پیچ عمامے کے ڈھیلے ہو گئے
پھول کر سینہ سوا ہونے لگا
تنگ ہر بندِ قبا ہونے لگا
تیوریوں میں سر ریا دھنے لگی
آستینوں کو دغا چننے لگی
پاکبازی سر جھکا کر رہ گئی
پارسائی تلملا کر رہ گئی
ظاہری معصومیت چکرا گئی
جسمِ نازک میں پھریری آ گئی
تف ہے تجھ پر تف ہے زہدِ سفلہ خو
لوٹ لی اک بے زباں کی آبرو

سید علی سردار جعفری نوجوان ترقی پسند شعرا میں ایک امتیازی درجہ رکھتے ہیں ان کی نثر اور نظم میں اگرچہ پارٹی پروپگنڈے کو زیادہ دخل ہوتا ہے تاہم ان کی بعض

نظموں میں ہمیں سماج کی بے راہ روی پر گہرا طنز ملتا ہے۔ بیشتر نظموں میں سرمایہ پرستی پر تیر برسائے ہیں مگر ان کی نظموں میں زہرناکی اور تنفر زیادہ ہے۔ اُن کے یہاں جہاں جہاں طنز ہے وہ اتنا گہرا ہے کہ اس نے ہجو کی شکل اختیار کر لی ہے۔

بھوکی ماں بھوکا بچہ

میرے ننھے مرے معصوم مرے نورِ نظر
آ کہ ماں اپنے کلیجے سے لگائے تجھ کو
اپنی آغوشِ محبت میں سلائے تجھ کو

تیرے ہونٹوں کا یہ جادو تھا کہ سینے سے مرے
ندیاں دودھ کی بہہ نکلی تھیں

چھاتیاں آج مری سوکھ گئی ہیں لیکن
آنکھیں سوکھی نہیں اب تک مرے لال
درد کا چشمۂ بیتاب رواں ہے ان سے
میرے اشکوں ہی سے تو پیاس بجھالے اپنی
سنتی ہوں کھیتوں میں اب ناج نہیں اُگ سکتا
کانگرس راج میں سونا ہی بھلا کرتا ہے
گائے کے تھن سے نکلتی ہے جھلکتی چاندی
اور تجوری کی درازوں میں سمٹ جاتی ہے

چاند سے دودھ نہیں بہتا ہے
تارے چاول ہیں نہ گیہوں نہ جوار
ورنہ میں تیرے لئے چاند ستارے لاتی
میرے ننھے مرے معصوم مرے نورِ نظر
آ کہ ماں اپنے کلیجے سے لگا لے تجھ کو
اپنی آغوشِ محبت میں سلا لے تجھ کو
سو بھی جا میری محبت کی کلی
میری جوانی کے گلاب
میرے افلاس کے ہیرے سو جا
نیند میں آئیں گی ہنستی ہوئی پریاں ترے پاس
بوتلیں دودھ کی شربت کے کٹورے لے کر
جانے آواز کی لوری تھی کہ پریوں کا طلسم
نیند سی آنے لگی ننھے کو
کھنچ گئی نیلگوں ہونٹوں پہ خوشی کی لکیر
مٹھیاں کھول دیں اور موند لیں آنکھیں اپنی
یوں ڈھلکنے لگا ننھا جیسے
شام کے غار میں سورج گر جائے
جھک گئی ماں کی جبین بیٹے کی پیشانی پر
اب نہ آنسو تھے نہ سسکی تھی نہ لوری نہ کلام

ایک سناٹا تھا
ایک سناٹا تھا تاریک وطویل

(پتھر کی دیوار)

نشور واحدی نوجوان غزل گو شعراء میں نشور ایک خوشگو غزل گو شاعر ہیں
ان کی بھی بعض بعض غزلوں میں مجروح سلطانپوری کی طرح دورِ حاضر پر ایک
اچھا طنز ملتا ہے۔ ان کی ایک طنزیہ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہر ذرّہ خاکی کو کرن ہم نے بنایا
مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا
صد شکر کہ ہے ان کا تبسم بھی ہمیں پر
کلیوں میں جنہیں غنچہ دہن ہم نے بنایا
اغیار کو گل پیرہنی ہم نے عطا کی
اپنے لئے پھولوں کا کفن ہم نے بنایا
تاریخ جنوں یہ ہے کہ ہر دور خرد میں
اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا
ڈرتے ہیں خموشی سے ہماری مہ و انجم
چپ رہ کے وہ انداز سخن ہم نے بنایا
مستقبل تہذیب کا نغمہ وہی ٹھہرا
جو زمزمۂ گنگ و جمن ہم نے بنایا

طنز و مزاح میں ایک چیز پیروڈی ہوتی ہے جس کا اُردو نثر و نظم دونوں میں کم و بیش، ابھی دس پندرہ سال قبل تک فقدان تھا۔ فقدان بھی اس حد تک کہ اس کے لئے ہمارے یہاں ابھی تک اس کے معنے کی ادائگی کے لئے کوئی لفظ ہی وضع نہ ہو سکا۔ قرآن کریم میں سورۂ مائدہ، سورۂ نسا وغیرہ میں یہودیوں کے بارے میں آیا ہے۔ یُحَرِّفُونَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ یعنی یہ لوگ لفظوں کو ان کی جگہوں یعنی اصل معانی سے پھیر دیتے ہیں۔ اس تحریف سے یہودیوں کی غرض تضحیک ہوتی تھی۔ پیروڈی میں بھی کم و بیش یہی کچھ پایا جاتا ہے۔ ایران میں پیروڈی کے لئے "تقلیدِ خندہ آور" کی اصطلاح رائج ہے۔ اگرچہ اس میں بھی لفظ پیروڈی کا پورا مفہوم نہیں ادا ہوتا کیونکہ پیروڈی کی تعریف انگریزی ادب میں اس طرح پر کی گئی ہے۔

"نثر یا نظم کی کوئی تصنیف، جس میں ایک مصنف یا گروہ مصنفین کے مخصوص محاوراتی اور خیالاتی اندازوں کی نقل ایسے طریقے سے کی جائے کہ ان اندازوں کو مضحکہ انگیز بنا دے خصوصاً جب اس تصنیف میں ایسے مضامین لائے جائیں جن کو اصل کے موضوع سے دور کا تعلق بھی نہ ہو۔"

یورپ میں پیروڈی کا آغاز یونان سے ہوتا ہے۔ یونانی چونکہ سیاسی معاملات میں بڑے ذہین اور طباع تھے اس لئے ان کے یہاں سرمایہ دار طبقے کی تحقیر اور تذلیل کے مختلف طریقے رائج تھے۔ پیروڈی بھی انھیں طریقوں میں سے ایک طریقہ تھا اسی لئے ازمنہ وسطیٰ میں بھی ہم کو پیروڈی لکھنے والے ملتے ہیں۔ یورپ میں پیروڈی نے سترھویں اور اٹھارویں صدی میں اس درجہ

فروغ پایا کہ اُس نے ایک مستقل فن کی شکل اختیار کرلی اور پریس کی ترقی سے اس میں ابتذال پیدا ہونے لگا، یہانتک کہ پیروڈی تنقید کی بلندی سے گر کر سیاسی تنقید کا سستا آلہ بن کر رہ گئی۔ مگر یورپ میں اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اِس صنف پر سیکڑوں مجموعے کئی بار چھپ چکے ہیں۔

بہرحال اِس وقت پیروڈی کے سلسلہ میں صرف اتنا ہی عرض کرتا ہے کہ یہ صنف ابھی تک اُردو ادب میں کمیاب تھی اس پر کنھیا لال کپور، سید محمد جعفری پروفیسر محمد عاشق اور راقم الحروف نے قدرے طبع آزمائی کی اور ان میں تضحیک کا ہدف جدید شعراء کو بنایا گیا ہے۔ کنھیا لال کپور نے سنگ و خشت میں ترقی پسند شعراء کی دو ایک نظموں پر پیروڈی لکھی ہے اور سید محمد جعفری اور پروفیسر محمد عاشق نے اس سلسلہ میں دو ایک نظمیں لکھی ہیں مگر راقم الحروف نے اِس ضمن میں اُردو ادب میں ایک فنی حیثیت دینے کی غرض سے دورِ جدید کے تقریبًا تمام چوٹی کے ترقی پسند شعراء کے کلام سے کئی کئی نظمیں لیکر انھی کے مخصوص انداز میں ان پر پیروڈی لکھی ہیں۔ اِن پیروڈیز کے متعلق جو مداوا میں کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں پروفیسر ظفر احمد صاحب صدیقی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"ابھی قریبی زمانے میں فرقت کاکوروی کی تصنیف مداوا ایک نہایت کامیاب کوشش ہے۔ اس تصنیف میں مصنف نے مشہور ترقی پسند شاعروں کے کلام کے نمونے دے کر اُن ہی کے رنگ میں اپنا کلام پیش کیا ہے۔ صاحب مداوا کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ہر شاعر کی انفرادیت اور خصوصی طرز کو اپنی

گرنت میں لیکر اُس کے رنگ کو اتنا تیز کرکے پیش کیا ہے کہ مہملیت
کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن مدآوا کی کمزوری یہ ہے کہ
اس کا موضوع کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ اس پر پیروڈی کے وار
اوچھے پڑتے ہیں۔ ترقی پسندی خود مسلمہ قدروں سے
بغاوت کرنے میں کبھی پیروڈی کی سی شکل اختیار کرلیتی ہے۔
اب اگر اس کی پیروڈی کی جائے تو اُس پر سنجیدگی سے نئی شاعری
کا دھوکا ہونا کوئی تعجب انگیز بات نہ ہوگی۔"
اس سلسلہ میں کنہیا لال کپور کی پیروڈی اور راقم الحروف اپنی پیروڈی
کے نمونے درج کرتا ہے جس سے قارئین اُردو ادب میں پیروڈی کی کامیابی
اور عدم کامیابی کا اندازہ کرسکیں گے۔
سید محمد جعفری کی نظم "جدید شاعری" کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

طرز نو کی شاعری میں مدوجزر و بحر و شعر
ایک مصرعہ فیلِ بے زنجیر کی زندہ مثال
دوسرا
اُشتر کی دم
طرز نو کی شاعری کی کوئی کل سیدھی نہیں
شہر بھر میں اونٹ بے چارہ عجب بدنام ہے
آہ اونٹ
شاعری کیا ہے سمجھ لیجئے کہ ہے بالکل ربر

کھینچے سے کھنچ جاتی ہے چھوڑے سے جاتی ہے سکڑ

پروفیسر محمد عاشق میرا جی کی نظم "شعر کی اڑان" پر ایک پیروڈی "شعر کا بہاں" لکھتے ہیں جس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

کاٹ ہی لے گا بڑا آیا کہیں کا کوّا
پیچکے پیچکے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہنچا
دُم کٹا بھورا لنگوڑا پاگل
میں جو نامرد نہ ہوتا تو نبٹتا تجھ سے
کوہ میں دیکا پڑا ہے الّو

مولانا اختر ظہری مداوا کے مقدمے میں فرماتے ہیں:۔

"فرقت کی ایک نظم ہے "گھر اپنے واپس آؤں گا" اس کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں سے راشد نے نظم ختم کی ہے یعنی "اک گناہ آتشیں کا مرتکب ہونے کے بعد" اس نظم میں فرقت کی حقیقت نگاری جو ان جہتیں لگاتی نظر آتی ہے وہ اس ارتکاب معصیت کے بعد رومانوی قلعوں اور خیالی جنتوں میں پناہ گزیں ہونے کے بجائے مردانہ وار حکمت عملی کے ساتھ "ان حالات اور قوتوں کا مقابلہ کرتا ہے جو اس کے کچلنے پر آمادہ ہیں ہے

اک گناہِ آتشیں کا مرتکب ہونے کے بعد
اس طرح بھاگوں گا میں تیری نگاہِ گرم سے
جس طرح بندر کوئی کھا ہلا کر بھاگ جائے
اور دنیا ہکا بکا ہو کے دیکھے کون تھا

فرقت کے یہاں تشبیہیں کچھ زیادہ نہیں ہیں لیکن جتنی ہیں وہ "نفسیاتی مصوری کی حیرت انگیز مثالیں" ہیں "بندر کا کھمبا ہلا کر بھاگ جانا" واقعہ کی پوری تصویر کھینچ دیتا ہے۔ غور کی نگاہ اس میں مشرقی عورت کی بے بسی، بیچارگی اور مظلومی کا ہو بہو نقشہ بھی پاتی ہے۔ جس طریقے سے کھمبا بے جان۔ جامد اور بے بس ہوتا ہے اسی طریقہ سے مشرقی عورت بھی بیچارہ و مظلوم ہوتی ہے۔

بہت ممکن ہے فرقت کی یہ نظم "سیاسیات میں الجھے ہوئے کسی لمحہ کی پیداوار ہو" بندر کی طرح کھمبا ہلا کر بھاگنا پھر نوکر بھیج کر پکڑوا بلوایا جانا وغیرہ وغیرہ کیا الجھے ہوئے سیاسی تصورات کی طرف ایمائی نہیں رکھتے لیکن شاید اس حسین اور انتہا درجہ کی اثر آفریں نظم پر یہ الزام لگانا اسے مجروح کرنا ہوگا اس نظم کی کامیابی تو اس کی تاثیر میں مضمر ہے۔

اس دلپذیر مجموعہ کی نظم "کل رات کو" بھی خاص طور سے اعلیٰ ترقی پسندانہ احساسات کی حامل ہے اس میں آزاد تسلسل بھی ہے مگر وہ بھی ایک مسلسل سلسلہ کے ساتھ اس میں دائیوں نرسوں کا ذکر کرتے کرتے شاعر کا خیال رجعت پسندانہ قوتوں کے سب سے بڑے منظہر مولوی اور ملا کی طرف منتقل ہو جاتا ہے سہ

کون ملا
زندگی کا جن کی کچھ مقصد نہیں
اور مقصد ہے تو یہ
دن رات ذکر و فکر
اوقات کو ضائع کریں

اور مفت کی کھایا کریں

اور دیں اذانوں پر اذاں

جس وقت ہم مشغول ہوں الخ

اس مقام پر شاعر کی ترقی پسندی رجعت پسندی کی نمائندہ شخصیت کے خلاف آگ برسانے لگتی ہے۔ رجعت پسندی کے مشاغل کے خلاف شاعر نے یہاں طنز کی جو چنگاریاں اڑائی ہیں ان کا جواب مشکل ہی سے اب تک جدید شاعری میں مکمل ہو سکے گا۔ اسے پورے طور سے سمجھ لینا چاہیئے کہ وقت کی شاعری اس "منفی نظام زندگی" کا عکس نہیں ہے۔ جو اس نے موجودہ دور سے ورثہ میں پائی ہے بلکہ بیشتر یہ تو ہے اس "اثباتیت" کا اس "ایجابیت" کا جو اس نے وراثت میں بلٹے ہوئے نظام زندگی کو روند کر کچل کر پیدا کی ہے۔ فرقت کا فلسفۂ حیات "رجائی" ہے وہ اپنی زندگی کے دامن میں یاس و قنوطیت کے جراثیم کی پرورش نہیں کرتا۔ سسکتی ہوئی بلکتی ہوئی ہندوستان کی غلام دنیا کی آہیں اور کراہیں سن کر راشد کی طرح وہ یہ طے نہیں کر لیتا کہ "اب بیمار کے اچھا ہونے کی کوئی امید نہیں ہے اسے اب مر ہی جانا چاہیئے" اسے یقین ہے کہ وہ اس بیمار کی رگوں میں نشاط و طرب کا تازہ خون پہونچا کر اس قابل کر سکتا ہے کہ وہ زندگی کے بازار میں پھر سے جوانی کا سکہ چلا سکے۔ اسی لئے میرا ان نوجوانوں کو جو زندگی کی نئی قدروں پر ایمان بالغیب لائے ہوئے ہیں اور جائز طور سے لائے ہوئے ہیں یہ مشورہ ہے کہ وہ "نقش فریادی" و "ماوا" کے بجائے اس مجموعہ کو حرز جاں بنالیں کیونکہ ان سے زیادہ اس میں نئی زندگی کی دوڑتی ہوئی اچکتی ہوئی پہل

پہل بنتی ہے۔"

یہ ہے مولانا اختر تلہری کے اس مقدمہ کا اقتباس جس میں انھوں نے راقم الحروف کی پیروڈیز کی اس انداز میں شرح کی ہے جیسے حضرت نظم طباطبائی اور مولانا سہا نے غالب کے اشعار کی شرح لکھی ہے مگر راقم الحروف مولانا کے مذکورہ بالا بیان کی تائید اور تردید میں صرف مندرجہ ذیل اقتباسات پیش کر سکتا ہے اس کے بعد تردید اور تائید کا آپ کو اختیار ہے۔

ترقی پسند شعراء کی "بحر خفیف" والی نظموں پر راقم الحروف کی ایک نظم "شبستاں کے قریب" ملاحظہ ہو۔

شب کے سناٹے میں تیری خوابگاہِ ناز سے

کچھ دور اٹھلاتا ہوا

میں دیکھتا ہوں

اک گدھا

ہاں

اک گدھا

خالص

گدھا

بالکل

گدھا

سچ مچ کا اک گدھا

گدھا

معصومیت کا بادشاہ
مظلومیت کا ناخدا
خربستوں سے کھیلتا
تیرے محل کو دیکھتا
کچھ چیختا، کچھ رینگتا
گردن کو کچھ موڑے ہوئے
کل رسیاں توڑے ہوئے
تجھ کو نہیں اس کی خبر
تو نے کبھی دیکھا بھی ہے
اور یہ کبھی سوچا بھی ہے
کس کی نظر کا صید ہے
کیا راز ہے کیا بھید ہے
تجھکو نہیں معلوم مگر
مجھکو ہے سب اس کی خبر
لیکن نہ میں اس راز کو
تجھ سے کبھی بتلاؤں گا
تیرے حریم قلب کو
ہرگز نہ میں لرزاؤں گا

دہلاؤں گا، تھرّاؤں گا
جانے کبھی دے جانے کبھی دے

اس بات کو
اس رات کو
جب میں نے دیکھا تھا گدھا
خرمستوں کی چھاؤں میں
تیری شبستاں کے قریب

لیکن غسلخانہ ہی میں
خاموش واکڑوں بیٹھ کر
یہ سوچ کر اکثر ہنسا
یہ حسن بھی کیا چیز ہے
اک عشق کی دہلیز ہے
جس سے نہ دنیا بچ سکی
کیا جانور کیا آدمی
سب ہی کو ہے اس کی لگن
خرمستیاں سب کرتے ہیں
لیکن نہ میں اس راز کو
تجھ سے کبھی بتلاؤں گا

لرزاؤں گا دہلاؤں گا
یعنی کہ تیرے حسن پر
گدے بھی ہیں مچلے ہوئے
تیری شبستاں کے قریب

کنہیالال کپور:۔
خون ٹھہرا یا دل زار نہیں خون نہیں
مائیکل ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمۂ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔

اُردو نثر میں طنز و مزاح

اُردو نظم میں طنز و ظرافت کی ابتدا اگرچہ اُردو نثر سے بہت پہلے ہوئی مگر ظرافت کے میدان میں اگر ان دونوں صنفوں کا موازنہ کیا جائے تو نظم کا پلہ اُردو نثر کے مقابلہ میں بہت ہلکا اور سبک معلوم ہوگا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اکبرالہ آبادی اور اودھ پنچ کے ظرافت نگار شعراء کے بعد نظم کو کوئی ایسا ظرافت نگار شاعر نہ مل سکا جو اس صنفِ لطیف کی قیادت کے صحیح فرائض انجام دیتا البتہ نثر اردو کو اس کے بعد بھی ایسے ہنس مکھ زندہ دل اور شوخ رہنما ملتے رہے جو منزل بمنزل گردو پیش کے حالات اور واقعات پر فقرے بازیاں کرتے پھبتیاں کستے لطائف و ظرائف سے تھکن دور کرتے آگے بڑھتے رہے اور بالآخر بیسویں صدی تک پہنچکر نثر کے قافلہ سالاروں نے کاروان نظم کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔

اُردو نثر میں طنز و ظرافت کی ابتدا ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہوئی اور مرزا غالب نے اپنے شوخ اور تبسم نواز خطوط سے اس صنفِ لطیف کا افتتاح کیا اس کے بعد دوسرے مزاح نگاروں نے نئے نئے انداز اور نئے نئے اسالیب سے اِس کشتِ زعفران کی اپنی شوخیوں اور بذلہ سنجیوں سے

آبیاری کی۔ غالب کی شوخ نگاری اور ظرافت میں چونکہ ایک انفرادیت تھی اس لئے اس کا جواب تو اس وقت تک کوئی مزاح نگار پیدا نہ کر سکا۔ البتہ دوسرے مزاح نگاروں نے اِس صنف میں نئے نئے گوشے نکال کر اپنی شوخیوں اور بذلہ سنجیوں کے مظاہرے کئے غالب کی نثر میں غالب کے وہ خطوط ہیں جو وقتاً فوقتاً اُنھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے اور اِن خطوط نے اُردو ادب کو ایک نئی صفت عطا کی۔

غالب کا کلام اور اُن کے خطوط پڑھ کر کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اگر اُس دور کے سیاسی حالات پر امن ہوتے اور ان کی آرام پسند طبیعت کو ان کے حسب منشا سامان عیش و نشاط فراہم ہوتے اور اخلاقیات اور اُس دور کے مجلسی آداب ان کی شوخ اور ظریف فطرت کو آنکھ نہ دکھاتے تو شاید وہ اپنے دور کے ایک ایسے باکمال ظریف شاعر ہوتے جس کا جواب نہ صرف اُردو ادب بلکہ دنیا کا کوئی ادب کبھی نہ پیش کر سکتا۔ دراصل وہ ظریف شاعر ہونے سے بال بال بچ گئے۔

غالب کے یہاں ظرافت میں نہ سوداؔ کی سی ہجو ہے اور نہ وہ کسی کی عزت کے درپے ہوتے ہیں۔ ان کو ہجو سے اتنا ہی بعد ہے جتنا کہ سوداؔ کو کسی کی خالص تعریف سے لیکن رمز و کنایہ میں یا باتوں باتوں میں اگر ان کے یہاں کسی کی مذمت یا ہجو کا پہلو نکل بھی آتا ہے تو اس پر ظرافت کا ایسا گہرا صیقل ہوتا ہے کہ ہجو، ہجو نہیں رہتی۔ ان کی اور سوداؔ کی ہجو میں بڑا فرق ہے سوداؔ اس کے قائل ہیں کہ فضیحت کی جائے تو ایسی کہ حریف اپنی بوٹیاں نوچ لے۔ وہ اس درجہ

حساس تھے کہ اگر کسی سے بگڑتے تو پھر اُس کا خون پسینہ ایک کر دیتے اور اس کی جانب سے دل میں تنفر کو ایک مستقل جگہ دے لیتے مگر مرزا اس سے کوسوں دور تھے اول تو وہ ہجو کے قائل ہی نہ تھے دوسرے اگر وہ کسی سے ناراض کبھی ہوتے تو سب سے پہلے اِس کا خیال رکھتے کہ ان کی تحریر یا تقریر سے اس کی دل آزاری نہ ہو وہ ذاتیات پر حملے کرتے ہیں مگر بہت سوچ سمجھ کر چنانچہ ایک شخص مسمی عظیم الدین خاں نے مرزا سے اُن کا دیوان چھپوانے کے لئے لیا اور اُس میں لیت و لعل شروع کی۔ نہ دیوان چھپوایا نہ واپس بھیجا۔ مرزا سے میاں داد خاں سیاح نے پوچھا کہئے دیوان چھپا یا نہیں تو مرزا نے جواب دیا۔

"دیوان کا چھاپا کیا۔ وہ شخص ناآشنا موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگوا بھیجا آدمی نہیں ہے۔ بھوت ہے پلید ہے اور غول ہے قصہ مختصر نامعقول ہے"

مرزا کے بیشتر خطوط غدر کے بعد کے ہیں جب وہ خاصے بوڑھے ہو چکے تھے بڑھاپے کا خاصہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے بذلہ سنج اور زندہ دل کو چڑچڑا بنا دیتا ہے۔ دل مردہ ہو جاتا ہے اور طبیعت کی رنگینی میں فرق آجاتا ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ مرزا اپنے خطوط میں اپنی جوانی سے زیادہ جوان معلوم ہوتے ہیں حتی کہ آخر عمر میں آلام و مصائب کی یورش اور بیماری و پیرانہ سالی میں بھی ان کے منہ سے ظرافت کے رنگین اور خوشنما پھول جھڑتے ہیں۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں اور اس بارے میں تاکید کرتے ہیں کہ میرا عرف مرزا نوشہ کتاب پر نہ لکھا جائے۔

"صاحب مطبع نے خط کے لفافہ پر لکھا ہے۔ مرزا نوشہ صاحب غالب۔ بللہ غور کرو یہ کتنا بے جوڑ جملہ ہے ڈرتا ہوں کہ کہیں صفحہ اول کتاب پر بھی نہ لکھ دیں۔ آیا فارسی کا دیوان یا اردو یا پنج آہنگ یا مہر نیمروز چھاپے کی کوئی کتاب اس شہر میں نہیں پہنچی جو وہ میرا نام لکھ دیتے تم نے بھی اُن کو میرا نام نہیں بتایا۔ مرزا اپنی نفرت عرف سے وجہ اس نہاد یلا کی نہیں ہے بلکہ سبب یہ ہے کہ دلّی کے حاکم کو تو عرف معلوم ہے مگر کلکتہ سے ولایت تک یعنی وزرا کے محکمہ میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا ہیں۔ اگر صاحب مطبع نے مرزا نوشہ صاحب غالب لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا کھو یا گیا۔ میری محنت رائگاں گئی گویا کتاب کسی اور کی ہوگی "

دراصل ان کی ظرافت میں سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ وہ نہ پھبتی کہتے ہیں نہ ظرافت پیدا کرنے کی غرض سے انوکھی تشبیہیں ایجاد کرتے ہیں۔ نہ لطائف سے مدد لیتے ہیں اور نہ ضلع جگت کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ بلکہ وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ہم آپ روزمرہ اپنی تحریروں میں استعمال کرتے ہیں پھر بھی ان کی سادگی میں شوخی اور ظرافت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ وہ اگر رنج و ملال کا اظہار بھی کرتے ہیں تو اس میں اپنی فطری اور طبعی ظرافت کو چھپا نہیں پاتے۔ وہ اپنے خطوط میں خواہ کوئی تلخ واقعہ بیان کر رہے ہوں یا کوئی اخلاقی درس دے رہے ہوں۔ ان کا لہجہ اور اسلوب اس میں بھی جذبات مسرت

کی گہری بزی کرتا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی ظرافت میں ایک جاہ جلال، اور ایک روح پرور ظرافت ہوتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کو اگرچہ اس صنف پر خاصی قدرت حاصل تھی مگر ان کی ظرافت اول تو نظم تک محدود تھی دوسرے وہ ایک خاص فرقہ یا قوم کا خاکہ اڑا کر اُس میں ظرافت کا رنگ بھرتے تھے اور اسی پر ان کی ظریفانہ شاعری کا انحصار تھا۔ مگر غالب کو نظم و نثر دونوں پر یکساں عبور تھا۔ دونوں میں وہ ایک سی ظرافت پیدا کرنے کا ملکہ رکھتے تھے نہ تو وہ انوری سوزنی اور جعفر زٹلی کی طرح فواحش پر اتر آتے اور نہ الفاظ کے گورکھ دھندے سے ہر جگہ کام لیتے۔ نہ اکبر کی طرح وہ کسی طبقے یا فرقے کو اپنی ظرافت کا ہدف بناتے اور نہ سودا کی طرح ہجو لکھ کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے پہلو میں ایک بشاش بشاش دل رکھتے تھے۔ جو محسوس کرتے وہی زبان قلم سے ادا بھی کر دیتے۔ ان کی تحریر میں تصنع بناوٹ اور آورد نام کو نہ ہوتی۔ ان کی تحریر میں نہ تو رعایت لفظی کو دخل ہے نہ صنعت مراعات النظیر کو۔ وہ کسی کی پگڑی نہیں اچھالتے، کسی کی رسوائی کے درپے نہیں ہوتے۔ کسی کی ہجو کر کے اپنی نفرت کو تسکین نہیں دیتے۔

مرزا کی تشبیہات میں بھی ایک رنگینی اور شوخی ہوتی تھی چنانچہ منشی حبیب اللہ ذکا کو ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"کل ایک خط رجسٹری دار آیا
گویا ستارہ دنبالہ دار آیا"

کس درجہ معنی خیز تشبیہ ہے۔ وجہ شبہ یہ ہے کہ جیسے ستارہ دنبالہ دار میں ایک

دم لگی ہوتی ہے اسی طرح اس میں ایک سیدکا دم چھلا لگا ہوا تھا۔

بعض جگہ محض انداز بیان سے وہ مزاح پیدا کرتے ہیں اور کوئی ظریفانہ فقرہ نہیں استعمال کرتے۔ غلام نجف خاں نے اپنے آنے کے لئے مرزا کو لکھا تو اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"کہو اب خیر سے کب آؤ گے
کے برس، کے مہینے، کے دن راہ دکھاؤ گے"

نواب سعید الدین خاں شفیق رئیس کالپی مرزا کے غائبانہ دوست تھے ایک مرتبہ اُن کا خط آیا تو اُس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"پیر و مرشد ۱۲ بجے تھے۔ میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا میرا نقصان ہوتا۔"

غالب کے مزاح میں ایک رکھ رکھاؤ، ایک سنجیدگی اور ایک بلند حوصلگی ہے۔ ان کی تہنیت اور مبارکباد میں بھی ایک شوخی، ایک تبسم اور ایک دلنواز مسکراہٹ ہوتی ہے چنانچہ مرزا حاتم بیگ مہر کو عہدۂ وکالت کی مبارکباد اس انداز میں پیش کرتے ہیں۔

"صاحب میرے۔ عہدۂ وکالت مبارک ہو۔ موکلوں سے کام لیا کیجئے پریوں کو تسخیر کیا کیجئے۔"

مرزا کی نثر میں شوخی اور ظرافت کے ساتھ ساتھ جو طنز ہم کو ملتا ہے وہ ایسا

طنز ہے جسے تلخی اور رکاکت سے دور کا واسطہ نہیں ان کے طنز کو پڑھ کر خود ہدف مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کے طنز میں نہ تو عبارت آرائی کو دخل ہوتا ہے۔ اور نہ اس کے لئے وہ کوئی اہتمام کرتے بلکہ سیدھے سادھے فقروں میں ایسی دلنواز چٹکیاں لیتے ہیں جن سے بجائے ماتھے پر شکن پڑنے کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:-

"اشہد اللہ تم بانی بیت کے سلطان العلماء اور مجتہد العصر بن گئے۔ کہو وہاں کے لوگ تمہیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے یا نہیں"

میر مہدی کی عادت تھی کہ جب مرزا کو خط لکھنے بیٹھتے تو بڑے اہتمام سے کام لیتے اور عبارت میں شوخی اور تفنن پیدا کرنے کی غرض سے بڑے غور و فکر سے کام لیتے چنانچہ ایک خط میں میر مہدی کو لکھتے ہیں۔

"تم تو اردو کے مرزا قتیل بن گئے ہو۔ اردو بازار میں نہر کے کنارے رہتے رہتے رودنیل بن گئے ہو"

ایک مرتبہ میرن صاحب کو خرچ بھیجنے میں دیر ہو گئی۔ ان کی اہلیہ نے مرزا صاحب کو لکھ بھیجا کہ وہ ان کے شوہر کو توجہ دلائیں۔ اس پر باتوں باتوں میں سب کچھ کہنے کے بعد کبھی غور کیجئے تو کچھ نہیں کہا۔

"اجی وہ یوسف ہند نہ سہی یوسف دہر سہی، یوسف عصر سہی یوسف کشور سہی اور ان کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے

مجھے تو خبر نہیں کہیں حضرت کہہ گئے ہیں کہ میں ساڑھے سات روپیہ مہینہ بھیجے جاؤں گا۔ اب اون کا تقاضہ ہے۔ حسیم بخش روز آتا ہے اور کہتا ہے کہ بھو بیجا جان کو لکھو کبھو بھی جان بھو کی مرتی ہیں خرچ جلد بھیجو ورنہ نالش کی جائے گی اور تم کو گواہ قرار دیا جائے گا۔"

اسی خط میں میر مہدی پر طنز کرتے ہیں۔

"میرن صاحب کے خط کے لکھوانے میں تم نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اب اُن سے میرے خط کے جواب کا تقاضہ کیوں نہیں کرتے حسن بھی کیا چیز ہے۔ نادر کا اتنا خوف نہیں جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے تم اُن سے خواہش وصال کرتے ہوئے ڈرو میرے خط کے جواب کے باب میں کیوں نہیں کہتے۔"

مرزا حاتم بیگ مہر جن کو مرزا کے ہم وطن اور دوست ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اگر وہ مرزا کو خط لکھنے میں تساہل سے کام لیتے تو مرزا کو سخت ناگوار ہوتا اور شکوہ و شکایت کے دفتر کھول دیتے جس میں محبت طنز اور شکوہ سب ہی کچھ ہوتا چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں

"اگر تم مناسب جانو تو ایک بات میری مانو۔ رقعات عالمگیری انشا خلیفہ اپنے سامنے رکھ لیا کرو جو عبارت اُس میں سے پسند آیا کرے وہ خط میں لکھ دیا کرو خط مفت میں تمام

ہو جایا کرے۔ اور تمہارے خط کے آنے کا نام ہو جایا کرے۔
اگر کوئی قصیدہ کہا اُس کا دیکھنا مشاہدۂ اخبار پر موقوف
رہا ہے

براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو

واقعی جو اخبار آگرہ سے دلی آتے ہیں وہ میرے سامنے پڑھے
جاتے ہیں۔ صاحب ہوش میں آؤ اور مجھکو بتاؤ کہ یہاں جو
پارسیوں کی دوکانوں میں فرینچ اور شامپین کے درجن دھرے
ہوئے ہیں یا ساہوکاروں اور جوہریوں کے گھر جواہر اور
روپیہ بھرے ہوئے ہیں میں کہاں وہ شراب پینے جاؤں گا اور
وہ مال کیونکر اُٹھاؤں گا بس اب زیادہ باتیں نہ بنائیے
اور قصیدہ مجھکو بھجوائیے "

مرزا ریاضی جیسے خشک اور غیر شاعرانہ مضمون کو بھی ادب اور ظرافت
کا جامہ پہنا کر اپنے خطوط میں اس طرح لا کھڑا کرتے ہیں کہ ریاضی کے ماہرین
بھی اپنے سوال چھوڑ کر ہنسنے اور قہقہے لگانے پر مجبور ہو جائیں چنانچہ
ایک خط میں مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:۔

"بندہ پرور بابو صاحب نے پہلی بار تو مجھکو دو ہنڈیاں بھیجی
ہیں۔ سو سو روپیہ کی۔ ایک تو میر احمد حسین میکش کے واسطے
راجہ صاحب کی طرف سے تاریخ تولد کنور صاحب کے انعام
میں۔ اور ایک اپنی طرف سے مجھکو بطریق نذر شاگردی بعد

اس کے دو ہنڈیاں سو سو روپے کی بعد چار چار پانچ پانچ مہینے کے آئیں مع میر احمد حسین کے صلے روپیوں کی چار سو اور اس سے علاوہ تین سو۔ کتنے دن میں آئے۔ اس کا حساب کنور صاحب کی عمر بہ حوالہ ہے۔ اگر وہ دو دو برس کے ہیں تو دو برس میں۔ اور اگر وہ تین تین برس کے ہیں تو تین تین برس میں۔"

پنشن ملنے کے بعد میر مہدی کو لکھتے ہیں۔ اور حساب بتاتے ہیں۔

"مختار کار دو ہزار لایا۔ چونکہ میں اُس کا قرضدار ہوں۔ روپیہ اُس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا میرا حساب کیجیے۔ حساب کیا۔ سُود مول سات کم پندرہ سو ہوئے میں نے کہا میرے قرضۂ متفرق کا حساب کر۔ کچھ اوپر گیارہ سو نکلے۔ میں کہتا ہوں یہ گیارہ سو بانٹ دے۔ نو سو بچے۔ آدھے تو لے آدھے مجھے۔ وہ کہتا ہے سات کم پندرہ سو مجھے دو۔ پانسو سات تم لو۔ یہ جھگڑا مٹ جائے گا۔ تب کچھ ہاتھ آئے گا۔ خزانہ سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی۔ پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں۔ جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دار و گیر سے بچنا کرامت اسد اللہی ہے۔ ان بیسوں کا ہاتھ آنا عطیۂ یداللہی ہے۔"

نواب علاء الدین احمد خاں نے آنے کو لکھا اور نہ آئے تو مرزا نے لکھا کہ

کہ شاید تم نہیں آسکو بہیں سے ظرافت کے پھول بوٹے کھلانا شروع کر دیے۔ لکھتے ہیں۔

"ہے ہے میں تو کہتا ہوں نہ آسکو اس ماہ مبارک میں اقتضائے حکم سرکار کا وہ ہنگامہ گرم ہو کہ پارسیوں کی عید کوسہ برنشین کا گمان گزرے۔ دور کیوں جاؤ ہولی کی دلہنڈی کا سماں لسارو میں بندھ جائے۔ ایک خر سوار کی سواری بڑے دھوم سے نکلے حسن اتفاق یہ کہ وہی موسم ہے ہولی اور عید کوسہ برنشیں کا زمانہ باہم ہے۔ حوت کے آفتاب میں یہ دونوں تہوار ہوتے ہیں۔ کل آفتاب حوت میں آیا ہے پرکوسہ برنشیں اور ہولی کا مژدہ لایا ہے۔ خیر میں چند روز اور کشمکش فراق اور تیرے دیدار کا مشتاق ہوں تو کوسہ برنشیں اور ہولی کی رنگ رلیاں منالے۔ اور خر سوار کو بضرب تازیانہ دوڑالے۔ علاء الدین خاں واللہ تو میرا فرزند روحانی معنوی ہے فرق اسی قدر ہے کہ میں جاہل ہوں اور تو مولوی ہے۔ ارے ظالم اس کوسہ برنشیں کی داد دے۔ عقل کرامت ہے، الہام ہے۔ لطف طبع ہے۔ کیا ہے۔ یہ رسم کس قدر مناسب ہے"!

تعزیت اور عیادت کے لئے چند بندھے فقرے ہیں جو عموماً تلقین صبر کے لئے پس ماندگان کو لکھے جاتے ہیں مگر غالب کی تعزیت میں بھی ایک شوخی ایک ظریفانہ انداز اور ایک شگفتگی ہے۔ مرزا تفتہ کے ایک دوست امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے مرنے کی اطلاع جب مرزا تفتہ نے غالب کو دی تو مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھکو رحم۔ اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اوس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔"

اسی طرح میر مہدی نے میر اشرف علی کو لکھا کہ تمہاری بھانجی کا انتقال ہو گیا مگر نام نہ لکھا۔ مرزا نے اونکی طرف سے میر مہدی کو لکھا اور غم میں بھی نہ ننگ ظرافت قائم رکھا۔ لکھتے ہیں۔

"اوس غریب کا یہ قول ہے کہ میری دونوں بہنیں اور پانچ بھانجیاں پانی پت میں ہیں۔ کیا چچا کو نہ معلوم ہوگا کہ کون سی لڑکی مری۔ کاش اوس کے باپ کا نام لکھتے تاکہ میں جانتا کہ کونسی بھانجی مری ہے اب میں کس کا نام لیکر روؤں اور کس کا فاتحہ دلواؤں۔"

مرزا حاتم علی بیگ مہر کی ایک محبوبہ کا انتقال ہو گیا مرزا کو خبر ہوئی تو تعزیتی خط میں لکھتے ہیں۔

"سنو صاحب۔ شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ

مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اُس کے سامنے مری تھی۔
تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری۔ تم اُس سے بڑھ کر ہوئے
کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں
مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پہ مرتے ہیں
اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک
بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے خدا ان دونوں
کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے
ہوئے ہیں۔ مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ
ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے بیگانہ محض ہو گیا
ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔"

خطوط اکبر نے بھی لکھے ہیں اور وہ چونکہ خالص ظریف شاعر تھے
اور غالب ہی کی طرح ان کے ہر ہر فقرے اور ہر ہر لفظ سے ظرافت پھوٹی
نکلتی تھی مگر اُن کے اکثر خطوط میں حزن و ملال۔ رنج و غم اور بڑھاپے کے
آلام اور مصائب کا رونا ہے۔ مندرجہ ذیل خط جو اکبر نے ۱۴/ اپریل ۱۹۲۱ء
کو خواجہ حسن نظامی مرحوم کو لکھا اُس سے اندازہ ہوگا کہ غالب اور اکبر کی طرز نگارش
میں کتنا فرق تھا اور ان کے خطوط میں شوخی کی کتنی کمی تھی۔

"پیارے خواجہ صاحب۔ خود آپ کیسے ہیں۔ میں زندہ ہوں
لیکن نشاط زندگی کی بے حد کمی ہے۔ سلیمان ان سے رخصت
ہو گیا ہے۔ رحیمن بیمار ہو کر گھر چلی گئی ہے۔ احاطہ سنسان

ہے۔ عشرت بلاتے ہیں کس پر گھر چھوڑوں۔ ماجد صاحب نے دریاباد بارہ بنکی میں سکونت اختیار کی لکھتے ہیں کہ ضرورت ہو تو الٰہ آباد پرتاب گڈھ آؤں۔ درویشوں کا تذکرہ آپ کے قلم سے چاہتے ہیں۔ عزیز لکھنوی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ متعجب ہوئے کہ یا تو وہ چہل پہل اور چمک تھی یا یہ سناٹا۔ میرے اس نئے شعر کی بہت داد دی ؎

انھی الفاظ سے اب ذہن خفتہ کو جگاتا ہے
شریعت سر جھکاتا ہے طریقت دل لگاتا ہے

ان کے اکثر خطوط پڑھ کر میر کے خطوط کا شبہ ہونے لگتا ہے مگر غالب کے خطوط میں جو شوخی، دل آویزی اور زندہ دلی نظر آتی ہے اُس سے کوئی اجنبی اس کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ خطوط کسی بوڑھے آدمی کے لکھے ہوئے ہیں — مگر اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب اُردو نثر میں باقاعدہ طور پر مزاحیہ نگاری کا آغاز ۱۸۷۷ء میں ہوا یہ وہ دور تھا جب سودا اور انشا کی ظرافت اور چٹکلوں کی جگہ مغرب پرستی پر پھبتیاں اور چوٹیں چل رہی تھیں اور معیاری ظرافت کے لئے میدان تیار ہو رہا تھا۔ لکھنؤ کی ادبی فضا ضلع جگت اور رعایت لفظی سے معمور تھی۔ بیگماتی زبان کے چٹخاروں سے ابھی کام و دہن لذت محسوس کرتے تھے۔ لکھنؤ کے میوہ فروش بھی تشبیہ اور استعاروں میں بات کرتے تھے اور ککڑیوں کے بیچنے میں "لیلیٰ کی انگلیاں ہیں مجنوں کی پسلیاں ہیں" کی آوازیں لگتیں۔ اس فضا میں منشی سجاد حسین نے انگریزی اخبار پنچ کے نمونے

پر اُردو میں اودھ پنچ نکالا تو اُن کے ساتھی لکھنے والوں میں جیسا کہ پچھلے صفحات میں بتایا جاچکا ہے اکبر الہ آبادی تھے جو اس وقت تک سنجیدہ شعر کہتے تھے مگر اودھ پنچ کے آغاز ہی سے انھوں نے متین اور سنجیدہ شاعری ترک کر کے ظرافت کے کوچے میں ایسا قدم رکھا کہ بس وہیں کے ہو رہے۔

منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ کے ساتھیوں میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف۔ احمد علی شوق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر۔ نواب سید محمد آزاد۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ منشی احمد علی کسمنڈوی اور اکبر الہ آبادی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مگر اودھ پنچ کی ظرافت میں ہم کو وہ لطافت اور پاکیزگی نہیں ملتی جو غالب کی نثر میں زیر لب تبسم کی محرک ہوتی ہے۔ اور اسی سبب اُردوئے معلیٰ پڑھنے والی طبیعتیں اُس سے لطف اندوز نہیں ہو پائیں۔ اودھ پنچ کے نامہ نگار طبعی طور پر چلبلے، شوخ، بذلہ سنج اور ایسے ظریف تھے جو پھکڑ بازی میں کبھی بند نہ تھے۔ ان کی زبان میں پختگی اور لکھنؤ کی بول چال اور محاوروں کی صفائی اور ستھرائی پائی جاتی ہے۔

منشی سجاد حسین علی گڑھ تحریک اور سرسید کے نظریوں سے چونکہ متفق نہ تھے اور نظام معاشرت میں قدامت پرست واقع ہوئے تھے اس لئے اودھ پنچ کے بیشتر مضامین کی تان یا تو انگریزی سیاست پر ٹوٹتی یا سرسید پر۔ اودھ پنچ کے ہر پرچے میں کوئی نہ کوئی چٹیلا مضمون ایسا ضرور ہوتا جس میں اس تحریک کا استہزا حکومت وقت پر چوٹیں اور مغربی تہذیب پر لعن طعن ہوتا چنانچہ منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ کے بارے میں پنڈت برج نرائن چکبست لکھتے

ہیں کہ۔

"اودھ پنچ کی ترقی اور وقعت کا راز بہت کچھ اُس کے ایڈیٹر کی ذات سے وابستہ تھا۔خلقی ذہانت اور طباعی کے علاوہ وہ بڑے زندہ دل تھے۔ سخت سے سخت تکلیف کے عالم میں بھی ان کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلا کرتی ۔"

وہ پہلے صحافت ہیں جنھوں نے صحافت میں طنز و ظرافت کی ابتدا کی۔ اُن کو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان پر پورا پورا عبور تھا۔ وہ عربی۔ فارسی۔ ہندی اور انگریزی زبان پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اُن کے دور میں چونکہ مغربیت کا سیلاب مشرقی تہذیب پر بتدریج اثر انداز ہو رہا تھا اور مشرق اِس مغرب پرستی کی طرف جھک رہا تھا اِس لئے سجاد حسین نے مشرقی تہذیب کی حمایت میں علم بغاوت بلند کیا اور اس کے خلاف خوب خوب مضامین نثر و نظم میں لکھے۔ اکبرؔ کی طرح وہ مشرقی سماج کی خامیوں کو طشت از بام کرتے تھے۔ ان کی بے لاگ صداقت اور بے لوث طنز نے ان کو ایک بہترین ظرافت نگار بنا دیا۔ ۱۸۷۷ء سے ۱۹۱۲ء تک کم و بیش چھتیس سال انھوں نے اودھ پنچ کے ذریعہ اردو ادب کی خدمت کی۔ وہ بلا کے وضعدار تھے اور آخر دم تک اُسی ایک وضع پر قائم رہے۔ طبیعت میں بلا کی شوخی تھی تنگ دستی کے عالم میں بھی ان کے چہرے کی بشاشت کم نہ ہوتی۔ انھوں نے اپنے دور کے سیاسی مسائل پر بڑے ظریفانہ انداز میں تنقیدیں کی ہیں۔ انھوں نے اپنی جولانیٔ طبع سے ادب کے بہتے ہوئے دھارے کا رخ بدل دیا اور تاریخ کے نئے نئے دروازے کھول دیے اور ہنسی

اور مذاق کے سانچے سے آزادی کی جنگ کے لئے ہتھیار بنائے اور ملک والوں کے خیالات میں جوار بھاٹے کا سماں پیدا کر دیا۔

سجاد حسین کا سب سے بڑا کارنامہ دراصل ان کا ناول "حاجی بغلول" ہے جس کو اُردو ادب میں وہی حیثیت حاصل ہے جو سرشار کے خوجی کو، یہ واقعہ ہے کہ اُردو ظرافت کا دامن بہت سبک رہ جاتا اگر "حاجی بغلول" کا کردار وجود میں نہ آتا۔ رشید احمد صدیقی نے بالکل ٹھیک کہا کہ

"حاجی بغلول ایک طور پر ڈکنس کے پک وک ابراڈ کا نامکمل اور ایک حیثیت سے ناقص چربہ ہے لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حاجی بغلول اُردو ظریفات اور ظرافت میں منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اب تک اس کا جواب اُردو میں کہیں نظر نہیں آیا۔"

رشید احمد صدیقی کے اس بیان کی تردید میں پروفیسر کلیم الدین لکھتے ہیں۔

"حاجی بغلول سراسر نامکمل اور ناقص ہے اس کی اہمیت یہی ہے کہ اس سے ایک نئی راہ کھلتی ہے۔"

پروفیسر کلیم الدین کی طبیعت اور مزاج کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ اگر کوئی نقاد کسی ادیب کی کبھی تعریف بھی کرے تو وہ اُس نقاد کے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جاتے ہیں اور کسی نہ کسی پہلو سے اُس ادیب کی مذمت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیں گے۔ حاجی بغلول کے معاملہ میں چونکہ انھیں رشید احمد صدیقی کی تردید کرنا تھی اس لئے ڈکنس کے مقابلہ میں تو انھوں نے حاجی بغلول کو نامکمل

اور ناقص بتایا اور سرشار کے خوجی کے مقابلہ اُسے پست قرار دے دیا اور اس کے مقابلہ میں خوجی کی تعریف میں بہت سے اقتباسات دے کر اُسے افضلیت کی پوشاک پہنا دی مگر ان کے عیب جویانہ قلم کی زد سے خوجی بھی نہیں بچا چنانچہ ساری تعریفیں کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"ان سب خوبیوں کے باوجود بھی خوجی کا کیرکٹر ناقص ہے اور یہ وہی نقص ہے جو فسانہ آزاد کا عام نقص ہے یعنی تکلف اور اس تکلف کا لازمی نتیجہ ضرورت سے زیادہ طوالت اور خانہ پری ہے"

اودھ پنچ کی اشاعت ان معنوں میں بھی بہت اہمیت رکھتی ہے کہ ہمارے ادب میں اس وقت تک غالب کے خطوط کے علاوہ مزاح و ظرافت کے اچھے نمونے اُردو نثر میں موجود نہ تھے اودھ پنچ پہلا اخبار تھا جس نے اخباری دنیا میں نہ صرف لطیف طنز اور ظرافت کے نئے باب کا اضافہ کیا بلکہ اخباری دنیا میں خام سیاست دانوں کی کمزوریوں کو ظریفانہ انداز میں طشت از بام کیا اس سلسلہ میں منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ نے ایک فرضی خطوط کا سلسلہ شروع کیا تھا جن میں ابتدائی تین خط گلیڈسٹون وزیر اعظم انگلستان کے نام ہیں چوتھا اور پانچواں خط ملکہ وکٹوریہ کے نام ہے اور اسی طرح مہاراج کشمیر، نظام دکن بیگم بھوپال، لارڈ ڈفرن اور پیارے کرمس یا ٹنڈنٹ کا پیارا خط پیارے سالے کے نام شامل ہیں۔ یہ خطوط غالب کے خطوط سے ان معنوں میں ضرور مختلف تھے کہ غالب کے خطوط میں آپ بیتی ہوتی تھی اور سجاد حسین کے خطوط جگ بیتی کے آئینہ دار تھے۔ یہ خطوط ہندوستان کے گورنروں، وائسراؤں، والیان ریاست

اور دوسرے انگریزوں کے نام جن سے وہ روشناس بھی نہ تھے۔ غالب اپنے دوستوں کے نام خطوط لکھ کر اپنے دل کا غبار ہلکا کرتے تھے اور سجاد حسین سارے ہندوستانیوں کی طرف سے اپنے دل کا غبار نکالتے تھے۔ ان کے خطوط نہ تو کسی ڈاک کے رہین منت ہوتے اور نہ مکتوب الیہ تک ان کی رسائی ہوتی بلکہ ان کے پڑھنے والے وہ ہزاروں انسان ہوتے جن کی بپتا ان میں درج ہوتی۔ ان خطوط کا ڈھانچہ ان کی شخصی زندگی اور معمولات کا بنا نہ ہوتا بلکہ ان کا پیکر اُن لکیروں کا بنا ہوتا جن میں برطانیہ کی خارجی پالیسی کے وہ نقوش ہوتے جنہوں نے تیس پینتیس کروڑ ہندوستانیوں کے ساتھ نقش سلیمانی بن کر اپنی حکمت عملیوں کا غلام بنا رکھا تھا۔ اُن میں دنیا پر انگریزی سیاست کے فریب کاریوں کے نقشے ہوتے۔ ان خطوط کا ایک ایک حرف اپنے اندر کوئی نہ کوئی "تاریخی انقلاب" سموئے تھا۔ گلیڈسٹن کے نام جو خط ہے اس میں ان جملوں کا تاریخی پھیلاؤ ملاحظہ ہو۔

"فارن معاملات کیسے پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ تم نے جو کچھ کسی قوم یا معاملے کی نسبت رائے قائم کی وہ اکثر غلط نکلی۔ تم بغاوت کو قومی میں منتھی سمجھے۔ ایک عرابی گیا مہدی سوڈانی آیا۔"

اسی طرح لارڈ ڈفرن کے نام جو خط ہے اس کا یہ جملہ محل نظر ہے۔

"بارہ سو افغان کٹ گیا۔ جاڑے پالے کے مارے ٹھنڈے ٹھنڈے ملک عدم کا رستہ ناپنے لگے۔"

یہ خطوط صرف اس لئے اہم نہیں ہیں کہ ان کے ذریعہ مکتوب نگار نے اردو

نثر میں ظریفانہ لحن کو کچھ بلندیاں بخشیں۔ ظریفانہ نثر کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ان کے ذریعہ ستھرے طنز کو جلا دی۔ بلکہ اس کی ایک ایک پھبتی ظرافت کا ایک دفتر ہے۔ ان خطوط میں بے پناہ سیاسی اہمیت ہے۔

اس کے علاوہ القاب و آداب میں بھی ایک ندرت ہے سولوی گلیڈسٹون قسم کے القاب۔ پیارے کار سپانڈنٹ کا پیارا خط پیارے سالے کے نام۔ انڈے بچے والی چیل چلھاڑ جیسے عنوانات میں نہ صرف ظریفانہ رنگ پیدا کیا گیا ہے بلکہ اس کے ذریعہ آئندہ طنز نگاروں کے لئے نئے راستے کھولے ہیں چنانچہ آگے چل کر مرزا فرحت اللہ بیگ نے اسی ڈھنگ پر نواب کے قار خاں و فتوح الکلاب قسم کے نام لکھ کر ان خطابات کو اور جلا دی۔

نظام حیدرآباد کے نام جو ان کا خط ہے اس میں ان کا یہ فقرہ

"ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ بعض بعض لوگ عہدوں کی سوداگری کرتے ہیں اور غالباً یہی وجہ اور کبھی بار بار نظام بدلنے کی ہوگی خیر سردست اور کچھ نہیں اس تجارت پر محصول چنگی تو تم بھی قائم کر دو۔"

ان خطوط میں بڑے لطیف طنز اور اشارے ہیں۔ ہندی کے ایک مصنف مسٹر بھٹناگر نے ہندی کی "چندرکا" "ہریش چندر میگزین" "بھارت متر" اور بنگلا کے "سولبھ سماچار" کی ظرافت کے سلسلہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ

"انیسویں صدی عیسوی کی ظریفانہ تحریروں کا مرکز کاشی رہا ہے۔ مگر ظرافت کا جو لب ولہجہ اردو کا اودھ پنچ پیش کرتا تھا وہ ان میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ اور ہندی کا کوئی پنچ اودھ پنچ

سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔"
گلیڈسٹن کے نام اُن کے خط کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔
"مولوی گلیڈسٹن صاحب طولعمرہٗ!
دعائے خیر نصیب شما باد۔ ایسے زمانے میں جب کہ
چاروں طرف سے ہوائے شر و فساد کے جھونکے آ رہے ہیں۔
تمھارے حق میں شاید ہی اس سے بڑھ کر کوئی دعا ہو۔ تم پولٹیکل
دستر خوان کے اچھے خانساماں اور ہوشیار خدمت گار ہو۔ پکا
پکایا کھانا تیار۔ ہانڈی تم خوب چن سکتے ہو۔ مگر ہانڈی پکانے
اور چیز تیار کرنے کے نام سے خاک دھول بکائن کے پھول۔"
لندن پنچ کے کارٹون دیکھ کر انھوں نے مشرقی تہذیب اور کلچر کی روشنی
میں نئے کارٹون بنوائے اس زمانہ کا مشہور کارٹونسٹ مشہور مصور رام بہادر تھا۔
وہ بڑے بڑے اصلاحی مضامین طنز و مزاح کے پیرائے میں لکھتے۔ ان کی ساری
عمر سیاست اور اخلاق اور تمدن کی راہوں میں جتنے جھاڑ جھنکار نظر آتے انھیں
صاف کرتے گذری۔ ان کی عبارت بے تکلفی، تازگی اور خداداد شوخی سے معمور
تھی۔ اُن کے مضامین چھوٹے چھوٹے چٹکلوں کے ذخیرے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ پڑھنے والا مصنف سے ہمکلام ہے۔ عبارت اکثر علوم و فنون کے پیچیدہ استعارات
سے گرانبار نظر آتی ہے۔ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں ان کی "نوکل" کا ایک ٹکڑا ملاحظہ
ہو۔
"پانی وانی خاک نہیں برستا جہاں ادھر دھواں دھار گھٹا اُٹھی ہوا

نے طمانچوں سے بوکھلا دیا بیچاری ہوا ہو گئی۔ یہاں کے بھی مسلمانوں نے نماز استسقا کئی دن پڑھی ابھی تک کچھ اثر نہیں ہوا۔ سنتے ہیں رنڈیوں نے بھی علم اُٹھائے مگر پیر فلک ذرا نہ پسیجا۔ مولویوں کی نماز ہو چکی، رنڈیوں کے علم اُٹھ چکے اب زنانوں کی عبادت باقی ہے۔

بالفعل سٹی مجسٹریٹی میں مسماۃ احمدی خانم کی طرف سے میر تصدق حسین عرف چھوٹے صاحب پر جو اب امجد علی خاں صاحب کے صاحبزادے کہلاتے ہیں زبردستی سر مونڈ ڈالنے کا مقدمہ دائر ہے کیفیت یہ ہے کہ احمدی خانم امجد علی خاں صاحب مرحوم کے خورد محل کی ملازم بعہدہ پیش خدمتی تھی کسی روز بال بنا کر سامنے آئی، بیگم صاحبہ یعنے زوجۂ منکوحہ چھوٹے صاحب کو ناگوار گذرا کچھ خفا ہوئیں اُس نے جواب دیا تو اور بھی بلا نازل ہوئی بال بال ہو گئے زلف کی طرح پیچ و تاب میں آ کر اس کے سر پر آفت نازل کی کہ خاوند صاحب کو حکم دیا کہ سر مونڈ ڈالو۔ وہ مقراض لیکر مستعد ہو گئے۔ بال ہارتے صفایا بول دیا۔ اور پھر آئینہ دکھایا۔ (اس کی وجہ ہم پھر لکھیں گے نواب صاحب کو اس نوجوان عورت پر دست درازی کرنے کا کیا حق تھا اور عورت نے کس دھوکے میں کشمکش نہ کی)

جب سب بال مونڈے گئے تو اُس نے واویلا مچایا مختصر یہ کہ

عدالت تک نوبت پہنچی اب دیکھئے کس کے حق میں کیا حکم ہوتا ہے۔

۲۶ تاریخ ۸ بجے شب کو رحمان نزیر بالی والے نے مسماۃ شہنیا بیلم کماری قوم ہندو کی ناک دانت سے کاٹ کھائی۔ شیخ سعدی کے بغداد کی بیر مرد لطیف کی لڑکی کے تو لب کفش دوز نے کاٹے یہاں ناک کے ساتھ گئی سنتے ہیں عورت کو کوئی دعویٰ نہیں ہے۔"

ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ابن الوقت میں ابن الوقت کی "انگریزی پوشاک پہننے" کے بورے نواب کو کوٹ پہننے ملاحظہ فرمایئے۔

"انگریزی پوشاک پہننے چلے قمیص سے کچھ مانوس تھے۔ کف دار کرتے پہنا کرتے تھے۔ پہلے اس کو پہنا۔ پھر ویسٹ کوٹ زیب جسم کیا۔ اب پتلون کی باری آئی۔ قمیص کے دامنوں اور پتلون میں جھگڑا ہو گیا۔ کبھی پتلون اوپر کبھی دامن۔ کسی طرح جول نہیں ٹھیک بیٹھتی۔ بڑی دقت۔ بیریسٹر نے ڈال ہی جب کاندھوں پر بے جاتے ہیں دامن سمٹ کر ناف پر۔ لب دریا کف جمع۔ بہزار دقت توڑ مروڑ کر کمر کے گرد جمع کئے۔ ویسٹ کوٹ سے چھپائے۔ بریسیز شانے پر نہ پہنچے۔ مگر ویسٹ کوٹ کے اوپر پھر کوٹ پہنا بظاہر جنٹلمین بننے میں کسر باقی نہ رہی۔

صبح کا وقت تھا۔ آقائے نعمت باغ میں ٹہلتے تھے۔ پہنچے آداب بجا لائے غور سے دیکھے گئے۔ ساتھ ساتھ ہو لئے۔

اور پوشاک تو سب ٹھیک ہے مگر تپلون ڈھیلی پڑتی جاتی ہے۔
کپڑا ٹوٹتا ہوگا۔ کچھ نیچے کھسکتی جاتی ہے۔ لا بنی بنائی کچی
ہوگی۔ اب بوٹ کی ایڑی کے نیچے آنے لگی۔ یا موذ کبوتر ہوتے
جاتے ہیں۔ آخر آنکھ بچا۔ دونوں ہاتھوں سے جھٹ ھانی پڑی
پھر نیچے آگئی۔ یا اللہ پتلون ہے یا شیطان کی آنت۔"

منشی سجاد حسین کے ناولوں میں میٹھی چھری۔ طرحدار لونڈی۔ حاجی بغلول
کایا پلٹ، پیاری دنیا اور احمق الذین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مگر
جس طرح اودھ اخبار میں تفریحی مضامین ہوتے تھے اُسی طرح اُن کے ناول
بھی تفریح اور تفنن طبع کے لئے بہترین ہیں اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان اور ضلع
جگت کا اُن سے بہتر نمونہ ملنا مشکل ہے۔

اودھ پنچ کے دوسرے مشہور لکھنے والے مرزا محمد مرتضیٰ المتخلص بہ عاشق تھے
جو مرزا مچھو بیگ ستم ظریف کے نام سے اودھ پنچ میں نظم و نثر لکھتے تھے۔
انھوں نے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ ۱۸۸۸ء کے بعد شروع کیا۔ مولانا حسرت موہانی
ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"آپ کی نظم و نثر کے تمام کارنامے ۱۸۸۸ء کے بعد کے ہیں۔ مرزا
نسیم مرحوم (استاد مرزا مچھو بیگ) اُسی زمانے میں دلی سے تشریف
لائے تھے۔ ان کی صحبت اور شاگردی نے سمند ناز پہ تازیانے
کا کام کیا اور آپ کے ادبی مذاق کی خوبیوں نے روز افزوں ترقی

کے ساتھ وہ مرتبہ حاصل کیا کہ آپ نثر نگاری میں یکتائے روزگار اور سخن سنجی میں استاد قرار پائے۔ لکھنؤ کے مشہور ظریف اخبار اودھ پنچ میں اس کی ابتدا سے لیکر اپنی آخری عمر تک ۳۰ سال برابر ستم ظریف کے فرضی نام سے ایسے دلچسپ مضامین لکھتے رہے جن کا ادبی اور تنقیدی حیثیت سے بے مثل و نظیر ہونا آجتک اہل قلم کے حلقہ میں مسلم ہے۔ لکھنؤ کی زبان اور محاوروں کی جتنی تحقیق مرزائے مرحوم کو تھی اس کا اندازہ ان کی مشہور تصنیف بہار ہند کے دیکھنے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ملک نے اس کی کافی قدر نہ کی ورنہ اگر اس کے باقی تین حصے بھی چھپ جاتے تو اُردو کی اصطلاحوں اور محاوروں کا ایک لاجواب مجموعہ مرتب ہو جاتا۔ مولوی حکیم الدین وکیل اکوٹانے علم و ادب کے متعلق اودھ پنچ سے آپ کے بعض مضامین نقل کر کے "چشم بصیرت" کے نام سے ایک کتاب کی صورت میں چھپوا دیا ہے۔ مگر وہ اب کمیاب ہے۔ گلزار نجات۔ میلاد شریف، نظم اور مثنوی نیرنگ خیال کے علاوہ آپ کا ایک ضخیم دیوان اصناف سخن آپ کے خلف الرشید محمد صادق صاحب صادق کے پاس موجود ہے۔

مچھو بیگ ستم ظریف چونکہ فطرتاً ظریف تھے اس لئے جہاں تک زبان کی پختگی، لکھنؤ کی بول چال اور محاوروں کی صفائی کا تعلق ہے اُن کا رنگ اودھ پنچ کے دوسرے مزاح نگاروں سے جدا ہے ان کی زبان کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"بس ہو چکا - خوب دیکھا - اب وہ ہماری بات کہاں - صورت سے نفرت ہے - رسیاں تڑاتے ہیں - اے صاحب وہ نہیں کہتے کہ چار دن کی چاندنی پھر اندھیرا پاکھ - کون کس کا ہوا ہے - ایک سی بات ذرا مشکل ہے - اب کی یہی کیفیت یہی نگاہ تھی - اب مشکل کشائی کی قسم وہ آنکھ ہی نہیں - گھڑی بھر کو گھر میں آتے ہیں تو رسیاں تڑاتے ہیں - گندے تولا کرتے ہیں - یہی معلوم ہوتا ہے کہ کیونکر باہر اُٹھ جاؤں - کب نظر بچے کہ ہوا ہوں - توبہ ہے - ہم سے تو نگوڑی کبوتری اچھی - جب دیکھو کبوتر اس کے گرد پھرتا ہے چونچ سے کھینچتا جاتا ہے - جوبن دیکھتا ہے - اور تو اور اپنے پیٹ کا دانا اس کے منہ میں اُگل آپ بیچارہ بھوکا رہتا ہے - پھر یہ ایک پیار اخلاص ہی نہیں - بچے پالے - تنکے چونچ میں اُٹھا لاتے - دربے میں گھر بنائے - انڈے سیا کرے - بچوں کو بھرائے - کبوتری ذرا باہر نکلی اور غوں غوں یہ اپنی زبان میں بلاتا ہے - زبان تو ہے نہیں کہ کہے - مطلب یہ کہ تو کیوں تکلیف کرتی ہے یہیں چین سے بیٹھی رہ - اور مزا یہ کہ وہ قطامہ ادھر رخ نہیں کرتی بھاگتی ہے - دس دفعہ کی خوشامد درآمد میں ایک دفعہ شاید یہ بھی چونچ سے چونچ ملا دیتی ہے - اور بڑی بڑائی ادھر ادھر اتراتی اترانی دم لٹکائے تیرتی پھرتی ہے - ابھی کل کی بات ہے - کتنا مرتبہ میں نے خود کہا کہ کیوں صاحب تم نے

تواب سب کہیں کا آنا جانا اوٹھنا بیٹھنا چھوڑ ہی دیا۔ دن رات گھر میں کھونٹے سے الگ بیٹھے رہتے ہو۔ گھڑی بھر کو ٹانگیں سیدھی کر لیا کرو۔ اسی وجہ سے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ تلی بلی جلا کرتی ہے۔ تو حضور۔ فرماتے تھے کہ صاحب سنو باہر تم نہیں جا سکتیں اب تمہارے دیکھے بغیر چین کیونکر آئے؟"

اودھ پنچ کے ابتدائی لکھنے والوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار ہیں جو ایک مصور کا قلم اور رنگ ظرافت صلاحیتیں لیکر پیدا ہوئے تھے اگر ان صلاحیتوں کے ساتھ وہ ہندوستان کے بجائے کسی مغربی ملک میں بحیثیت ادیب ہی پیدا ہوئے ہوتے تو شاید یورپ کے سیکڑوں ممتاز ادیبوں کے چراغ گل کر جاتے۔ اپنے زمانے کے حالات، واقعات اور ماحول کی مناسبت سے جتنی شوخی، زندہ دلی ٹھٹھول اور ظرافت قدرت کی طرف سے ان کو ودیعت ہوئی تھی وہ اُس دور سے لیکر ابتک شاید کسی کو میسر نہ ہوئی۔ ماحول بھی ان کو ویسا ہی ملا جس میں انکی فطری ظرافت کو پھولنے اور پھلنے کے لئے بڑی وسعت تھی۔ اُس دور کی خصوصیات کا حال پنڈت کشن پرشاد کول کی زبان سے سُنئے۔

"سلطنت مغلیہ کے زوال پذیر ہونے پر جب اُس کا شیرازہ تتر بتر ہونے لگا تو صوبے داروں نے سلطنت سے قطع تعلق کر کے اپنی اپنی آزاد حکومتیں قائم کرنا شروع کر دیں۔ خاص کر حیدر آباد بنگالہ، اور اودھ کے صوبے دار نظام اور بادشاہ بن بیٹھے اس طرح

سے دلی اجڑ کر لکھنؤ بنا۔ نواب اودھ شاہ اودھ کہلانے لگے ظاہری شان و شوکت اور کرّوفر کے لحاظ سے لکھنؤ دلّی پر فوقیت لے گیا یہاں ہن برستا اور دولت لُٹتی تھی۔ عیش و عشرت کے ساز و سامان اور تکلفات زندگی کی ہر طرف افراط تھی۔ حکومت پر تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی ریشہ دوانیوں سے قبضہ و اختیار جمالیا تھا۔ سلطنت نام کی سلطنت رہ گئی تھی پر شان و شوکت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ رنگیلے پیا جان عالم یعنی واجد علی شاہ کا دربار شاہی دربار نہیں راجہ اندر کا اکھاڑہ تھا عیش و عشرت کی رنگ رلیوں نے دن عید اور رات شبرات بنا رکھی تھی۔ لکھنؤ پیرس کا مقابلہ کر رہا تھا لیکن تابہ کے سلطنت مٹ گئی۔ واجد علی شاہ نظر بند ہو کر کلکتہ سدھارے۔ لیکن یہاں کے تعلقدار اور بہ کثرت وثیقہ دار یہیں رہے اور انھوں نے عیش و عشرت اور تکلفاتِ زندگی کی پرانی روایتوں کو قائم رکھا۔ رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ شراب و کباب کا شغل جاری تھا عیاشی و تماش بینی شان ریاست تھی۔ عیب نہیں تھی۔ کل کی لونڈیاں اور باندیاں جو منظور نظر ہو گئی بیگمیں بن گئیں۔ ہر رئیس کی ایک داشتہ ہوتی تھی حتیٰ کہ منکوحہ اور مدخولہ کا فرق بھی مٹتا جاتا تھا نیم ابول ہی کی نہیں بلکہ بیگموں کے بھی منظور نظر ہوا کرتے تھے۔ میلے ٹھیلوں کے علاوہ کنکوے بازی کا شوق بھی بڑھا ہوا تھا تکلوں

ہیں سو سو پچاس پچاس کے نوٹوں کے تیجھلے لگا کر میدان لڑے جاتے۔ بٹیر بازی تو عام شغل تھا۔ اب نہ فوج ہی تھی نہ فوج کے سپاہی اور سورما، البتہ نواب صاحب کا صف شکن بٹیر پالی کا میدان سر کیا کرتا تھا۔ چانڈو خانوں میں افیونی پینک کی ترنگ میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے تھے۔ ظرافت، بذلہ سنجی لطیفہ گوئی، فقرے بازی اور ضلع جگت یہ ذہانت کی علامتیں تھیں شاعرے بھی ہوتے تھے۔ اور اُن میں بھی دبیریوں اور انیسیوں کے ہنگامے رہتے تھے۔ نواب زادے جب محل سے نکلتے تو امام ضامن کا روپیہ بازو پر باندھ کر اور خواجہ سرا محلوں میں داخل ہوتے تو قرولی کمر میں کس کر نوابوں اور رئیسوں میں معدودے چند شریف النفس بھی ہوتے تھے جن میں فیاضی رحمدلی پاس وضع اور خاندانی ننگ و ناموس کا لحاظ ہوتا تھا۔ مگر اُن میں بھی نہ دماغی کس بل تھا نہ اخلاقی جرأت اور ہوتا بھی کیسے۔ ہم نے یہ سبق کبھی پڑھا ہی نہیں۔ نہ کسی زوال پذیر تہذیب میں اس کی گنجائش ہوتی ہے پھر بھی اس مٹی شاہی تہذیب کے تکلفات زندگی کی چند نشانیاں جن سے لکھنؤ کی شہرت آج تک قائم ہے باقی رہ گئیں۔ یعنی چاندی کی جامدانی، لکھنؤ کا چکن۔ مٹی کے کھلونے، لکھنؤ کی بالائی۔ زردہ قوام اور بیگماتی گلوریاں، ملیح آبادی سپیدہ، دسہری آم، سیدوؤ کے خربوزے۔ لیلے کی انگلیاں اور مجنوں کی پسلیاں جتنی یہاں کی

نگری یاں۔ لکھنؤ کی تعزیہ داری، سوز خوانی اور مرثیہ گوئی یا پھر
سرود و خانۂ ہمسایہ و حسن رہگذرے کی کشش نے لکھنؤ کے چوک
کا دور دور تک چرچا پھیلایا۔ یہ تھا غدر کے بعد کا لکھنؤ"
مذکورۂ بالا ماحول میں ایک صاحب قلم رند۔ شاعر، مزاج نگار اور فن کار
جس نے ہر قسم کی صحبتیں اٹھائی ہوں فسانۂ آزاد نہ لکھتا تو اور کیا لکھتا۔ جہاں تک
اُن کے لکھنے کے انداز، اسلوب بیان کا تعلق ہے وہ انھیں قدرت کی طرف سے
ملا تھا۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فسانۂ آزاد کی چار جلدیں جو تین
ہزار تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہیں اُس میں سرشار نے اپنی ذہانت، شوخ
طبعی، طنز نگاری، قہقہوں مسکراہٹوں اور بذلہ سنجیوں کے ایسے ایسے پھول بکھیرے
ہیں کہ اردو ادب کو زعفران زار بنا دیا ہے اُن کی تحریر سے خود مصنف کے کردار
رفتار و گفتار، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کا ایک البم تیار کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے
خوجی اور آزاد کے کردار تو تاریخ اردو ادب میں اُس دور کی معاشرت اور تہذیب
کی ایسی ہنس مکھ اور زندہ جاوید ہستیاں ہیں جو ہمیشہ کھلائے ہوئے دلوں کو دعوت
تبسم دیتی رہیں گی۔ اُن کے کردار لکھنؤ کے گلی کوچوں کی نشان دہی کرتے دکھائی
دیتے ہیں۔ اُس دور کے آداب مجلسی اُس زمانے کے کردار، شہر کی آرائش و زیبائش
اُس کی صنعت و حرفت اس کے بازار، اس کی عالی شان عمارتیں۔ بگڑے نوابوں

تیور، بانکوں کا بانکپن، بازاروں میں خلقت کا اژدہام عیش باغ کے میلے۔ سورما۔ سپاہی۔ منچلے۔ پہلوان۔ نلمچنے والیاں۔ محرم۔ جہلم۔ بٹا۔ بنوٹ۔ بٹیر بازی۔ کنکوے بازی۔ افیونی۔ چانڈو باز۔ طوائفیں۔ شریف زادوں کے رہنے سہنے کے انداز نوابین کی نازک مزاجی۔ علماء کا انداز گفتگو۔ مصاحبوں کی لنتراتیاں، ریلوے بابو۔ چنگی کے محرر، ٹھاکر۔ دیہات کے میلے ٹھیلے غرض سوسائٹی کا کوئی فرد ان کی چشم قلم سے بچ کر نہیں جاتا۔ اور پھر ان سبھوں کو طنز و ظرافت کے میدان میں لاکر ہنس ہنس کر جائزہ لینا اور اس انداز میں کہ باوجود طویل ہونے کے طبیعت پر بار نہ ہو یہ سرشار ہی کے قلم کی جادوگری تھی ورنہ تین ہزار تین سو سے زائد صفحات پر کسی ایک داستان کو لکھنا اور اس کے تسلسل کو برقرار رکھنا سرشار کی حاضر دماغی کا ایک معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔ اپنی تحریروں پر نظر ثانی کرنا اپنے حافظہ اور حاضر دماغی اور قوت فیصلہ کی توہین سمجھتے تھے اور غالباً اسی وجہ سے سوائے سیر کہسار اور جام سرشار کے جس کی نظر ثانی ایک تجربہ کار اور صاحب علم بزرگ نے کی ہے بقیہ تمام تصانیف میں کوئی نہ کوئی خامی رہ گئی ہے۔ چونکہ وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے اس لئے وہ اس کی کبھی پرواہ نہ کرتے تھے کہ کون سی بات اخلاقی معیار پر پوری اترتی ہے اور کون سی اخلاقی قدروں پر بار ہوگی۔ اسی لئے پنڈت بشن نرائن در لکھتے ہیں کہ

"سرشار کی اکثر تصانیف اتنی عریاں ہیں کہ وہ لڑکیوں کو نہیں پڑھائی جاسکتی ہیں۔"

ان کی تصانیف اس دور کے اخلاقی معیار پر تو پوری اترتی ہیں جبکہ اخلاق کی

قدریں بدل چکی ہیں اور عریانی بھی ایک آرٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔ البتہ جس دور میں وہ کتابیں لکھی گئیں اس دور میں وہ ضرور قابل اعتراض تھیں۔ اس کے ماسوا سرشار لکھتے وقت ژدلا کے اس قول کو پیش نظر رکھتے کہ "ہم اطفال خورد سال اور دودھ پیتے بچوں کے لئے نہیں لکھتے بلکہ سارے عالم کے لئے، وہی عالم جو گناہوں، بدیوں، جرموں اور دغا و فریب سے پُر ہے۔ نہ تو ہم کسی چیز کی پشت پناہی کرتے ہیں اور نہ ہم کوئی بات بُری نیت سے لکھتے ہیں، ہم صرف انسانیت کا ویسا ہی مرقع پیش کرتے ہیں جیسی وہ ہمیں دکھائی دیتی ہے اور جیسی وہ ہے۔"

یہ واقعہ ہے کہ ایک زوال پذیر سوسائٹی کا نقشہ کھینچتے وقت اگر ان تمام اخلاقیات کو وہ پیش نظر رکھتے تو شاید فسانہ آزاد کی ظرافت، طنز، بذلہ سنجی اور زندہ دلی کا گلا گھٹ کر رہ جاتا اور فسانہ آزاد نذیر احمد کی لکھی ہوئی نصیحتیں ہو کر رہ جاتیں۔ خود سرشار اپنے ابتذال کے سلسلہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ناظرین اولی الابصار، خصوصاً متین بزرگوں کی خدمت میں ملتمس ہیں کہ ان کی تحریروں کو بدتہذیبی پر محمول نہ فرمائیں ہم اپنے ملک کے رسوم و بدعادات خلاف تہذیب کو عمدہ طور سے لکھ بھی نہیں سکتے۔ تاوقتیکہ ہم کل مذموم عادتوں کا خاکہ نہ اڑائیں بس مجبور ہیں۔"

نظیر اکبرآبادی جنھوں نے نظم میں اپنے دور کے تمام رسم و رواج۔ میلے ٹھیلے اور معاشرت میں در آنے والی جملہ بداعمالیوں کے نقشے ہو بہو وہ بے کھینچے

ہیں جس طرح ان کو دیکھا ہے اسی جرم کے مرتکب قرار دیے گئے ہیں مگر ان کی یہی چیز جس پر اعتراض کیا جاتا ہے اُن کی کائنات شاعری کی جان ہے۔ اگر سرشار بھی مشاہدہ کرنے کے بعد سوچتے اور اُن کے بیان کرنے کے لئے الفاظ کی چھان بین کرتے تو نہ تو اُن کے یہاں وہ بے ساختگی آسکتی تھی جو اُن کے مکالموں کی جان ہے اور نہ عبارت میں وہ زور اور وہ آبشار کی سی کیفیت پیدا ہو سکتی تھی۔ جو ان کی تحریروں میں ہم کو ملتا ہے بلکہ ان کی ساری محنت اور کاوش آورد کی نذر ہو جاتی۔ اُن کی انشا پردازی، اُن کے اسلوب بیان اور ان کی مکالمہ طرازی تک اسی وجہ سے اُن کے ماقبل یا مابعد کا کوئی دوسرا ناول نگار نہیں پہنچ سکا کہ انھوں نے جیسا دیکھا ویسا لکھ دیا ورنہ رجب علی سرور اور ان میں فرق ہی کیا رہتا۔ رجب علی سرور کے یہاں ان کے اسلوب میں باوجود گٹھاؤ ہونے کے آداب و اخلاق کے پاس نے آورد پیدا کر دی ہے اور بقول کشن پرشاد کول سرور کے یہاں

"ہم حلوائی کی دوکان سے گذرتے ہیں اور اس کی مٹھاس دیکھتے ہیں تو منہ میں پانی آنے لگتا ہے۔ پان والے کی دوکان پر اس کی گلوریاں طبیعت کو للچاتی ہیں اور لکھنؤ کی بالائی کا تو کیا کہنا یقیناً اس کا کہیں جواب نہیں۔ چکن جامدانی اور ادھی کی دوکانوں کی زیب و زینت۔ جوہریوں کی دوکانوں کی سجاوٹ اور نمائش عطر و تمباکو کی مہک اور خوشبوئیں سب دل خوش کن ہیں۔ چوک اور دوسرے بازاروں اور عالی شان عمارتوں کے منظر بھی نظر

سے گذرتے ہیں لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی شہر خموشاں
سے گذر رہے ہیں۔"

سرورؔ کے یہاں عبارت میں باوجود شگفتگی کی کمی کے ایک گہرائی ہے جو سرشارؔ کے یہاں ہم کو نہیں ملتی۔ سرشارؔ کا مزاح ہنگامی ہے جسے پڑھ کر وقتی طور پر تو منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل جاتا ہے مگر قہقہے کے بعد ہی دل و دماغ سے اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اُن کی عبارت میں جگہ جگہ ہم کو ایک چونکا دینے والی چیز ملتی ہے مثلاً آزاد سرائے میں بیمار پڑے ہیں اور ایک دیہاتی حکیم اُن کو دیکھنے آتا ہے وہ کہتے ہیں۔ "آداب عرض" اور دیہاتی حکیم کہتا ہے "شد باؤ ناہیں دبائے سے نکساں ہوت ہے" یا میاں خوجی نسخہ میں روغنِ گُل کو روغن گل پڑھ کر مٹی کا تیل لے آتے ہیں اور آزاد کو دوا میں ملا کر دیدیتے ہیں۔ اِسی زمرہ میں خوجی فارسی بولنا شروع کر دیتے ہیں جو اپنی جگہ پر آپ اپنا جواب ہے۔ رجب علی سرورؔ کی طرح وہ بھی رعایت لفظی پر زور دیتے ہیں اور سرورؔ کی طرح مقفٰی اور مسجع عبارت لکھتے ہیں مگر وہ اس عبارت میں بھی شوخی اور ظرافت کی بجلیاں گراتے ہیں۔ وہ صبح کی آمد کے لئے سرورؔ کی طرح دماغ پر زور دے کر الفاظ کی تلاش نہیں کرتے بلکہ جگہ جگہ ایک مضحک فقرہ استعمال کر دیتے ہیں۔ خصوصاً "مرغ سحر نے جب گردوں کوں کی صدا بلند کی" سرورؔ کے لئے اتنی پستی پر اترآنا ناممکن تھا۔

مگر فسانہ آزاد میں ان کی ظرافت خوجی اور آزاد کے کرداروں کے گرد کچھ عجیب دلکش اور دل نشین انداز میں ظرافت کے پھول بکھیرتی نظر آتی ہے

اور یہ واقعہ ہے کہ خوجی اور آزاد کے کردار اردو ادب میں ویسے ہی ضرب المثل ہو گئے ہیں جس طرح منشی سجاد حسین کا حاجی بغلول

پنڈت کشن پرشاد کول فسانۂ آزاد کے چند نقائص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پہلا نقص تو فسانہ آزاد کا یہ ہے کہ اس کا پلاٹ ڈھیلا ہے اور کچھ بے ہنگم سا ہے اکثر ایسے سین اور تذکرے شامل کر دیے گئے ہیں جن سے قصے کا کوئی تعلق نہیں پھر ایک ہی سین یا کیفیت کو جزوی تفریق کے ساتھ ایک بار نہیں بلکہ بار بار دہرایا گیا ہے جس سے قصے کا طول و عرض شیطان کی آنت ہو گیا ہے۔ اگر فسانہ آزاد ایک جلد میں شائع ہوتا تو ڈھنگ کی چیز ہوتی دوسرا نقص یہ بھی ہے کہ سرشار کی طرز تحریر انگریزی قسم کے ناول کے لئے مناسب اور موزوں نہیں ہے۔۔۔۔۔۔

کلریسہ اور بشڈا کہنے کو فرنگی خاتونیں ہیں لیکن اُن کے اطوار و آداب وضع قطع خصائل و عادات میں لکھنوی رنگ جھلکتا ہے۔ پولینڈ کی شہزادی کا دربار لکھنؤ کے ارباب نشاط کی محفل معلوم ہوتی ہے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بعض بعض مقامات پر تو انھوں نے حقیقت نگاری کا بھی خون کیا ہے۔ مثلاً پولینڈ کی شہزادی کے پائیں باغ کی روشوں پر دو میل تک کیوڑے کے عرق سے چھڑکاؤ کا ذکر کر دیا ہے۔ باغ میں موتیوں کی جھنکار اور بیلا پھول

کی پکار سنوائی ہے۔ آزاد کی برات میں اونٹوں کی لمبی قطار اور سانڈنی سوار شامل کئے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ سرشار کے سے پایہ کا فن کار ایسی بے تکی باتیں کرے۔"

فسانۂ آزاد پر ابتک جتنے اعتراضات کئے گئے ہیں ان میں کسی معترض نے سرشار کی زندگی اور اُن حالات کی روشنی میں فسانہ پرکھنے کی زحمت نہیں کی ورنہ شاید اس قسم کے اعتراضات ان پر عاید نہ کئے جاتے۔ دراصل سرشار ایک رندِ مشرب انسان تھے جن کو نہ اپنی ان ادبی اور ذہنی صلاحیتوں کا احساس تھا جو قدرت کی طرف سے ان کو بدرجۂ اتم ودیعت ہوئی تھیں اور نہ لکھتے وقت ان کو اس کا وہم وگمان تھا کہ وہ جو کچھ قلم برداشتہ لکھ رہے ہیں وہ ایسے ادبی موتی ہیں جن کو آئندہ نسلیں آنکھوں سے لگائیں گی۔ دراصل اودھ اخبار کے کالموں کو دلچسپ بنانے کے لئے انھوں نے ایک سلسلہ اُن تمام دلچسپ صحبتوں کے لکھنے کا شروع کیا تھا جو انھوں نے اُٹھائی تھیں یا جنھیں دوسروں کو اٹھاتے انھوں نے دیکھا تھا۔ ان صحبتوں کو لکھتے وقت نہ ان کو اس کی پروا تھی کہ قصے میں ربط ہے یا نہیں۔ وہ قلم کے بادشاہ تھے زبان پر انھیں غیر معمولی قدرت تھی طبیعت میں ظرافت اور شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس لئے وہ لکھتے چلے گئے۔ لہذا لکھتے وقت جس طرح ان کے دماغ میں خیال آتے رہے وہ جوں کا توں انھیں لکھتے رہے نہ انھوں نے ان پر نظرِ ثانی کی فکر اور نہ اس کے دیکھنے کی زحمت گوارہ کی کہ وہ اپنے ہیرو یا ہیروئن کو پولینڈ لے گئے ہیں یا اُن کا ہیرو روم کے میدان جنگ کی سیر و سیاحت میں مصروف ہے۔ دراصل فسانۂ آزاد

میں جو کچھ بھی پلاٹ ہے وہ ان کے قلم کا بنایا ہوا ہے نہ کہ ان کے دماغ کا مگر یہ ضرور ہے کہ آزاد اور خوجی کے کردار جو خود بخود بنتے چلے گئے ہیں ایسے کردار ہیں جن کا اردو ادب میں جواب نہیں۔

رتن ناتھ سرشار کے ساتھیوں میں پنڈت تربھون ناتھ ہجر کا شمار اودھ پنچ کے نورتنوں میں کیا جاتا ہے۔ منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"اس اخبار کے سب سے پہلے قدرداں اور خریدار ہجر تھے"

بحیثیت شاعر ان کا شمار اپنے دور کے اساتذہ میں کیا جاتا ہے۔ نثر میں بھی ان کے جو مزاحیہ مضامین اودھ پنچ میں شائع ہوتے ان کو لوگ بڑے شوق سے پڑھتے۔ اور فطرتاً ظریف تھے اسی لئے ان کے مضامین میں شوخی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی۔ "نشہ کی ترنگ" کے نام سے ان کے مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ہائے ہائے لال لال سیخچے کولوں کو اس ترکیب سے جماتے ہیں کہ تحریر اقلیدس کی جبن شکل سے چاہیے بھڑا لیجئے اگر سر مو فرق ہو تو ہاتھ قلم کر ڈالیئے ایک حقہ ہی نہیں چانڈو کا قوام وہ بڑھیا تیار کرتے ہیں کہ بس اور کیا کہوں ہاتھ چوم لے۔ اور بھئی ان کی سی محنت کوئی کر تو لے۔ جناب سید الشہدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ افیون کو بانات کے ٹکڑے میں کم سے کم دو سو مرتبہ

تو مضطر کرتے ہیں اس وقت اس کی رنگت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔"
ان کے مضمون بحرم الحرام کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"زیارتوں میں قند مکرر کی حلاوت ۔۔ روحانی اور جسمانی دونوں
لذتیں۔۔۔۔۔ بی حیدرجان کے سوز نے کیا کیا چھوٹیں لی
ہیں کہ واہ جی واہ۔ وہ رکھب گندھار لڑتی ہوئی ٹیپ کی تانیں
تھیں کہ سبحان اللہ سبحان اللہ۔"

جوالا پرشاد برق کا شمار نہ صرف اودھ پنچ کے مشہور شاعروں میں تھا بلکہ
سنجیدہ شاعری میں وہ اُستادی کا درجہ رکھتے تھے نثر نگار کی حیثیت سے ان کی
ظرافت کا نمونہ اودھ پنچ کے ایک مضمون سے ملاحظہ ہو۔

"اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان
طوق زریں ہمہ در گردن خرمی بینم

لوسارا طلسم ٹوٹ گیا۔ ایک چھلاوا تھا۔ جو چشم زدن میں نظروں
سے اوجھل ہوگیا۔ یکایک بلائے آسمان پھٹ پڑی۔ ایک اینٹ
کی خاطر مسجد ڈھائی پیارا مل ہاتھ سے بے ہاتھ ہوگیا۔ اس کی
پیدائش پر کیا کیا ناز تھے۔ اس کے والدین نے اُسے کیسے کیسے
لاڈ سے پالا۔ بچپن میں کیسی کیسی داشت کی۔ رات کو رات دن
کو دن نہ سمجھا مگر دشمنوں کی نظر کھا گئی۔ سوتیلی ماں کے پالے پڑا
ماں باپ ہاتھ مل کے رہ گئے ہماری امیدوں کا خون ہوگیا۔"

احمد علی شوق بھی اودھ پنچ کے مشہور لکھنے والوں میں ہیں ان کی زبان شستہ اور پاکیزہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُس میں شوخی اور ظرافت کے جگہ جگہ پھول بوٹے ملتے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"اللہ اللہ آپ ہیں اودھ پنچ کے نامہ نگار چشم بددور آپ سے بڑھ کے اس معمے کو حل کرنے والا کون۔ علما و زاہد خشک، صوفی، جاہل۔ پنڈت بر اُلٹے نام شعرا بے اعتبار۔ ایک آپ کی ذات ہے۔ باقی اللہ اللہ۔ خیر سلّا۔ بندہ پرور سُنئے۔ اگلے زمانے والے بسم اللہ کے گنبد کے رہنے والے سیدھے سادے آدمی تھے جو جی میں آیا کہ گزرے۔ جو سنا مان لیا۔ نہ حجت نہ دلیل یہ عقل و حواس زمانے والوں کو اللہ نے دی ہے پہلے اس کی چیا نوں بھی نہ تھی نہ یہ طریقہ تعلیم۔ نہ یہ تہذیب نہ یہ اترنج نہ یہ ایجادیں۔ نہ یہ رفتار نہ گفتار۔ نہ یہ لباس۔ نہ قیاس اور باتیں تو درکنار تو کیا ہی عشق کے معاملہ میں دیکھئے متقدمین نے کیسی منہ کی کھائی۔ ہزار عقل کے گھوڑے سرپٹ دوڑائے لیکن منزل مقصود کو نہ پہنچے صرف دو قسمیں قائم کیں ایک مجازی ایک حقیقی بھلا عشق بازی۔ عشق خانگی۔ عشق ازدواجی۔ ان کا کبھی کہیں ذکر ہے۔ خاک نہیں۔ اے آپ ہی انصاف فرمائیے لمبی چوڑی عقل والے ان کی تحقیق پر کیوں نہ رکھیں مجازی اور حقیقی کی تفصیل۔"

اودھ پنچ منشی سجاد حسین کے مرنے سے دو سال قبل ہی بند ہو گیا تھا اور اس کی وجہ تمام تر مالی مشکلات اور ایڈیٹر کی علالت تھی اس سلسلہ میں پنڈت کشن پرشاد کول لکھتے ہیں۔

"دس بارہ سال بعد اودھ پنچ کے شباب کی وہ پہر ڈھلنا شروع ہوئی اور اس کے نامہ نگاروں کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگا۔ ستم ظریف اور ہجر نے مرنے سے پہلے ہی لکھنا کم کر دیا تھا جوانی کی بے فکری دوسرے نامہ نگاروں کا ساتھ عرصہ تک نہ دے سکی اور رفتہ رفتہ اودھ پنچ کے صفحے قدیم طرز کے پرانے مضامین سے خالی نظر آنے لگے جو کچھ بہی سہی آب و تاب باقی تھی منشی سجاد حسین کی علالت نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس مٹی شائی حالت میں بھی اودھ پنچ کا نام دکتا تھا اور جب کوئی مضمون اُس کے ایڈیٹر کے قلم سے نکل جاتا تھا اس کی دھوم ہو جاتی تھی علاوہ اس کے کبھی کبھی منشی احمد علی شوق نواب سید محمد آزاد اور حضرت اکبر الہ آبادی کی نظم و نثر کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے مگر اودھ پنچ کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی منشی سجاد حسین کی حمیت اور غیرت نے گوارہ نہ کیا کہ جب تک ان کے دم میں دم ہے وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے بند ہوتا ہوا دیکھیں مگر واقف کار جانتے ہیں کہ آخر دو بارہ سال میں اودھ پنچ میں سوائے خسارہ کے نفع کی آمد نہ تھی...... مگر یہ حالت کب تک رہتی آخر کار مرنے سے

دو سال پیشتر شکستہ دل ایڈیٹر کو اودھ پنچ کا جنازہ اپنے مردہ ہاتھوں سے اٹھانا پڑا یہ وہ زمانہ تھا جب ضعیف جسم میں خون کے دس بیس قطرے ضرور باقی تھے مگر گرہ میں ایک پیسہ نہ تھا اودھ پنچ چلتا تو کس طرح چلتا.......... غرض چھتیس سال زبان اور قلم کی خدمت کر کے اودھ پنچ نے دنیا کو خیر باد کہا۔"

اودھ پنچ کے بند ہونے اور منشی سجاد حسین کے مرنے کے بعد حکیم ممتاز حسین عثمانی نے اودھ پنچ کو پھر سے زندہ کیا یہ گویا اودھ پنچ کا دوسرا دور تھا۔ حکیم ممتاز حسین عثمانی عربی فارسی کے منتہی ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی، سنسکرت اور برج بھاشہ سے بھی بخوبی واقف تھے اور شعر و ادب پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی ان میں کم و بیش وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جس کی اودھ پنچ جیسے پرچہ کو زندہ رکھنے اور چلانے کی ضرورت تھی وہ بھی منشی سجاد حسین مرحوم کی طرح فطرتاً ظریف تھے چنانچہ انھوں نے ۱۹۳۳ء تک اودھ پنچ کو باوجود مالی مشکلات کے بڑی آن بان سے نکالا۔ اگرچہ پچھلے دور کے لکھنے والے ان کو نہیں ملے تاہم انھوں نے اپنے زور قلم سے اس کے معیار کو گرنے نہ دیا اور خاک نشینوں کی یادگاروں میں سے اپنے مطلب کے نامہ نگار اور مضمون نگار پیدا کئے چنانچہ جس ڈھنگ کے سیاسی اور طنزیہ خطوط پچھلے اودھ پنچ کے ایڈیٹر نے انگریز دل اور والیان ریاست کو لکھ کر ان کا طنزیہ اور ظریفانہ انداز میں مذاق اڑایا تھا ویسے ہی خطوط انھوں نے منتق آرا بیگم کی طرف سے مسٹر چرچل، لارڈ ریڈنگ۔ لارڈ

سیکڈانلڈ اور دوسرے انگریزوں کے نام لکھ لکھ کر برطانوی سیاست کا لطیف انداز میں مذاق اڑایا۔ منشی سجاد حسین کی لوکل کی جگہ انھوں نے "تولا نا پنچ کی نوٹ بک" اور "پنچ مل خدا اخدا مل پنچ" کے عنوانات قائم کئے اور اس دور میں مٹے مٹائے لکھنؤ میں جو ادبا، اور شعراء تھے ان کے کلام پر نہایت دلچسپ بحثیں اودھ پنچ کے صفحات میں ایک یادگار حیثیت رکھتی ہیں۔ منشی سجاد حسین والے اودھ پنچ کی "لوکل" پڑھنے کے بعد اس دوسرے دور کا ایک نمونہ" اودھ پنچ کی نوٹ بک" سے ملاحظہ ہو۔

"مثنوی دہر آشوب" کا بقیہ اس نمبر میں بھی درج نہ ہو سکا ہم چاہتے تھے کہ درج کریں مگر پنچ میں بول اُٹھے میاں رمزے میکڈانلڈ مائیکل اوڈائر اور مسٹر چرچل المعروف بہ چل پول ان سب دل لگی بازوں کا جواب کیونکر نہ دیا جاتا اس کے ہوتے پرانا دکھڑا یاد ہونے سے رہا۔"

اسی عنوان کے تحت دوسری جگہ سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

"پالیسی "پالیسیدن" کا حاصل مصدر اور پالیسیدن خود بہ ترکیب مقلوب اضافی "لیسیدن پا" ہے جس کے معنی ہیں "پاؤں چاٹنا" ہم انگریزی نہیں جانتے اسی وجہ سے جب کوئی نیا بگڑا مختص ہندوستانی پالیسی پالیسی رٹتا ہے تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ "پالیسی" کی خواہش رکھتا ہے۔"

اسی طرح اس دوسرے دور کے اودھ پنچ میں اہم خبروں پر دلچسپ نوٹ چھ

تھے جن میں سے مشتے از خروارے دو نمونے ملاحظہ ہوں۔

"مرغ حکومت کا آشیانہ"

"چڑیا خنگن تک انڈوں پہ ہوتی ہیں تو چونچ میں تنکے دبا کے جھونجھ لگاتی ہیں۔ حکومت ہند بھلا آشیانہ سازی سے غافل کیوں رہتی اُسے تو یہاں دواماً رہنا اور تتخذون مصانع لعلکم تخلدون (شاید ہمیشہ رہو گے اسی لیے بڑی بڑی عمارتیں بناتے ہو) کی ضد پوری کرنا ہے۔ کئی کروڑ زرِ سرخ نئے آشیانے کے تنکوں پر خزانۂ ہند سے صرف ہو چکا اور کئی کروڑ اور ابھی صرف ہو گا۔ بیس اکیس برس سے یہ جھونجھ بن رہا ہے سنتے ہیں کہ اسی مہینے میں یہ آشیانہ مرغانِ حکومت کے واسطے دھوم دھام کے ساتھ کھولا جائے گا نو آبادیوں سے بھی مہمان آئیں گے اور چکھوتیاں کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت انڈا سیتی ہے یا نہیں اور انڈا دے گی تو بچے والا یا خاگی"

ان خبروں کے علاوہ بعض ٹکڑے اور بھی دلچسپ ہوتے تھے مثلاً "ریش طویل" کے عنوان سے ایک نوٹ ملاحظہ ہو۔

"صید از حرم کشد خمِ ریشِ بلند تو
فریاد از قضا یدِ مشکیں کمند تو

بزرگی کی دلیل۔ وقار کی کفیل۔ رعب کا آلہ۔ شانداری کی خالہ۔ چہرۂ تاشانما کی جھالر قائم مقام نکٹائی و کالر۔ دُم یا چھتر۔ گھنگے کا ستر۔ دامِ بے ایمانی پھندہ مگس رانی۔ جاروبِ صفائے سینہ۔

گردپوش دل آئینہ۔ گندہ آپ تھکاری۔ شغلۂ بیکاری۔ حریف کا آلۂ ظفر۔ سفر میں تو نیا سے مفر۔ بق بعوض کا ذکر بحالت تلافی شتین واد خام متجانسین شریلا اکتارا۔ بدمزاج بی گھر کے غصہ کا اُتارا۔ بلکہ فرمانبرداری کا اجارا۔ قبل از مرگ پنبۂ دہن۔ خس پوش چاہ ذقن۔ بچوں کا کھیل۔ مکڑیوں کا جیل بے داموں کی مرھیلی۔ دن دہاڑے لوٹ لینے کا کمل۔ غرضکہ لمبی داڑھی بھی عجیب کام کی چیز ہے۔ اہل مجلس کی توجہ و التفات کو تو اس طرح کھینچ لیتی ہے جیسے جاذب کا غذ سیاہی کو مقناطیس لوہے کو۔ کہربا گھانس کی پتی کو اسپنج پانی کو

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی
کہ یک لنگی طالب علم باشد ریش طولانی"

"راقم ریشاٹل"

(اودھ پنچ ۱۳۱ھ)

عثمانی صاحب کے انتقال کے بعد ایک سال تک ان کے صاحبزادے سید ظہیر حیدر نے اودھ پنچ کو جوں توں زندہ رکھا مگر ۱۳۲ھ میں عین جوانی میں دق کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر ان کی شمع حیات بھی گل ہوگئی اور اس کے بعد اس طنز و ظرافت کا خاتمہ ہو گیا جس کی ابتدا ۱۸۷۷ء میں منشی سجاد حسین مرحوم نے کی تھی۔

اودھ پنچ کا دوسرا دور ختم ہونے سے تین سال پہلے ستمبر ۱۳۲ھ میں مسٹر نسیم انہونوی نے سرپنچ کے نام سے ایک پرچہ شوکت تھانوی کی ادارت میں نکالا

سرپنچ کو چونکہ عظیم بیگ چغتائی۔ ناکارہ حیدرآبادی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ جیسے مشہور مزاح نگار نثر میں اور نظم میں شہباز بلند پرواز۔ احمق پھپھوندوی۔ سید بہادر بزم وغیرہ لکھنے والے مل گئے اس لئے اُسے بڑا عروج حاصل ہوا۔ مگر سرپنچ اور اودھ پنچ کے مزاج میں قدیم و جدید کا فرق تھا۔ رعایت لفظی اور ضلع جگت کا دور اودھ پنچ کے دور اول تک جاری رہا تھا حکیم ممتاز حسین کے دور میں اودھ پنچ کی ظرافت میں پھبتیوں اور فقرے بازیوں پر متانت سنجیدگی اور علمیت زیادہ غالب رہی سرپنچ کی ظرافت اردو ادب میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے نظم و نثر میں نئے لکھنے والے پیدا کئے۔ ترقی پسند تحریک میں جو بے راہ روی پیدا ہونا شروع ہوگئی تھی جس کی داغ بیل انگارہ سے پڑی تھی اُس طرف سرپنچ نے ترقی پسند مصنفین کو توجہ دلائی اور اس پر کڑی تنقید کی۔ اردو ادب میں پیروڈیز کا سلسلہ سرپنچ ہی نے شروع کیا۔ راقم الحروف کی پیروڈیز سب سے پہلے سرپنچ ہی میں شائع ہوئیں۔ سرپنچ کی طرح کے دو ایک پرچے جو پنچ وغیرہ کلکتہ اور لاہور سے شائع ہوئے۔ اور ان پرچوں نے بھی اردو ادب میں ظرافت نگار پیدا کئے۔ مجید لاہوری نے لاہور سے نمکدان شائع کیا جو ہنوز جاری ہے۔ سرپنچ اب پندرہ روزہ نکلتا ہے۔ اودھ پنچ کے دور اول اور دوم میں اور سرپنچ میں جو ساقی نامے شائع ہوئے ہیں اُن سے طنز و ظرافت میں جو بتدریج تبدیلی ہوئی ہے اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال اودھ پنچ کے بعد کے لکھنے والوں کے بعد وہ طنز نگار ہیں جن میں

سب سے پہلے فرحت اللہ بیگ آتے ہیں۔

فرحت اللہ بیگ ملا رموزی، پطرس اور رشید احمد صدیقی کی طرح اُن طنز نگاروں میں ہیں جن کے اس لہجے نے اور جس نے ان کی تحریروں میں انفرادیت پیدا کر دی ہے۔ فرحت کے یہاں آپ کو قہقہے اور تمسخر قسم کی کوئی چیز نہیں ملے۔ ان کا قلم طنز کی راہوں کو سنجیدگی اور متانت کی روشنی میں طے کرتا ہے۔ اگر مرزا فرحت اللہ بیگ کو اُن سے پہلے کے مزاح نگاروں میں لاکر بٹھا دیا جائے تو قہقہے اور پھبتیاں کسنے والوں کے جھرمٹ میں ایک ایسا شخص نظر آئے گا جو بار بار مسکرا کر اُن قہقہا بازوں کی طرف دیکھتا ہے اور اپنی نظریں نیچی کر لیتا ہے۔ ان کی سنجیدگی میں مسکراہٹ اور ان کی مسکراہٹ میں معنویت کے خزانے پوشیدہ تھے ان کی تحریروں سے ان کے مشاہدے کی وسعت اور گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنی تحریر میں شستہ اور شائستہ الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ان کی ظرافت میں بھی ایک مقصد ہوتا ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب خود اپنی مضمون نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"مضامین لکھنے میں میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایک تو وہ پرانے واقعات تحریر میں آجائیں جو بزرگوں کی زبانی مجھ تک پہنچے ہیں، تاکہ کچھ دن بعد غیبت و نابود نہ ہو جائیں۔ دوسرے یہ کہ ان اہل قلم کے واقعات قلم بند ہو جائیں جنھوں نے زبان اُردو کی اصلاح میں اپنی عمریں صرف کر دیں۔ تیسرے اُردو زبان میں خوش مذاقی

کے ذریعہ اصلاح معاشرت کا پرچار کیا جائے۔"
یہ واقعہ ہے کہ مرزا صاحب نے اپنے بیشتر مضامین میں اس انداز میں سماجی خرابیوں کو بے نقاب کیا ہے کہ ان کی طرف جو بھی نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہے۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔ بقول ایک نقاد کے "ان کی حالت اس کارٹونسٹ کی سی ہے جو اپنے کارٹون کے ذریعہ گھڑی بھر کے لئے لوگوں کو ہنساتا ہے لیکن اس میں چھپے ہوئے طنز، دیکھنے والے کو حالات کا جائزہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔" وہ ہر چیز کو ظریفانہ رنگ میں پرکھتے تھے اور اسے ایسے دلچسپ اور لطیف انداز میں بیان کرتے ہیں کہ سننے والے کے دل میں ایک خاص خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ "میری بیوی" کے عنوان سے آپ کے مضمون کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"اجی۔ بی اماں! کیا ہماری شادی ٹھہر گئی" والدہ صاحبہ نے مسکرا کر کہا۔ "کیا اب بھی کچھ شک ہے۔ یہ چیرا چیرا کر باتیں کرنے سے فائدہ۔ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔ میں نے کہا یہ بتائیے کہ ہماری دلھن کچھ پڑھی لکھی بھی ہیں" جواب ملا "ہاں"۔ ہم نے کہا "کچھ سلیقہ مند بھی ہیں" کہا "ہاں" پھر پوچھا کہ "شکل و صورت کیسی ہے"۔ بی اماں بولیں "ہاں۔ آدمی کا بچہ ہے" یہ جواب کچھ عجیب گول مول تھا۔ ہم آدمی تھے اگر آدمی کے بچے یا آدمی کی بچی سے شادی نہ ہوتی تو کیا کسی جانور کے بچے یا بچی سے ہوتی۔ ہم نے ذرا بگڑ کر کہا کہ "دیکھئے اماں جان! صاف صاف بتائیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے عورت سے

نفرت ہے۔ اگر بیوی صاحبہ کی صورت ذرا خراب ہوئی تو مجھ سے
نبھنی مشکل ہے۔" یہ سُن کر والدہ صاحبہ تو بگڑ ہی گئیں کہنے لگیں
کہ "او ہو اب آپ بھی اس قابل ہو گئے ہیں کہ میں بہو لیکر آؤں
اور آپ پسند نہ کریں۔ چل اے۔ لڑکے چل۔ مجھے تیری یہ باتیں
پسند نہیں۔ اب میں شادی کر رہی ہوں یا تو کر رہا ہے۔ تیرے لئے
جنت سے کوئی حور آنے سے تو رہی۔ شریف لوگ صورت شکل
تھوڑی ہی دیکھتے ہیں۔ ہڈی دیکھتے ہیں۔ اب کے تو نے مجھ سے
ایسی باتیں کیں تو اچھا نہ ہوگا۔" لیجئے ساری محنت اکارت گئی۔
جب ماں ہی کو ہمارا خیال نہیں تو اور کسی کو کیا ہوگا۔ خیر جی کچھ
ہرج نہیں۔ اماں ہماری بیوی کی مالک ہیں۔ تو ہم اپنے مالک
ہیں۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ ہے۔ کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائیگی۔
خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست۔"

اسی مضمون کو ایک لطیف طنز پر اس طرح ختم کرتے ہیں۔

"اکیسویں دن میرا بخار اترا۔ اس کے دو ایک روز بعد میں نے کہا
"بیگم جینا اور مرنا تو خدا کے اختیار میں ہے لیکن خدا کی قسم اس
وقت تو میری زندگی کا باعث تم ہوتی ہو۔ جب اپنی بے دکھو نیاں
یاد کرتا ہوں تو مارے شرم کے آنکھ نہیں ملائی جاتی آج تک تم
میری تھیں اور آج سے میں تمھارا ہوں۔" کہنے لگیں "یہ آپ نے
کیا کہا۔ میں تو شادی کے دن سے آپ کو اپنا سمجھتی ہوں۔ یوں کہئے

کہ آج سے میں تمھیں اپنا سمجھنے لگا ہوں۔ لیجئے اب جواب دیجئے ظالم جو جواب دیتی ہے لاجواب کردیتی ہے۔ خیر، ہم اچھے ہو گئے اللہ کے فضل سے طاقت بھی آگئی۔ باہر بھی آنے جانے لگے۔ اب تو یہ ہمارا کام ہے کہ گاندھی جی ہندوستان میں پرچار کرتے پھرتے ہیں کہ جب تک نوجوانان ہند ہمت سے کام نہ لیں گے اس وقت تک سوراج نہیں مل سکتا۔ اور ہم یہ تبلیغ کر رہے ہیں کہ جب تک بدصورت عورت سے شادی نہ کی جائے اس وقت تک کسی کو گھر میں آرام نہیں مل سکتا اور بدصورتی کے ساتھ اگر داڑھی مونچھوں والی بیوی مل گئی تو پھر کیا کہنا۔ سبحان اللہ مزا ہی مزا ہے۔"

فرحت اللہ بیگ کی ظرافت ایک مقصدی ظرافت ہے اُن کی مزاحیہ تحریروں میں ان اقدار کی جھلک صاف نظر آتی ہے جن سے ان کو محبت ہے۔ شوخ خاکہ نگاری ان کا حصہ ہے اور سوانح نگاری میں اُن کی تحریروں میں اسٹیجی کی جھلک نظر آتی ہے ان کی ظرافت کی بنیاد معاشرت اور واقعات پر ہوتی ہے چنانچہ "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی" میں وہ اپنی طالب علمی اور استاد کی خدمت کا جو نقشہ پیش کرتے ہیں اُس میں طنز و ظرافت اور مزاح سب ہی چیزیں ہم کو ملتی ہیں اُن کے اس تذکرے میں بڑا خلوص صداقت اور بے باکی ہے۔ اس میں عقیدت اور شوخی کا ایک ایسا امتزاج ہے جو کسی دوسرے طنز نگار کے یہاں مشکل سے ملے گا۔ اس میں انھوں نے ان کی بھلائیوں، برائیوں

کا نقشہ نیم سنجیدہ اور نیم مزاحیہ انداز میں بڑے دلکش انداز میں لکھا ہے اور اپنی سیرت نگاری اور انشاپردازی کا ایک فن کارانہ نمونہ پیش کیا ہے۔ ان کے اسلوب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نذیر احمد کی ظرافت کو اپنے ظریفانہ لہجے میں لکھا ہے جس سے نذیر احمد اور ان کے قلم کی شوخیاں دونوں کی ظرافت میں فرق بتاتی چلتی ہیں۔ وہ کمزوریوں کا ذکر بھی بڑے محبت بھرے انداز میں کرتے ہیں۔ اسی طرح "سنہ ۱۲۶۱ھ میں دلی کا یادگار مشاعرہ" میں انھوں نے اُس دور کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے۔ انھوں نے ساحرانہ فن کاری کے ساتھ دہلی کے آخری دور کے سربرآوردہ شعرا غالب ذوق، مومن، شیفتہ، آزردہ، صہبائی اور داغ کی چلتی پھرتی تصویریں سامنے کھڑی کر دی ہیں۔

اسی طرح "پھول والوں کی سیر" بھی ان کا ایک ادبی کارنامہ ہے۔ وہ قلعۂ معلّیٰ، تاج گنج قطب صاحب اور دہلی کی دوسری سیرگاہوں کا ذکر بڑی حسرت سے کرتے ہیں۔ وہ اپنے موضوع اور ماحول کے ایک ایک رُخ پر بڑے اعتماد سے روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اظہارِ واقعہ کی ضمن میں اور اُس میں لفظی صنعت کا استعمال بس اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ کھانے میں نمک اس لئے تصنع یا آورد کا احساس نہیں پیدا ہوتا۔ انھیں جزئیات نگاری پر ایک قدرت کاملہ حاصل ہے۔ "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی" سے دو نمونے ملاحظہ ہوں۔

"سود لینا وہ جائز سمجھتے تھے اگر کوئی حجت کرتا تو مارے تاویلوں کے اس کا ناطقہ بند کر دیتے ایک تو حافظ، دوسرے عالم، تیسرے

لستان بھلا اُن سے کون ورآسکتا تھا اور تو اور خود مجھ سے سود لینے
کو تیار ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر متفرق قرضے تھے۔ خیال آیا۔
کہ ایک جگہ سے قرض لے کر سب کو ادا کر دیا جائے۔ قرض کس سے
لیا جائے یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا پھر پھر کر مولوی صاحب ہی پر نظر جاتی
تھی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں نے مولوی صاحب سے سوال
کر ہی دیا۔ کہنے لگے کتنا روپیہ چاہیئے۔ میں نے کہا دس ہزار بولے
ضمانت میں نے کہا چوڑی والوں والا مکان پوچھا کتنی مالیت کا
ہے۔ میں نے کہا کوئی ساٹھ ستر ہزار روپے کا فرمایا کل قبالہ لیتے آنا
میں نے دل میں سوچا چلو چھٹی ہوئی بڑی جلدی معاملہ پٹ گیا۔ دوسرے
دن قبالہ لیکر پہنچا۔ پڑھ کر کہا ٹھیک ہے مگر بیٹا سود کیا دو گے۔ میں نے
کہا مولوی صاحب آپ اور سود کہنے لگے کیوں اس میں کیا ہرج ہے
میں نہ دوں گا۔ تو کسی ساہوکار سے لوگے۔ اُس کو خوشی سے سود دو گے۔
ارے میاں مجھے کچھ فائدہ پہنچاؤ گے تو دین و دنیا دونوں میں بھلا
ہو گا آخر میں تمہارا اُستاد ہوں یا نہیں۔ میرا بھی کچھ حق تم پر ہے
یا نہیں۔ جاؤ شاباش بیٹا۔ اپنے چچا سے جاکر تصفیہ کر آؤ۔ کل ہی
چک بنگال بنک کے نام لکھ دیتا ہوں میں نے کہا مولوی صاحب
سب لوگ کیا کہیں گے کہ مولوی ہو کر سود لیتے ہیں اور لیتے ہیں کس سے
کہ اپنے شاگردوں سے کہنے لگے اس کی پروا نہ کرو جب مجھ پر
کفر کا فتویٰ لگا چکا ہے تو اب مجھے ڈر ہی کیا رہا جاؤ تمہارے ساتھ

یہ رعایت کرتا ہوں کہ اوروں سے روپیہ سیکڑہ لیتا ہوں تم سے چودہ آنے لوں گا؛"

مولانا نذیر احمد کی خوش خوراکی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں،

"خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے ناشتے میں دو نیم برشت انڈے ضرور ہوتے تھے میوہ کا بڑا شوق تھا ناشتہ اور کھانے کے ساتھ میوہ ہونا لازم تھا۔ بڑھاتے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے مگر مجھکو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک طعام نہ ہوسکا خیر ان نیچاڑوں کی جماعت کی تو کیا اصلا کرتے ان کے لئے تو مولوی صاحب کا ناشتہ اونٹ کے منہ میں زیرہ ہوجاتا البتہ ہم دونوں کی صلا نہ کرنا غضب تھا کہتے بھی جاتے تھے بھئی کیا نرے کا خربوزہ ہے میاں کیا مزہ کا آم ہے۔ مگر بندہ خدا نے کبھی یہ نہ کہا بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے میں نے تو یہ تہیہ کر لیا تھا (میاں دانی اب انکار کریں تو کریں لیکن ان کا کبھی بھی ارادہ تھا) کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے منہ بھی شریک ہونے کو کہیں تو ہم سچ مچ شریک ہوجائیں۔

اردو زبان اگرچہ دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں بہت نو عمر ہے۔ اُس میں طنز و مزاح کا سرمایہ بھی بہت کم ہے اور اس سرمایہ میں بھی وہ چمک دمک اور وہ پختگی نہیں ہے جو دنیا کی دوسری بڑی وسیع زبانوں میں ہے لیکن اردو ادب میں

مولانا ابوالکلام آزاد کی طرز نگارش نے اردو ادب کو وہ تمام خصوصیات عطا کردیں جو دنیا کی بڑی اور وسیع زبانوں کے انشا پردازوں کے مقابلہ میں پورے اعتماد کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان کی تحریر میں ایک ایسی انفرادیت ہے جو اُردو کے کسی طرز نگار اور کسی انشا پرداز کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ جس طرح وہ اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں ایک جداگانہ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں اُسی طرح ان کی تحریر بھی تمام ادیبوں سے جدا اور الگ تھلگ ہے۔ ان کے سوچنے کے انداز، ان کی زبان ان کے لہجے اور ان کی عبارت میں الفاظ کی نشست و برخاست سب میں ایک انوکھا پن ہے۔ ان کی تحریر کی روانی اور اس کا بہاؤ بھی دوسرے لکھنے والوں سے مختلف ہے ان کی عبارت میں شوخی، طنز اور ظرافت بھی اس پائے کی ہے جو اُردو کے کسی بڑے سے بڑے ادیب کے حصہ میں نہیں آئی۔ جس طرح ان کا ایک مخصوص انداز ہے اُسی طرح اُن کے مخصوص موضوعات بھی ہیں جن میں وہ اپنے مخصوص انداز کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ہر موضوع اُن کے انداز تحریر کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ جس طرح ان کی خطابت ان کے بات کرنے کا لب ولہجہ اور تقریر کرنے کا انداز دوسرے مقررین سے ممتاز اور بلند درجہ رکھتا ہے اسی طرح ان کی تحریر بھی ایک مخصوص خطیبانہ شان رکھتی ہے۔ ان کی تحریر میں ایک جوش ایک ولولہ اور ایک اُمنگ ہے جو پڑھنے والے کے دل و دماغ میں ایک تحریک پیدا کر دیتی ہے ان کی انشا میں جو سیاسی طنز ہوتا ہے وہ ان کی خطابت سے مل کر دو آتشہ بن جاتا ہے۔ ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر جملہ اور ہر لفظ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں پوری ہیجان انگیزی پیدا کرنے لگتا ہے۔ ان کے طرز میں اخلاص سچائی اور صداقت

کی بجلیاں کوندتی ہیں۔ ان کا طنز ہنگامی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اثرات دوامی ہوتے ہیں۔ عام طور پر ہنگامی حالات میں طنز کے حربے کو استعمال کیا جاتا ہے مگر مولانا کا طنز دوامی اثرات کا حامل ہوتا اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مولانا کے مخصوص موضوعات ان کا طنز سیاسی اور سماجی دونوں قسم کی اصلاحات کا حامل ہوتا ہے مولانا جو کچھ لکھتے ہیں پہلے اسے خود محسوس کرتے ہیں اور جب پوری طور پر اس جذبے کی اپنے دل میں پرورش کر لیتے ہیں تب اس کی اپنے الفاظ اور اپنے قلم کی تلوار سے کانٹ چھانٹ کرتے ہیں۔ ان کی انشا پردازی الفاظ کا گھروندا نہیں۔ وہ ایک سیلاب ایک طوفانِ بلاخیز کا دھارا اور ایک شمشیر آبدار ہے جس پر سنجیدگی اور متانت کا صیقل بھی ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کی مثال ایک پہلوان سے دی ہے وہ لکھتے ہیں کہ

"ابوالکلام کی مثال اس پہلوان کی ہے جو وسط میدانِ جنگ میں "مبارز طلب" ہو اور دوسروں کا نہیں بلکہ اپنے رجز سے خود اپنا دل بڑھا رہا ہو۔"

ابوالکلام آزاد کا طنز سیاست میں رچا بسا ہوتا ہے ان کا ہدف انگریزی سامراج اور مغرب پرستی ہے۔ ان کی حیثیت ایک ایسے باپ کی ہے جو اپنی اولاد کی اصلاح کی طرف سے بے نیاز ہونے کے باوجود اصلاحی کلمات زبان سے نکالتا رہتا ہے۔ ان کے طنز کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"سب سے پہلے یہ ہوا کہ ملک میں کام کرنے والی اصلی جماعت یعنی ہندوؤں

سے مسلمان علیحدہ ہو گئے اور اس طرح عرصہ تک کے لئے ملکی مطالبات کی فتحیابی سے گورنمنٹ مطمئن ہو گئی۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی ضرورت تھی کہ ان کو بے کار نہیں رہنا چاہیئے ورنہ بیکاری سے اکتا کر راستہ کی تلاش میں ضرور نکلیں گے۔ کوئی مشغلہ ایسا ہونا چاہیئے جو عرصہ تک ان کو اپنے میں الجھائے رکھے اور اصلی کاموں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ دے۔ تعلیم کو مسلمان پہلے ہی سے بھجے بیٹھے تھے (اور یہ خیال فی نفسہ غلط نہ تھا) اس لئے اسی اعلیٰ تعلیم کے بال و پر کو پھیلا کر ایک ایسا الف لیلہ کا عجیب الخلقت پرندہ بنا دیا جو اپنے پروں کو کھول دے تو سورج کی زمین کی طرف جھانکنے کے لئے کوئی سوراخ نہ ملے۔ مسلمانوں نے اس عجیب غریب مرکب کو براق سمجھا اور یقین کر لیا کہ ہمارے سفر معراج کے لئے آسمانی سواری اتری ہے۔ چالیس برس گذر گئے اب تک اس مرکب کی لگام ویسی ہی ڈھیلی ہے جیسے پہلے دن تھی اور منزل لامکانی کا پتہ نہیں قوم کی وہ قوتیں جو یقیناً زمانے کی قدرتی اثرات سے متاثر ہو کر ملکی تحریکوں میں صرف ہوتیں تمامتر صرف ایک اعلیٰ تعلیم کے شور و واویلا کے پیچھے مٹا دی گئیں اور جبکہ ہم سے ایک دیوار کے فاصلے پر ملک کی جائز آزادی، ملکی حقوق کے مطالبات۔ اعلیٰ قوانین کی ترمیم و تنسیخ ملکی نظم و نسق کے مباحث اور افکار کی سرگرمیوں میں ہمسایوں کے جذبات و امیال صرف ہو رہے تھے

ہم اپنی کانفرنسوں اپنے بڑے بڑے مجمعوں" اپنی شاندار تقریروں اپنے قومی اخباروں کے صفحوں کے اندر صرف ایک افسانۂ تعلیم کی "سرد لاش" اٹھائے پھرتے تھے۔"

ان کی طنز نگاری کا ایک دوسرا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"جو "تاریکی" چھٹی صدی عیسوی میں جہالت نے پھیلائی تھی جبکہ اسلام کا ظہور ہوا تھا۔ ویسے ہی "تاریکی" آج تہذیب و تمدن کے نام سے پھیل رہی ہے جبکہ اسلام اپنی غربت اولیٰ میں مبتلا ہے۔ اگر اس زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی "تاریکی" بت پرستی تھی تو اس کی جگہ آج ہر طرف نفس پرستی چھا گئی ہے پہلے انسان پتھر کے بتوں کو پوجتا تھا اب خود اپنے تئیں پوجتا ہے خدا کی پرستش اس وقت بھی نہ تھی اور اس کے پوجنے والے آج بھی نہیں۔ دنیا کی وہ کون سی بیماری ہے جو آج پھر عود نہیں کر آئی۔؟ جبکہ وہ بیماری تھی تو کیا اس کی حالت ویسے ہی نہ تھی جیسی کہ آج ہے پہلے وہ پتھر کے چٹانوں پر بیماری کی کروٹیں بدلتی ہو گی اب چاندی اور سونے کے پلنگ پر لیٹ کر کراہتی ہے لیکن بیمار کے بستر کے بدل جانے سے بیماری کی حالت نہیں بدل سکتی۔"

از حادثۃ الغاشیہ :-

اتنے میں خبر اڑی کہ "ہزآنر" کے ہاں "وہ نر" ہے ہم نے کہا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون قومی طاقت کے ہزاروں آدمی حسرت سے

دیگ طرف اور ان نقرئی چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف حریت پسند دل سے پوچھا گئیے۔ اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے۔ جواب ملا کہ نہیں شکست کا اعتراف ہے۔

چشم اگر اینست و ابرو ایں و ناز و عشوہ ایں
الفراق اے ہوش و تقوی الوداع اے عقل و دیں

لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی اطبائے قدیم و جدید کو اتفاق ہے کہ چھ گھنٹے کے بعد غذا کے حرم سے معدہ خالی ہو جاتا ہے۔ جلد رات کو نہیں بلکہ صبح آٹھ بجے سے اور انگریزی کھانا بوجہ سادہ و بے آمیز ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ اب ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا ثقیل ہوگی کہ صبح تک معدے میں فروکش رہے اور آوازیں نکلیں تو حلق کی جگہ معدے سے مگر انسوس کہ دوسرے روز ہمارے طبی معلومات میں ایک انقلاب عظیم واقع ہوا طبی کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں ہم اس مسئلہ کو پیش کریں گے ہمیں اب یقین ہے کہ غذا جتنی لطیف و نفیس ہوتی ہے اتنی زیادہ ثقیل بھی ہوتی ہے نیز اگر بقراط بھی کہیں ملیں تو ہم اُن سے اس بارے میں لڑنے کے لئے تیار ہیں کہ شام کی غذا کم از کم دوسرے دن کی دوپہر تک تو ضرور معدے میں موجود رہتی ہے۔"

دل از من، دیدہ از من، آستیں از من کنار از من

لیکن یہ جو کچھ ہوا اس پر محض ایک سرسری نظر ڈال کر نہیں گذر نا چاہیئے۔ اب مکمل

ہماری نظریں (بحرِ مارمورا) اور (دردانیال) کے جنگی طوفانوں کی طرف لگی ہوئی ہیں اور جی نہیں چاہتا کہ اور کسی طرف دیکھیں تاہم ہم ناظرین سے کہیں گے کہ وہ ان چند ہلکی لہروں سے بھی اغماض نہ کریں جو ۲۰ دسمبر کو (گومتی) کی ساکن و خاموش سطح میں اٹھی تھیں۔ عجب نہیں کہ کسی وقت یہی گومتی کی لہریں قلزم کے طوفانوں کا کام دیں۔ فی الحقیقت ان جلسوں میں صاحبانِ عقل و فکر کے لئے بہت سی عبرتیں تھیں جن کو ایک ایک کرکے یاد کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ مسلمانانِ ہند کے اس تغیرِ افکار و اعمال کی پہلی منزل تھیں جن سے اس تغیر کا مستقبل وابستہ ہے اور جس کی طرف ہم نے پچھلے دنوں "صبحِ امید" کے عنوان سے دو افتتاحیہ مضمون لکھ کر توجہ دلائی تھی اور ہم چاہتے ہیں کہ اُسے تفصیل سے لکھیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد موجودہ طنزنگین میں پانچ نام آتے ہیں مولانا ظفر علی خاں، ملا رموزی، مولانا عبدالماجد دریابادی، سلطان حیدر جوش اور سجاد انصاری مرحوم۔ مولانا ظفر علی خاں کا کوئی تذکرہ خواہ وہ ان کی انشاپردازی سے متعلق ہو یا طنز و مزاح سے ان کی سیاسی اور صحافتی زندگی سے بے نیاز ہو کر نہیں کیا جا سکتا در اصل وہ پہلے انشاپرداز ہیں جنھوں نے صحافت میں ادب و انشا کے محاسن کو نہایت خوش اسلوبی سے سمویا ہے۔ مولانا آزاد کی طرح وہ تقریر او ر تحریر دونوں کے مردِ مجاہد ہیں ان کی خطابت میں بھی بادلوں کی گرج اور تلوار کی چمک ہوتی ہے۔ نظم و نثر دونوں پر ان کو یکساں قدرت ہے۔ مگر ان کے طنز میں ایک ہجو کا انداز ہے اور سیاسیات میں ہجو کو شامل کرکے انھوں نے برطانوی ڈپلو

کو اس کا ہدف بنایا ان کے یہاں بعض جگہ دشنام بھی ہے۔ ان کی صلاحیتوں کے بارے
میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مرتبہ بڑے مزے کی بات کہی۔

"ملک میں کسی تحریک کو مہینوں کے بجائے ہفتوں میں چلانا ہو تو
ظفر علی خاں اور شوکت علی خاں کو چھوڑ دو وہ بسرعت تمام یہ قلعہ
بنا ڈالیں گے لیکن جب قلعہ بن جائے تو ان کو فوراً باہر کر دو کیونکہ
وہ بھی اسی قلعہ کو ڈھا دیں گے۔"

ان کی سیاسی زندگی سے قطع نظر ان کی زباں دانی، ان کی انشا پردازی، ان کی
شاعری ان کی خطابت ان کے انداز تحریر سے تو شاید ان کے بدترین مخالفین
بھی انکار نہیں کر سکتے۔ ان کو اگر اُردو کا نعمت خاں عالی اور ابوالفضل کہا جائے
تو بیجا نہ ہوگا۔ ان کو اُردو کے ٹکسالی محاوروں اور دلی اور لکھنؤ کی زبان پر یکساں
قدرت حاصل ہے ان کا اسلوب اگرچہ پرانا ہے مگر اُردو ادب میں وہ ایک
کلاسکی درجہ رکھتا ہے بقول مولانا عبدالمجید سالک اگر ان کو یہ لکھنا ہے کہ وہ
لوگ جو خدا کے آگے جھکتے ہیں تو مولانا ظفر علی خاں اس کو یوں لکھیں گے

"وہ بندگانِ عجز و تذلل جن کی جبینِ نیاز عبودیت جنابِ باری
کے آستانۂ جلال و جبروت پر سجدہ ریز رہتی ہے۔"

اور اگر وہ یہ لکھنا چاہیں کہ عیسائی مطمئن تھے کہ قسطنطنیہ اب ختم ہونے کو ہے
اور عیسائی سلطنتیں قلمرو عثمانیہ کو پارہ پارہ کر کے آپس میں تقسیم کر لیں گی تو تحریر
کی صورت یوں ہوگی۔

"مسیحیت مطمئن تھی کہ وہ قسطنطنیہ جس کی چھاتی مونگ ان کے مذہب

اور گورہی گوری جاتی تی پر قرنوں سے دلی جارہی تھی عنقریب نقشہ پارینہ ہونے کو ہے اور مغربی پایہ تختوں میں اس دستر خوان کے بچھائے جانے کی تیاریاں کی جارہی تھیں جس پر بیٹھ کر مسیحی گدھ اسلامی نعش کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھانے والے تھے"

اس سے مولانا کے قلم کا زور، طبیعت کی ولولہ انگیزی، تخیل کی محشر انگیزی اور جذبات اور خیالات کے ہیجان کا پتہ چلتا ہے جس نے اُن کے دل میں جگہ لے رکھی ہے مگر اس کے باوجود ان کی خطابت ابو الکلام آزاد کی خطابت کے دوش بدوش چلنے کی صلاحیت نہیں رکھتی وہ اس کی مصاحب ہی معلوم ہوتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"زیر سایہ ہما پایہ برطانیہ ہندوستانی ریاستوں کی اندرونی آزادی کی کیسی دلکش تصویر ہے! والیان ریاست ہائے ہند کے ناموس فرماں روائی کی حفاظت کا کیسا شاندار ادعا ہے مگر یہ ساری دل خوش کن باتیں کچھ حقیقت بھی رکھتی ہیں یا چند الفاظ کا محض ایک نظر فریب مجموعہ ہے جس سے لندن کا ہزار شیوہ عماری والیان ریاست ہائے ہند کو نظر بند کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستان میں سب سے بڑی ریاست حیدرآباد دکن ہے جو رقبہ میں فرانس کے برابر ہے جس میں خدا کی ایک کروڑ چالیس لاکھ مخلوق بستی ہے جس نے عہد ماضی میں برطانوی ملوکیت کے قصر فلک بوس کی بنیادیں اپنے خون کے گارے سے ہندوستان میں استوار کیں...... مگر

دکن کا ایک پتہ بھی وائسرائے ہند کے حیدرآبادی گماشتہ یعنی رزیڈنٹ کی مرضی بغیر ہل نہیں سکتا۔ دکن کا فرماں روا آصف جاہ ہفتم نہیں بلکہ اس وسیع و عریض مملکت کے سیاہ و سفید کے مالک جناب حیدری ہیں یعنی جناب ٹرینچ ہیں یعنی جناب رزیڈنٹ ہیں یعنی جناب لارڈ ولنگڈن ہیں یعنی خود بدولت و اقبال جناب ریزے مکڈانلڈ ہیں...... اب جنوب سے شمال کی طرف آئیے۔ کشمیر کی ریاست رقبہ میں یورپ کی چھوٹی چھوٹی مملکتوں کو شرماتی ہے جس کی آبادی بلغاریہ کی آبادی کے برابر ہے جس نے انگریزوں کی ملوکیت کے آستانہ پر ہمیشہ سجدہ کیا جس نے اپنی حلیفانہ فرائض کے انجام دہی میں ہر طرح کی مالی اور جانی قربانیاں آئے دن پیش کیں...... کشمیر کا فرمان روا آج مہاراجہ ہری سنگھ نہیں بلکہ جناب راجہ ہری کشن کول ہیں یعنی جناب گلنسی ہیں یعنی جناب تمٹیرسن یعنی جناب لارڈ ولنگڈن ہیں یعنی خود جناب ریزے میکڈانلڈ ہیں۔

برطانیہ کے ارباب حل و عقد ہندوستان کے دیدۂ فراست میں لنڈن کے چوراہے کی خاک منھیاں بھر بھر کر جھونکنے کے بجائے اگر بھی بات خواہ وہ کیسی ہی کڑوی کیوں نہ ہو کہدیا کریں تو ہمیں کوئی شکوہ نہ ہو غصہ اگر آتا ہے تو اس بات پر کہ زہر دیتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ اسے شہد سمجھو۔ غلامی کے طوق گلے میں ڈالتے ہیں

مگر اصرار کرتے ہیں کہ اسے آزادی کی مجرا تصور کرو۔
کاش حکومت انگریزی کو اپنے قول فعل میں تطبیق پیدا کرنے کا خیال کبھی کبھی آجائے۔ کاش اس کا باطن بھی ویسا ہو جو کبھی کبھی اس کا ظاہر ہو جایا کرتا ہے۔"

مولانا عبدالماجد دریا بادی دور حاضر کے ممتاز صاحب طرز ادیب اور طنز نگار ہیں۔ وہ اکبر الہ آبادی کی طرح مشرق پرست اور مغربیت سے بیزار ہیں اس اعتبار سے دونوں کے طنز کا نشانہ مغرب پرستی، انگریزی حکومت اور انگریزیت ہے مگر اکبر مولوی کو بھی نہیں بخشتے اور ان پر بھی بھرپور وار کرکے ان کی پگڑیاں اچھالنے سے دریغ نہیں کرتے مگر عبدالماجد دریا بادی کو مولویت بھی عزیز ہے ان کے طنز میں زہرناکی اور شدت ہے وہ جس پر طنز کرتے ہیں اُسے بسمل بنا کر تڑپاتے ہیں اور اس تڑپن سے لطف لیتے ہیں۔ ان کا طنز چونکہ فکر میں رچا بسا ہوتا ہے اس لئے ماحول پر بھی اس کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ اپنے بہت سے ہم نوا پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کے لہجے کی تلخی ان کے انداز بیان سے اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ اس میں ہجو اور تنفر کی بو آنے لگتی ہے۔ مگر ان کا اسلوب اس درجہ دلکش ہے کہ ان کا بدترین مخالف بھی زبان سے خواہ ان کے بارے کوئی رائے قائم کیوں نہ کرے مگر دل ہی دل میں اس کا لطف لئے بغیر نہیں رہتا ظفر علی خاں کے طنز کی طرح ان کے یہاں شوکت الفاظ۔ اور جوش و خروش نہیں ہوتا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایٹم کے ذرات ہوتے ہیں ان کے طنز میں

میں انگلستان کے مشہور طنز نگار پوپ کا رنگ ملتا ہے۔ ان کے اخبار صدق جدید' کے دو تبصرے ملاحظہ ہوں۔

"ذہنی انحطاط" اسٹیٹمین مورخہ ۲۰ اگست میں اس کے خصوصی نمائندہ کے قلم سے:۔

"چنڈی گڈھ ۔ ۱۰ اگست طلبہ میں شورش اور ان کے گرتے ہوئے تعلیمی معیار سے گھبرا کر سرکار پنجاب نے مسئلہ کے حل کرنے کے لئے مشہور ماہرین تعلیمات کی مدد طلب کی ہے .... پچھلے مہینہ جب سرکار نے ایک خصوصی امتحان پندرہ وظیفوں کی تقسیم کے لئے لیا تو تین سو امیدواروں میں سے ۲۹۴ کے نمبر معمولی پاس کے نمبروں سے بھی کم تھے اور اس نے معیار کی انتہائی پستی کو ظاہر کر دیا۔"

اس پر مولانا لکھتے ہیں۔

"لیجیے، اب تک تو رونا طلبہ کے اخلاقی ہی زوال کا تھا۔ ان کی شوریدہ پشتی اور استادوں سے گستاخانہ طرز عمل کا تھا۔ یہ اب کھلا کہ اخلاق کے ساتھ ساتھ علم بھی رخصت ہو گیا ہے۔ اور ذہنی استعداد کی پستی کی نوبت یہ آگئی ہے! ایک طرف تو سینما اور ڈانس کی چاٹ دلائیے اور طرح طرح کی جنسی اور شہوانی لذتوں والی کتابیں اور تصویریں خوب پھیلائیے اور دوسری طرف استادوں سے ٹکرا کر بولنے اور ان کے خلاف ہر بدتمیزی کو آزادی اور

"مطالبۂ حقوق" کے نام دے کر خوب سراہئے اور پھر شکایت یہ کرتے پھرئیے کہ لڑکوں کا جی پڑھنے لکھنے میں نہیں لگتا۔ اور وہ جاہل سے روز بروز جاہل تر ہوتے جاتے ہیں۔ تو یہ شکایت اب خود ہی سوچئے کچھ بھی معنویت اپنے اندر رکھتی ہے!"

اسی صدق جدید سے ایک دوسرا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں مری مان جائیے! نئی دہلی ۱۰ اگست یونین ہوم منسٹر نے کل اپنی تقریر میں طلباء سے بڑے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ لوگ پالیٹکس کے بکھیڑے میں نہ پڑیں اور اپنی ساری توجہ تعمیری مشغلے تک محدود رکھیں ...... آپ لوگوں کا ملک کی مختلف شورشوں میں حصہ لینا افسوسناک ہے۔ اور یہ شورشیں خودغرض لوگ اور آپ کے دشمن ہی پھیلاتے رہتے ہیں ان کے بھرّے میں ہرگز نہ آئیے۔

بمبئی۔ ۱۲ اگست۔ بمبئی قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر مسٹر ڈی۔ کے کنٹے نے کل وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے طلبہ کے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج آپ جس جوش و خروش سے سیاسیات میں پڑ رہے ہیں۔ ہم بھی اپنی طالب علمی کے زمانے میں اسی طرح پڑ چکے ہیں۔ لیکن اپنی غلطی ہم پر اب واضح ہو چکی ہے اور آپ ایسی غلطی میں نہ پڑیں۔

اس پر مولانا کا طنز ملاحظہ ہو۔

"کیا خوب! گویا طلبہ کے منہ میں زبان نہیں ہے۔ اور وہ یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ بجا ارشاد ہوا۔ ہمیں بھی اس سن میں یہی غلطیاں کر لینے دیجئے اور جب آپ کے سن کو ہم پہنچیں گے تو ہم بھی اسی طرح اپنی غلطی کا اعلان کر کے دوسروں کے پند و موعظت میں لگ جائیں گے! اتنی موٹی سی اور کھلی بات پچیس تیس سال قبل کے ہمارے عقلائے سیاست کی سمجھ میں نہ آئی کہ جس شیر کو آپ خون چاٹنے کی لت ڈلا رہے ہیں کیا وہ صرف آپ کے مخالفین ہی کا خون چاٹے گا۔ صرف انھیں کو پھاڑے گا بھنبھوڑے گا اور آپ کو زندہ سلامت چھوڑ دے گا؟ یہ تو ایک بچہ بھی سمجھ سکتا تھا کہ

آج وہ کل ہماری باری ہے

خودی۔ بے قیدی، جاہ طلبی زندہ نفسی کی جو بھوک بلکہ حرص آپ نے "آزادی" اور "مطالبہ حقوق" کا نام لے کر پیدا کر دی ہے اس کی روک تھام کی کوئی صورت اب آپ کے اختیار میں ہے؟"

غالب کی لطیف ظرافت اور بذلہ سنجی جسے اودھ پنچ کے ظریفوں نے اپنی شوخ اور طرار طبیعتوں کے سہارے اتنا تیز اور شوخ کر دیا تھا کہ وہ ضلع جگت نوک جھونک، ہنسی، قہقہہ، تمسخر اور پھکڑ پن بن کر رہ گئی تھی اس میں اعتدال پیدا کرنے والوں میں سید محفوظ علی بدایونی تھے۔ اس طرح وہ اودھ پنچ کے

بعد عبوری دور کے طنز نگاروں میں میر کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے مزاج میں ہم کو ایک ٹھہراؤ اور ایک سنبھلی ہوئی کیفیت ملتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں بھر پور کہتے ہیں اور جذبات نگاری کا جہاں تک تعلق ہے اس میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے مگر سید صاحب کے مضامین سے صرف وہی لوگ لطف اٹھا سکتے ہیں جو پڑھے لکھے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ان کی تحریروں پر عربیت کا غلبہ ہے جس سے بظاہر مضامین خاصے بوجھل معلوم ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کے ہر مضمون میں شوخی اور شگفتگی پھوٹی نکلتی ہے۔ سید صاحب کو عورتوں کی زبان اور ان کی نفسیات پر بھی بڑی قدرت تھی وہ دلّی کی شریف گھر والیوں کی زبان پر بھی پوری قدرت رکھتے تھے۔ چنانچہ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"آسیہ۔ جیتی رہو۔ ٹھنڈی سہاگن۔ دعا دینے کو تھی کہ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو...... دودھ کی ماشاءاللہ وہ کثرت ہے کہ ٹین کے ڈبوں میں بند ہو ہو کر ایرا غیرا کے یہاں پہنچ رہا ہے۔ پوتوں کی یہ کیفیت دیکھنی ہو سنتی نہیں ہوں اور ہوں اور تمہاری سگی بہن ہو کر ہو سنوں تو مجھ خالہ پر تف ہے اپنے گھر کا تو ذکر کیا.... ...... دوسروں کے گھروں میں ایسے پھل رہے ہیں جیسے گڑ دی تو مرڈی"

پروفیسر آل احمد سرور ان کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ادھر تیغ اور تفنگ کا دور ختم ہو رہا تھا ادھر تہذیب کے قدم

رفتہ رفتہ جم رہے تھے اور اس کی کوشش بار ور ہو رہی تھی چنانچہ اب
جن مزاح نگاروں کے نام آتے ہیں وہ قدیم و جدید کے درمیان
کی کڑی ہیں۔ اس دوسرے دور میں اگرچہ بہت سے آدمیوں نے
مزاحیہ مضامین لکھے مگر مزاحیہ فن کار صرف تین ہیں۔ سید
محفوظ علی بدایونی، مولانا ظفر علی خاں اور سلطان حیدر جوش ۔"

سید محفوظ علی کے لب و لہجہ کو تمسخر اور فقرے بازیوں سے پیدا ہونے
والی ظرافت سے دور کا لگاؤ نہیں ہے اور نہ ان کی تحریر پڑھ کر ناظر قہقہے لگانے
لگتا ہے بلکہ ان کی سنجیدگی میں شوخی اور طنز کی ایک ایسی مٹھاس ہوتی ہے
کہ اُس سے دماغ ایک خاص کیف و سرور محسوس کرتا ہے۔ تمثیلیہ ایک بہت
مشکل فن ہے۔ اس کوچے میں قدم رکھنا ہر فن کار کے بس کی بات نہیں مگر
سید صاحب نے اس کوچے میں بھی نہایت فن کارانہ انداز میں اپنے قلم اور
طبیعت کی جودت دکھائی ہے جس سے خواجہ حسن نظامی کا یہ کہنا بالکل صحیح
ثابت ہوتا ہے کہ

"نثر میں سب سے بہتر ظرافت لکھنے والے مولوی محفوظ علی
بدایونی ہیں ان سے زیادہ نیچرل اور بے ساختہ چلبلی اور راز
سرتا پا مرصع ظرافت کوئی نہیں لکھتا یا میرے علم میں نہیں ۔"

مگر پروفیسر کلیم الدین حسب عادت خواجہ صاحب کی اس رائے کی رد
میں لکھتے ہیں۔

"سید محفوظ علی صاحب تمثیلہ کی راہ میں قدم بڑھاتے ہیں۔ تمثیلیہ

ایک مشکل فن ہے اور اس میں کامیابی کے لئے طاقتور تخئیل زبردست شخصیت حساس دل اور زندہ یقین کی ضرورت ہے۔ سید محفوظ علی صاحب میں یہ اوصاف موجود نہیں۔ شیخ سماءاللہ کی صاحبزادیاں تمثیلیہ کی صف میں کوئی بلند پایہ جگہ پانے کے لائق نہیں۔ یہ ایک حد تک دلچسپ ضرور ہے لیکن اس کا حسن سطحی خیالات معمولی ہیں اس میں نہ خطیبانہ ہیجان ہے اور نہ کوئی زندہ شعلہ زن حقیقت کا انکشاف۔"

پروفیسر کلیم الدین کا شمار اردو کے ممتاز نقادوں میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اسی وجہ سے اُردو ادب کا بڑے سے بڑا نقاد ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا ان کی تنقید کا یہی سب سے بڑا نقص ہے کہ وہ چند مخصوص مغربی تنقید نگاروں سے جن سے وہ حد درجہ متاثر ہیں اُردو کے ادیبوں اور تنقید نگاروں کا مقابلہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور اس موازنہ میں وہ اُردو زبان کے سن و سال اس کے ماحول اور اس کے مزاج کا لحاظ کئے بغیر اس درجہ انتہا پسندی سے کام لیتے ہیں کہ ان کو اُردو ادیبوں میں عیب ہی عیب نظر آتے ہیں۔ اسی لئے ان کی تنقید تنقیص بن کر رہ جاتی ہے چنانچہ سید محفوظ علی صاحب کی تمثیل نگاری کو وہ اسکیچ کی تمثیل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ سید صاحب خالص مزاح نہیں لکھتے تھے بلکہ وہ سنجیدہ لکھنے والوں میں ہیں مگر چونکہ ان کی طبیعت میں شوخی تھی اس لئے ان کے وہ مضامین جو ظریفانہ شمار کئے جاتے ہیں ان میں کبھی ظرافت پر سنجیدگی غالب ہے۔ اور ظرافت میں کبھی طنز کو دخل ہے۔ وہ سیاسی لیڈر جن کے

نظریات سے وہ متفق نہیں تھے۔ جب وہ اُن پر طنز کرتے ہیں تو اُس طنز میں ایک آرٹ ہوتا ہے۔ حاجی بغلول اور پروفیسر قطرب میں ان کا ہدف افراد نہیں بلکہ سماج ہے چنانچہ پروفیسر قطرب کے تعارف کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"حضرات! میں ممنون ہوں کہ آپ نے تقریر کی اجازت دے کر میری عزت بڑھائی۔ میں جس مضمون پر آپ کی سمع خراشی کرنا چاہتا ہوں وہ معرکۃ الآرا مضمون ہے جس پر کچھ دن سے ہندوستان کے نامی اخبار اور معتدد اصحاب اظہار خیال فرما رہے ہیں لیکن اس بحث پر کچھ عرض کرنے سے پہلے بتانا چاہتا ہوں کہ میں خود کون ہوں۔ میرے قد و قامت اور رنگ و روغن سے جناب نے مجھے ایرانی یا افغانی سمجھا ہوگا اگرچہ میرے لہجہ نے جناب کو پھر شک میں ڈال دیا ہوگا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جیسے میں کل آریہ ورت کو اپنا جنم بھوم سمجھتا ہوں ویسے ہی سرزمین عرب کو اپنا مولد اور وطن جانتا ہوں۔ میری رگوں میں زمزم بھی ہے اور گنگا جل بھی۔ میری پیشانی جیسے سجدہ کے نشان سے منور ہے ویسے ہی چندن کے تلک سے مزین۔ میرے داہنے ہاتھ میں عقیق البحر کی تسبیح ہے اور بائیں میں رودرا چھ کی مالا۔ میں ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی ایک بولتی چالتی تصویر اور ایک چلتی پھرتی نظیر ہوں صاف لفظوں میں سنئے کہ میرے والد صاحب سبزواری اور ماتا جی ہردواری۔ قطرب میرا اصلی نام نہیں بلکہ اِس نام سے میں

اخبارات و رسائل میں مضامین لکھتا ہوں۔ میرا حقیقی نام عربی النسل بھی ہے اور ہندی الاصل بھی۔ جناب کو تعجب ہوگا کہ ایسا کون سا نام ہو سکتا ہے سنئے میرا نام عربی النسل ہونے کی وجہ سے "رجب علی" ہے اور ہندی الاصل ہونے کی حیثیت سے "راجا بلی" میری اس خصوصیت پر نظر کر کے جناب حاجی صاحب نے بلیغ طرز ادا میں فرمایا تھا کہ میں چھ مہینے مسلمان رہتا ہوں اور چھ مہینے ہندو۔ ایسی حالت میں آپ تسلیم فرمائیں گے کہ سب سے زیادہ خوشی جس شخص کو مسلمانوں کے اتفاق سے ہوگی وہ میں ہوں کیونکہ ان دونوں قوموں کا اتفاق میری ددھیال اور ننھیال کا اتفاق ہے اسی وجہ سے مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ پر کسی فریق کے طرفدار ہونے کی بدگمانی نہ فرمائیں گے۔"

منظر نگاری میں سید صاحب کو اس درجہ کمال حاصل تھا کہ جس جگہ کا ذکر کرتے اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے ہو بہو کھنچ جاتا۔ چنانچہ اپنے ایک مضمون "اتحاد بین المسلمین والهنود" میں خود فقیرانہ بھیس میں ایک افغانی ایرانی اور عرب سے مخاطب ہیں ملاحظہ ہو۔

"افغانی۔ ملا! تمھارا ہندوستانی بڑا ملک اور تم ہندی بڑا آدمی ہے۔ ہم تمہارا ملک سے ناواقف نہیں ہم جانتا ہے تم لوگ کام کا آدمی نہیں۔ کلام کا آدمی ہے۔ تم لوگ دال روٹی پوری کچوری کھا کر پان چبا کر خالی خولی چاؤ چاؤ کاؤ کاؤ کرنا جانتا ہے۔

تمہارے ملک کے اندر پول کی فراوانی جنس کی ارزانی اور حمل ونقل کی آسانی نہیں ہے تم لوگ تجارت کرتا ہے۔ زراعت کرتا ہے۔ چاکری کرتا ہے۔ پیشہ وری کرتا ہے اس طور سے تم دولت جمع کرتا ہے۔

"ایرانی۔ قربانت شما! ہم اپنے گرگاب و جوشاب اپنے ستوں ورادکان اپنے تنگہ اکبر و وادی گل پوشاں اپنے حافظیہ و سعدیہ اپنے سلطانیہ و ناصریہ۔ اپنی اس خوش آب و خوش گل زمین سے کس دل و جگر سے مفارقت گوارا کریں جناب آغا! ہم تو دیار رستم و اسفند یار کو چھوڑ کر بہشت بریں بھی نہ جائیں گے کیونکہ عینی زبان ہم سے پہلے ہی کہہ چکی ہے

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت
کنار آب رکناباد و گل گشت مصلےٰ را

عرب۔ صلی علی النبی یا شیخ! تم نے کہا کہ اپنا ملک چھوڑ دو۔ ہم اس کا جواب دیتے ہیں کیا یہ ہمارا ملک نہیں؟ کیا ہم بنو اسمٰعیل نہیں؟ کیا ہم بنو قیدار، عدنان، معد، مضر، کنانہ، فہر۔ غالب لوی، کعب۔ مرہ۔ کلاب۔ بنو عبد مناف۔ بنو ہاشم نہیں؟ اگر ہیں اور تم کو ماننا پڑے گا کہ دنیا کی تمام اقوام سے زیادہ عرب اپنے انساب سے واقف ہیں۔"

سید صاحب کو نہ صرف الفاظ کے انتخاب کا ملکہ تھا بلکہ ان کے ہر ہر لفظ میں گہرائی اور معنویت کا سمندر موجیں مارتا ملتا ہے۔ رعنایت لفظی سے انھوں نے

بھی اپنے بعض مضامین میں فائدہ اٹھایا ہے مگر اس میں بھی اُن کے یہاں ایک فن کار کا سا انداز ملتا ہے۔ رعایت لفظی ایک سستی ظرافت ضرور ہے مگر اس کے صحیح استعمال سے جو لوگ واقف ہیں وہ اس کا استعمال کچھ اس ڈھب سے کرتے ہیں کہ رعایت لفظی بجائے طبیعت کو مکدر کرنے کے ایک لطیف مٹھاس پیدا کر دیتی ہے۔ سید صاحب نے اپنے مضامین میں جہاں جہاں اس حربے سے کام لیا ہے وہاں اودھ پنچ کے دوسرے نثر نگاروں کی طرح اسے بھونڈے پن سے بچا لیا ہے۔

سید صاحب کی انفرادیت صرف ان کی تحریروں ہی سے نہیں ظاہر ہوتی بلکہ اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے کبھی کوئی مضمون اپنے نام نہیں لکھا بلکہ مختلف ناموں کی نقاب اپنے چہرے پر ڈالے رہے اور اس طرح وہ ایک نقاب پوش طنز نگار بنے رہے ابتدائی دور میں وہ "تجاہل عامیانہ" کے تحت لکھتے رہے اور اس نقاب کا استعمال انھوں نے ہمدرد میں کیا۔ نقیب میں انھوں نے "ملا بودموتی" کی نقاب سے کام لیا علی گڈھ میگزین میں وہ "شمع بے نور" بن کر آئے مگر نظر باز خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر ان کو لوگوں نے ہر انداز اور ہر قد میں پہچان لیا۔ الناظر پریس سے اُن کے بلند پایہ ادبی مضامین کا ایک مختصر سا مجموعہ۔ انتخاب نقیب کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جس میں شیخ سمار، اللہ خاں کی صاحبزادیاں یا صاحب دین ظرافت کے بلند ترین معیار پر پورے اترتے ہیں۔ سید صاحب کے یہ مضامین نہ تو قہقہا آور ہیں اور نہ ان سے لبوں پر ہنسی پیدا ہوتی ہے بلکہ ان کی تازگی اور نفاست سے دل میں ایک روح پرور گدگدی پیدا ہوتی ہے۔ اُن کے

صاحب دین کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"...... محققین عام اچا ہے وہ قدیم نظامات ارسطا طالیہ و فیثاغورثیہ سے تعلق رکھتے ہوں یا اس کو لات طبلیہ و ڈارونیہ ہے) اس پر متفق ہیں کہ صاحب دین نوعی اعتبار سے حیوان ناطق کی ایک مضمحل سی شاخ ہے...... صاحب دین نے ہوش سنبھالتے ہی ایک نظر میں تاڑ لیا کہ قدیم تہذیب و تمدن کا بوسیدہ ڈھانچ کلیتہ "پھونک دینے کے قابل ہے چنانچہ وہ اس کا قائل نہیں کہ اولاد پر والدین کے کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ اس کی نظر میں یہ محض اتفاق ہے کہ باپ باپ واقع ہی ہے ورنہ ہو سکتا تھا کہ وہ باپ ہو۔ وہ زیادہ سے زیادہ "پیارے باپ" کا مستحق ہے اور اگر زیادہ ترقی کی گنجائش ہو تو وہ "بڑھاپے و قوف" کافی ہے۔ بھائی ایک رقیب ہے جس کے مقابلہ میں اپنے حقوق کا تحفظ لازمی ولابدی ہے۔ اصلی عزت و عظمت کی مستحق زوجہ ہے نہ کہ ماں...

جس طرح کہ ہمارے یونانی اطبا نے۔ آلو۔ انڈے۔ دہی اور دنیا بھر کے کھانے پینے کی چیزوں کا مزاج نکال لیا ہے اور کچھ درجہ قائم کر کے یہ قرار دیا ہے کہ کون چیز کس درجہ میں گرم ہے اور کس درجہ میں سرد کس درجہ تر ہے اور کس درجہ خشک۔ معلوم نہیں اسی طرح صاحب دین کو بھی اشیاء ماکول میں سمجھ کر طبیب نے اس کا مزاج بھی نکالا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس فرو گذاشت پر افسوس

کرتے ہوئے فقیر اپنا اجتہاد پیش کرتا ہے کہ میرے تجربہ میں صاحب دین ایک مختلف المزاج والکیفیت چیز ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب دین کا مزاج کسی دوسرے صاحب دین کے مزاج کے ساتھ تو ہمیشہ گرم تر رہتا ہے مگر غیر صاحب دین کے ساتھ سرد خشک اور غصہ اور ریل کے سفر کی حالت میں گرم خشک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے صاحب دین کے لئے چاہے وہ فہرست چندہ لے کر آئے یاد عوت جائے۔ ایک صاحب دین ہمیشہ سریع الفہم ہے مگر غیر صاحب دین کے لئے چاہے وہ خفیف سی درخواست ہی لے کر آئے وہ نہایت بطی الفہم ہے۔"

مسٹر صاحب دین سے ایک اقتباس اور ملاحظہ ہو۔

"وہ انگریزی اچھی بولتا ہے مجھے اس کی نسبت کچھ کہنا نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ بولتا ہے۔ مثلاً وہ اپنے نوکر، اپنے گھوڑے اپنے کتے حتی کہ اپنے بچھڑ اور اپنے گفش اور اپنے جوتے سے انگریزی بولتا ہے۔ اور جب کبھی اُسے مجبوراً اپنی دیسی زبان بولنی پڑتی ہے۔ تو وہ ایک ایسی کھچڑی ہوتی ہے جس میں بلا مبالغہ ۱۴ چھٹانک سپید چاول (انگریزی الفاظ) اور صرف ۲ چھٹانک کالی دال (دیسی الفاظ) ہوتے ہیں۔

گنگا کو اگرچہ وہ ماں کا محبت آمیز خطاب دیتا ہے مگر کہتا "گینجز" ہی ہے مکہ کو اگرچہ وہ ہمارا مقدس مقام کہتا ہے مگر بولتا "میکا" ہی

ہے۔ وہ سلطان کو سلیٹن اور خلیفہ کو کے لف ہی کہے گا خاکسار نے تو بمبئی میں ایک صاحب دین کو لفظ مسلما کو مُسلُما کہتے سنا ہے۔ میں نے اُن کی زبان سے یہ جدید ترین لفظ سنا تو اُن کے چہرے کی طرف دیکھ کر فوراً قطع من اللیل مظلماً پڑھ دیا جسے وہ کچھ نہ سمجھے۔ سب سے زیادہ مہربانی وہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست اور اس کے حکمراں پر کرتا ہے۔ وہ حیدرآباد کو ہائی ڈرا بڈ اور حضور نظام کو نائی ذم ہی کہتا ہے۔"

نواب سید محمد آزاد اودھ پنچ کے ان لکھنے والوں میں ہیں جو اپنا ایک مخصوص اسلوب رکھتے ہیں۔ "نوابی دربار" کے نام سے ان کا ایک مسلسل ناول ایک زمانہ تک اودھ پنچ میں قسط وار چھپتا رہا اور بعد میں اُن کے مضامین کا ایک مجموعہ خیالات آزاد کے نام سے شایع ہوا۔ اُن کے مضامین میں بلا کی ندرت اور شگفتگی پائی جاتی ہے اودھ پنچ کے تمام لکھنے والے نثر نگاروں میں اُن کا درجہ سب سے بلند ہے۔ بنی روشنی کی ڈکشنری کے عنوان سے اُن کے دو مضامین اودھ پنچ میں ایک خاص شہرت رکھتے ہیں۔ وہ بھی اپنے دور کے لکھنے والوں کی طرح مشرق کے دلدادہ اور مغربیت کے مخالف ہیں۔ انھوں نے اپنے دور میں نثر نگاری میں ویسی ہی شہرت حاصل کی جو اکبر نے نظم میں حاصل کی۔ اُن کے طنز کی تان کبھی سیاست اور معاشرت پر ٹوٹتی ہے اُن کی ظرافت رکاکت، کہنہ اور ہجویات سے پاک ہے اور وہ سیدھی سادے انداز میں طنز کے پھول کھلاتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ظرافت اور شوخی

دور دوب کے چٹخارے ملتے ہیں اور وہ ایک معیاری زبان لکھتے ہیں۔ ان کے یہاں زور بیان
کہیں کہیں اُن حدود میں بھی داخل ہو گیا ہے جہاں مسکرا کر انسان دانت میں
انگلی دبا لیتا ہے مگر اس دور کے مذاق پر یہ چیز اتنی بار نہ تھی جیسی کہ ہم اُسے
اس وقت محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ ستر اور پچھتر سال قبل ظرافت کا معیار موجودہ معیار
سے بہت کچھ بدلا ہوا تھا۔ اُن کی طرزِ نگارش کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"مہذب بی بی۔ دلکش، دلربا اور دلفریب جورو۔ میاں سے سن میں دس
بیس برس بڑی۔ حلقۂ اخیار میں اکثر وقت جلوہ گری۔ لباس انسانی میں
بے پر کی پری۔ وہ جادو جو سر پر چڑھ کر بولے۔ وہ زندہ ترانہ جو اپنے
پرفسوں آنکھوں کے پتلوں میں ہر انسان کو تولے۔ غنچۂ دل احباب کے
کھلانے کی ہوائے بہار۔ ایک انار .... عمدہ اور
مہذب خانگی تسکار گاہ دل فریبی۔ محبت اور سلیقہ کی ہمیشہ آباد نمائش گاہ۔
مہذب دماغوں کے معطر رکھنے کا سدا بہار گل ہشتبو۔ سوسائٹی کا بھڑکتا
ہوا اور دلچسپ دستنبو۔ میاں کی نہایت معتمد مشیر۔ ہوم ڈپارٹمنٹ کی
بہت بیدار مغز وزیر۔ ہمدردی کی کان۔ محبت کی جان۔ میاں کی دولت
اڑانے کا طوفان بلا نشان۔ ہر گھر کے لئے صحت بار ہوا۔ ہر انجمن کے لئے
تہنیت کی صدا۔ میاں کی سرتاج۔ ایک منتخب ہزار کاج۔ ہر پیشہ اور ہر
کام میں نہایت آسانی اور غیر محسوس طور سے استعمال پذیر۔ میاں کی افزائش
عز و مراتب اور ترقی عہدہ میں اکسیر تاثیر۔ شوہر کے ہر عزم کی قوت
بازو۔ بے ضرر سحر۔ پر لذت کرامت۔ بے خطا جادو ...... وہ خوش

رنگ پر تکلف، خوش کیف اور تند شراب جس کا نشہ عزیزوں کی محبت کنبے کی رعایت۔ مذہبی حرارت اور قومی عادت کو یک قلم مٹا اور بھلا دے۔ وہ خوروش۔ تجربہ کار۔ روشن دماغ اور ادا شناس دایہ جو بڑے بڑے قابل ہمہ داں۔ آزاد اور وارفتہ مزاج جوانوں کو اپنی آغوش عاطفت میں دو چار تھپکیں بار تھپکیوں سے مثل شیر خوار بچوں کے عمر بھر کے لئے خواب غفلت میں سلا دے۔۔۔۔۔"

ان کے ایک دوسرے مضمون کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"جب کسی فرنگی کی داڑھی سلک کی گون پر آنکھ پڑ جاتی ہے۔ مجھے تمہارا اگرنٹ کا پیجامہ کس نفرت سے یاد آتا ہے۔ جب کسی میم کو دوسرے صاحب کے ساتھ بے تکلفانہ ناچتے کودتے دیکھتا ہوں تمہاری شرم ایک تیر کی طرح دل کے پار ہو جاتی ہے جب کسی عزیز لیڈی کو بیعت کے ٹکڑے پر ہاتھ صاف کرتے دیکھتا ہوں تو تمہاری جیایتوں کو حنائی انگلیوں سے کھنکنا یاد آتا ہے اور جی گھبراتا ہے"

ب اور نمونہ ملاحظہ ہو۔

میں اپنی خوش نصیبی سے گورنر ممدوح کا ذاتی دوست بھی ہوں اور اکثر لڑکپن میں اپنی ولایت کی چراگاہوں میں ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے سوروں کے خوشنما، خوش رفتار اور نیک اطوار بچوں کو چرایا ہے۔ جو صفائی اور رونق سرشتہ آبکاری کی، اُن کے زمانۂ حکومت میں ہوئی ہے ایسی کبھی آج تک دیکھی نہیں گئی تھی۔ اور صرف شراب

اور افیون کی تجارت کو ترقی دینے سے اس قلیل عرصہ میں تہذیب اور علم نے وہ زور پکڑا ہے کہ ہر کوچہ و بازار میں شراب خانے اور مدک خانے کثرت سے نظر آتے ہیں اور اُن کے دیکھنے سے نیک نیت آدمیوں کی آنکھوں کو بڑا آرام ملتا ہے .... چیف کمشنر برما کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب سے رم کو ان کوہستانی ملکوں میں رواج کیا گیا ہے تب سے سیکڑے پیچھے بیس آدمی آگے سے زیادہ قحط کی سختی اور خوف کو کم کرنے کے لئے دار البقا میں نشیمن کرتے جاتے ہیں ۔"

(نوابی دربار)

خ۔ (پلنگ پر پگڑی رکھ کر اپنی بی بی سے) تم نے سنا تو آج تو اچھا سامان ہو گیا ہے۔ ایک خوب ہی ڈبل مقدمہ ہاتھ لگا ہے۔ خدا نے چاہا تو اسی مقدمے میں امام باندی کی شادی سے فراغت ہو جائے گی۔

بی بی۔ تم روز ہی ایک خبر تازہ سناتے ہو۔ چار برس سے تو یہی سنتے سنتے کان پکڑ گئے کہ اب کی گوشوارہ ہو جائے گا۔ اب کی شادی ہو جائے گی۔ اے میں کہتی ہوں تم بڑھاپے میں جھوٹ کتنا بولنے لگے ہو۔

خ۔ خدا کی قسم یہ نقرہ نہیں۔ دیکھو (ہزار کا نوٹ جیب سے نکال کے) یہ تو گویا لقمہ ہے اگلی اور بہت سے تر لقمہ باقی ہیں۔

ب۔ ایک پرزے کاغذ پر اتنا اترا تا۔ خدا جانے کہاں سے پھٹا پرانا چاہے

کو غدا اُٹھالائے ہو اور مجھے فریب دیا چاہتے ہو۔ میں ایسی بھولی نہیں کہ تمہارے جھانسے میں آجاؤں۔ شادی کراؤ گے تو اپنے بیٹا بیٹی کی اور نہ کراؤ گے تو اپنے بیٹا بیٹی کی اس سے کیا۔

خ۔ بس میں سچ کہتا ہوں مذاق نہیں کہتا۔ دیکھ لو پڑھ لو ہزار حروف میں لکھا ہے۔

ب۔ چلو ہٹو میں کیا جانوں۔

خ۔ خدا کی قسم ایک معاملہ دربار کا ہاتھ لگا ہے اور اب کے بہت کچھ ہاتھ لگے گا یہ تو ہزار کا نوٹ شگون ہے۔

ب۔ یہ شگون اور یہ چونچلے اپنی جھنا کو جاکر دکھاؤ جن کے کام آئے گا اور جن کے زیور اس سے بنیں گے۔ خدا نہ کرے کہ تمہارا روپیہ میرے بچوں کے اور میرے کام آئے تمہارے گھر آکر خوب خوش ہوئی اور خوب مزے کئے۔ کوئی ہوس باقی نہیں ہے اب خدا مجھے عزت کے ساتھ اُٹھالے۔

خ۔ خدا کی قسم یہ بدمزاجی مجھے بالکل پسند نہیں کیا قرینہ نکالا جب آؤ یہی طعن تشنیع میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔

ب۔ اپنے دل سے پوچھو مجھ مصیبت زدہ کا کیا تم بگاڑو گے۔ خدا ہی نے بگاڑ دیا نہیں تو کیوں تمہارے گھر کی لونڈی گری آج نصیب ہوتی۔

اُردو شعر و ادب میں ریاض خیر آبادی ایک "زندہ باد گاہ" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ و ادب میں صرف وہی ایک شاعر ہیں جنہوں نے خمریات کو مخصوص طور پر اپنا موضوع

سخن قرار دے کر اپنی شوخی اور فطری شگفتگی سے طنز و ظرافت کے پھول بوٹے کھلائے خمریات میں ان کے انداز بیان میں ویسی ہی شوخیاں ملتی ہیں جو غالب کی نثر و نظم کا طرۂ امتیاز ہیں۔ وہ علاوہ ایک ممتاز شاعر ہونے کے ایک شوخ نثار بھی تھے وہ منشی سجاد حسین، سرشار، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف کے ساتھیوں میں تھے۔ ۱۳۰۸ء میں موصوف نے گورکھپور سے ایک اخبار فتنہ اور عطر فتنہ جاری کیا جو اپنی صوری اور معنوی ادبی اور حکا ہی چند در چند خصوصیات کی بنا پر اپنا ثانی آپ تھا۔ "شاہدانِ ناز" فتنہ کا ایک خاص موضوع تھا۔ جس کے ذیل میں بقول مولانا حسرت موہانی ایسے ایسے لطیف مضامین شایع ہوئے ہیں جس کو دیکھ کر طبیعت بے قابو ہو جاتی ہے۔ مولوی سبحان اللہ خانصاحب مرحوم عظیم گورکھپوری ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"منشی ریاض احمد سر سے پاؤں تک اس قدر شوخ تھے متین بننا چاہتے تھے مگر بن نہیں سکتے تھے۔ میں نے اُردو کے پچاس شاعروں کا کلام اول سے آخر تک دیکھا ہے جس میں ان کا ابتدائی متوسط اور آخری دور سب شامل ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے یہ ابتدائی کلام ہے۔ اب متانت آ رہی ہے۔ اب متانت آگئی ـــــ لیکن ریاض کی شوخی کا قدرت کی طرف سے ایسا پختہ رنگ تھا جو کبھی پھیکا نہ پڑا۔ ابتدائی کلام کا ایک شعر سنئے۔

اڑی ہیکل کو چوم لیگی   وہ چیز جو کچھ اٹھی اٹھی ہے

اب آخر عمر کا شعر ملاحظہ ہو۔

ریاض اب شکل بھی بدل مذاق طبع بھی بدلا
یہ سن کا ہے تقاضا جو خیال حور آتا ہے

یہ بات گو کوئی زیادہ قابل ذکر نہیں مگر ان کی طبیعت کی شوخی اور رنگینی دکھانے کو لکھ رہا ہوں کہ انھوں نے جب سر سید خانی دور ہوا تو ترکی ٹوپی جس میں چاند تارا لگا ہوتا پھندنا سنہرا ہوتا زیب سر کی۔ اسی سید خانی دور میں ترکی کوٹ جو تنگ پیچھے سے کٹا ہوتا اور کمر کے قریب دو بٹن لگے ہوتے رائج تھا۔ حضرت ریاض نے شیروانی میں تنگ پیچھے یہی چیز بنوائی آگے بالا بر کھلا ہوا اور بٹن کھلے ہوئے اور دونوں پہلوؤں سے اسی کپڑے کا وہ ٹکڑا ادھر ادھر سے آکر بٹن بند کرتا جس سے معلوم ہوتا کہ شیروانی یا مصنوعی ٹرکش کوٹ کے نیچے واسکٹ پہنے ہوئے ہیں ـــ اس طرح گریبان چاک جھومتے ہوئے ریاض کا چلنا ایسی انوکھی مستانہ ادا تھی کہ جس کی مثال ان کے مرتے دم تک ہندوستان بھر میں مجھے کیا کسی کو نظر نہیں آئی۔"

ریاض کی نثر میں سنجیدگی ادب شوخی۔ طنز اور لطیف چٹکیاں ہوتی ہیں جن کو پڑھ کر طبیعت میں شگفتگی اور لبوں پر خود بخود مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ ان کی نثر کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

حرم سرا اور نظارہ کے بعض جملے اور فقرے ملاحظہ ہوں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ریاض کی نثر نگاری میں شوخی کے ساتھ ساتھ کتنی ادبیت پائی جاتی ہے۔

"پلکوں سے معلوم ہوتا تھا کہ خدا نے آنکھوں کے لئے یہ پردے

بنائے ہیں تاکہ جب دست تنگ کسی کا نقد دل لائے تو چھپا لیں،
لب رنگیں اتنے نازک کہ راز کی بات کبھی نہ چھپا سکیں۔"

"ترک اور یونانی کبھی نہیں ملے مگر میدان جنگ میں۔"

"برابر میں مردوں نے بڑھ کر حصہ لیا ہے مگر محبت کا میدان عورتوں
کی فتوحات کے لئے خالی کر رکھا ہے۔"

"تل اویٹ بہادر" میں انھیں بڑی اور سیاہ آنکھوں میں دیکھا جن کی
دونوں پتلیوں میں خوشنما وصال کی راتیں چھپی ہوئی تھیں۔"

حاجی لق لق کی ظرافت کی شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی جیسی ہے
وہ بھی فطرتاً ظریف ہیں۔ مگر ان کے یہاں نہ شوکت کی جیسی حاضر جوابی ہے اور
نہ عظیم بیگ چغتائی کی جیسی پختگی ہے۔ ان کے یہاں آمد سے زیادہ آورد ہے
اس کی وجہ ان کی صحافتی زندگی ہے جس نے ان کو پیشہ ور ظریف بنا دیا۔ بعض
بعض جگہ جب وہ خود اپنی طبیعت سے کچھ لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کی ظرافت سے
ان کی طبیعت کی شوخی اور ذہانت کا پتہ چلتا ہے مگر بحیثیت ظرافت نگار
ایم۔ اسلم سے زیادہ اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔
"ہمارے شاعر نے" بام یار "پر بھیجنے کے لئے ایک کبوتر پالا۔ تو

انگریزوں نے کہا۔ کہ لاؤ اس سے اور بھی کام لیں چنانچہ لندن کے اخبار "ڈیلی کرانکل" نے گذشتہ صدی میں نامہ بر کبوتروں کے ذریعہ خبریں حاصل کرنے کا سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رکھا۔ اور اس اخبار کے بعض پرانے ملازمین اب تک زندہ ہیں جنہیں دفتر کی بالائی منزل پر کابکوں کی غور و پرداخت کرنی پڑتی ہے۔

سائنسداں بھی اس شعر کے سننے کے بعد نچلے نہ بیٹھ سکتے تھے چنانچہ "مارکونی" سر پیٹتا رہا۔ کہ "خط کبوتر کس طرح لے جائے بام یار پر" میں شاعر کا اشارہ "وائرلیس" کی طرف ہے لیکن قدامت پسندوں نے اس وقت ان کا یقین نہ کیا لیکن جب جنگ کا وقت آیا تو جہاں فوجی حکام نے مارکونی کا دل رکھنے کے لئے وائرلیس کو بھی لے لیا۔ وہاں نامہ بر کبوتروں کی خدمات ترک کر کے ہمارے شاعر کی توہین بھی مناسب نہ سمجھی اور کبوتروں کی باقاعدہ پلٹنیں بنائی گئیں جن میں "سپاہی" کبوتر بھی تھے اور "عہدہ دار" کبوتر بھی۔ ان کبوتر لوگوں کے ہم انسان لوگوں کی طرح نام بھی تھے۔ اور نمبر بھی۔ لیکن یہ نام ہم کالے آدمیوں کی طرح نہیں تھے بلکہ ان لوگوں کی قسم سے تھے جو کھڑے ہو کر پیشاب کے لئے خواہ مخواہ بدنام ہیں حالانکہ میدان جنگ میں تمام خاکی وردی والے انسان اس لئے کھڑے ہو کر موتتے ہیں کہ پتلون بیٹھنے نہیں دیتی ؎

ایم۔اسلم نے طنز و ظرافت کی طرف توجہ بہت کم کی۔ "نستے علیکم"، "لاجواب الو"، اور "ٹھونگے" میں ان کی اعتدال پسند ظرافت ملتی ہے۔ وہ ظرافت میں قہقہے لگانے اور طنز میں زہرناکی کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی ظرافت گدگدی پیدا کرنے والی ظرافت ہے۔ ان کے قلم سے ظرافت میں کبھی کوئی ایسا فقرہ نہیں نکلتا جو پڑھنے والے کے لئے ناگوار خاطر ہو۔ سماج پر وہ کبھی طنز کرتے ہیں اور باتوں باتوں میں سماج کی خامیوں کی طرف لطیف اشارے کرتے ہیں ان کی زبان شستہ اور پاک ہے۔ ان کے مضامین کے مجموعوں میں "ٹھونگے" میں ہلکا پھلکا طنز ملتا ہے۔ "ظریف اور ظرافت" سے ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"ظریف یا مزاح نگار حقیقت میں صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جسے دیکھتے ہی ایک چنگے بھلے آدمی کو ہنسی آجائے (اگر کوئی رو بھی دے تو کچھ مضائقہ نہیں) بانس برابر قد ہو کلے طوطا پری آم کی یاد تازہ کرتے ہوں چہرے پر ہوائیاں (آتشبازی کی ہوائیاں نہیں) اڑتی ہوں لباس صرف

صورت ببیں حالت میرس

کی داستان کہہ رہا ہو۔ اور چال کا بے ڈھنگا پن دیکھ کر راہ چلتے بھی ذرا پلٹ کر دیکھ لیں اگر چند یا بنجر واقع ہوئی ہے تو صحافی شندی میں مانگ بھی زیادہ ہو گی اور جو ابلے ہوئے انڈے کی طرح جس پر سے چھلکا اتار لیا گیا ہو۔ صاف اور ملائم ہو تو وہ قطعی مزاح نگار ہے۔ اور اس کی شہرت کا چاند اس طرح چمکے گا

جیسے دہلی میں چاندنی چوک یا آسمانِ ادب پر اس طرح درخشاں نظر آئے گا جس طرح کسی مشکیں نسب معشوق کے کان میں بنارس کے بنے ہوئے پونے تین آنے والے پارے کے آویزے۔"

قاضی عبدالغفار کی اہمیت اور ان کی طرازی ان کے اندازِ بیان اور رعنائی اور اس کے نوک پلک کے اہتمام میں نہیں بلکہ ان کے نقطۂ نظر ان کے حوصلہ اور ان کی بصیرت میں ہے۔ ان کے یہاں طنز رومانیت کے ساتھ ہے اُن کا طنز گہرے اور متوازن شعور اور روشن فکر سے آراستہ ہے جس میں ایک واضح اور معاشرتی احساس ملتا ہے۔ وہ معاشرت پر اس انداز میں طنز کرتے ہیں کہ سماج کی دبی ہوئی چوٹیں ابھر آتی ہیں لیلیٰ کے خطوط ان کا شاہکار ہے اس میں انھوں نے مرد کی نفس پرستی اور عورت کی بے چارگی اور بے بسی پر ایسے طنزیہ انداز میں ماتم کیا ہے کہ سماج کی بہت سی خامیوں پر جو نقاب پڑی ہے وہ اُٹھ جاتی ہے۔ اُن کی رومانیت میں حقیقت پرستی کی جانب ایک بین میلان پایا جاتا ہے وہ احساس کی تربیت کرنا چاہتے ہیں جذبات کی بندگی پر نہیں اکساتے۔ اُن میں شدت توانائی، اور تند مزاجی ہے۔ ان کا طنز بھی لطیف ہے اور اسلوب بیان میں ایک شگفتگی ہے۔ لیلیٰ کے خطوط میں وہ سماج کے ٹھیکیداروں کو اپنے فرائض یاد دلاتے ہیں اور ان کے دلوں میں ذمہ داری کا خوشگوار احساس پیدا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں اور ان کی زندگی کو نئے زاویے سے بیان کرتے ہوئے نئے شعور کو ابھارتے ہیں۔ لیلیٰ کا کردار جس کے جذبات کے مدوجزر کا نقشہ قاضی صاحب

نے پیش کیا ہے اُس میں سماجی حقیقتوں کی طرف بڑے لطیف اشارے ہیں اور یہ اشارے پکار پکار کر ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ہمارے لیڈر، مولوی اور واعظ ان حقیقتوں کو جھٹلانا چاہتے ہیں مگر جھٹلا نہیں سکتے۔ نفس پرست مرد نے عورت کو اس کے تمام جائز حقوق سے محروم کر دیا ہے۔ اُس کی شخصیت کو کچل کر پاش پاش کر دیا ہے لیلیٰ اس مظلومیت اور محکومیت کے خلاف آواز بلند کرتی ہے اور اپنے زخموں کی نمائش کر کے اُن کے خلاف صنفِ نازک کو بغاوت اور سرکشی کے لئے اکساتی ہے۔ لیلیٰ کا لہجہ گو بہت بے باک اور حیا سوز معلوم ہوتا ہے مگر صدیوں کے مظالم نے اس کو احتیاط اور میانہ روی و اعتدال سے نا آشنا کر دیا ہے اس کی بلند آہنگی اور اس کا احتجاج اس کے مصائب کا پیمانہ ہے اس کا طنز و استہزا اس کی تلخ نوائی اور بت شکنی اس کی خطابت اور اس کا زورِ بیان اس کی تند مزاجی اور بیزاری کا لازمی نتیجہ ہے وہ عرصۂ دراز تک مرد کے بنائے ہوئے قوانین کا شکار رہی ہے اور اب اس کا احساس خودی بیدار ہو رہا ہے وہ ایک جگہ کہتی۔

"آج میرا آنا ناممکن ہے کل یا پرسوں آپ یاد فرمائیں گے تو میں ضرور آؤں گی مگر آپ کو وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ کا شاعرانہ تخئیل مجھے نہ ستائے گا۔ آپ بچوں کی طرح اصل پر چھائیں پکڑنا چاہتے ہیں اور وہ ہاتھ نہیں آتی تو مچلتے ہیں بندہ نواز! جس منزل پر ہم دونوں آ گئے ہیں وہی ہمارے سفر کی انتہا ہے اس کے آگے ہمارے راستے جدا ہیں۔ چلئے جہاں تک آپ کے ساتھ چل سکوں

اُس کے آگے جانا ہو تو پھر تنہا جانا ہو گا۔" ------

"کمہار نے ایک خوبصورت آبخورہ بنایا۔ لوگوں نے اس کو جام صہبا بنا لیا۔ کمہار نے ایک جام صہبا بنایا اور لوگوں نے اُسے آبخورہ سمجھ کر مسجد کی دیوار پر رکھ دیا۔ تو پھر کیا۔ اس مٹی کی حقیقت بدل گئی؟ جام میں چاہے شراب بھر دو چاہے زمزم عورت کو بیسوا بنا دو یا گھر کی ملکہ جو چاہے بنا دو مردوں نے جیسا چاہا عورت کو ویسا بنا دیا۔ غلام بنا دیا۔ اپنے نفس کا خدمت گزار بنا دیا بازاروں میں بٹھا دیا۔ برباد کر دیا۔ ہیرے کی چمک تم نے چھین لی۔ اور جو سنگریزہ بچا اس کو مٹی میں ملا دیا۔ موتی کی آب تم اڑا لے گئے اور باقی جو کچھ رہا اس کو ہوا میں اڑا دیا۔ اب رہ گیا ہے کہ تم عشق و عاشقی کی داستان لیکر آئے ہو۔" ------

"میں جانتی ہوں آپ کہتے ہوں گے کہ یہ عورت کس قدر بے حس اور بے حیا ہے۔ جناب قیس! آپ کی لیلیٰ نہ بے حس ہے نہ بے حیا وہ اس فریبی دنیا کی ایک متکلم پرست بیٹی ہے وہ اگر حیا اور اس کی اصطلاحات پر غور کرنے لگے تو کھائے کہاں سے۔ زندگی کیونکر دے آپ کے درس اخلاق سے اگر وہ متاثر ہونے لگے تو پھر دنیا والے اس کو نہ مرنے دیں گے نہ جینے دیں گے۔

اب اتنا تو ہے کہ وہ اپنی گناہ کی دنیا میں کسی نکتہ چینی کی پروا نہیں کرتی۔ آپ جو اپنی عشق و عاشقی کے ساتھ ساتھ اصلاح

نفوس و اخلاق کا علم بلند کر رہے ہیں اور سکار صوفی کی طرح "مجاز و حقیقت" اور "حقیقت و مجاز" کے درمیانی خلا میں مکڑی کا جالا پور رہے ہیں۔ ایک احمقانہ حرکت ہے اور میری نظر میں تمسخر انگیز آپ گویا میرے اپنے تعلقات کو ایک آسمانی برکت سمجھ رہے ہیں اور میں ـــــ میں سوائے اس کے کچھ نہیں سمجھتی کہ میری دکان کے گاہکوں میں سے ایک آپ بھی ہیں" ......

......

"کبھی تم نے اپنی گذری ہوئی عمر کو اپنے ضمیر کے آئینے میں دیکھا ہے؟ اتنی استعداد بھی ہے۔ جوانی کی مستیوں نے اس آئینہ کے ٹکڑے کر ڈالے ہوں گے پھر بھی اگر کوئی ٹکڑا باقی ہو تو ڈھونڈ کر گرہ میں باندھ لو جب جوانی کا بھوت تمھاری گردن سے اترے گا تو وہ ٹکڑا کام آئے گا" ......

"مرد جب اپنے بستر کے لئے عورتیں تلاش کرتا ہے تو اس کو سب سے زیادہ یہ فکر ہوتی ہے کہ عورت حسین ہو چاہے وہ کتنا ہی مکروہ صورت ہو ـــ مگر عورت حسین چاہتا ہے۔ نکاح سے پہلے وہ لڑکی کی صورت دیکھ کر مطمئن ہو جانا چاہتا ہے مگر کبھی اس بات پر غور نہیں کرتا کہ اگر عورتیں بھی شادی سے پہلے مرد کی صورت دیکھ لینا چاہیں تو کیا گناہ ہے؟ کیا بھیڑ بکریاں ہم ہی ہیں کہ تم ذبح کرنے کے لئے خریدنے سے پہلے ہماری کھال کو دیکھتے ہو کہ

ڈھلی ہوئی تو نہیں ؟ ہماری عمر معلوم کرتے ہو کہ بوڑھی تو نہیں۔
ہمارے ہاتھ پاؤں دیکھتے ہو کہ دبلی تو نہیں۔ مہروں پر جھگڑتے ہو
قیمتی چیزیں مانگتے ہو۔ اور اس طرح اپنے من کا سودا خریدنا
چاہتے ہو!........

ایک دن میں بمبئی کے ایک کنجر خانے کی سیر کرنے گئی۔ وہاں
میں نے دیکھا کہ صرف تندرست مرد آتے ہیں اور تقریباً برہنہ عورتیں دس
دس بیس بیس ــــ ان کے سامنے لاکر پیش کی جاتی ہیں۔ وہ ان کو
بے حیائی اور بے شرمی سے بھری ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔
معائنہ کرتے ہیں، جانچتے ہیں۔ انتخاب کرتے ہیں۔ ان کے دام
چکاتے ہیں ــــ قربانی کی ان بکریوں پر اس طرح تبصرہ ہوتا ہے!
"آنکھیں تو اچھی ہیں مگر چہرہ دبلا ہے"!
"رنگ و روغن تو بُرا نہیں۔ مگر جسم بھدا ہے"
"یوں تو بُری نہیں مگر آنکھیں ذرا چھوٹی ہیں"
"ہونٹ ذرا موٹے ہیں اور ناک چھوٹی ہے"
"دانت بدنما ہیں۔ کمر موٹی ہے"

میں تم سے پوچھتی ہوں کیا وجہ ہے کہ ایک دن وہ نہ آئے کہ
ہم بھی مردوں کو اسی طرح اپنے سامنے حاضر کر کے نہ جانچیں اور
پرکھیں۔ کنجر خانوں میں عورتوں کے بجائے مرد رکھے جائیں اور عورتیں
جا کر ان کا بھاؤ طے کریں۔ وہ سب ہمارے سامنے صف باندھ کر

لائے جائیں اور ہم بھی مردوں کی طرح سنگدل اور بے حیا ہو کر تبصرہ کیا کریں۔

"یہ کالا ہے!"

"یہ بھدا ہے"

"اس کی آنکھ ٹیڑھی ہے کان بڑے بڑے ہیں"۔

"یہ گنجا ہے"

"اس کا سانس متعفن ہے اس کے دانت میلے ہیں"

پھر تم سے ہماری عصمت کے ٹھیکہ دار ایسا خوفناک انتقام لیا جائے کہ آسمان کے فرشتے تمہارا حال دیکھکر کانپنے لگیں"

مجنوں کی "ڈائری" سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

۲۵ر فروری ۱۹۲۹ء

میں نے کہا "آپ کے حسن کے چرچے ہیں"

منہ بنا کر لیلیٰ نے کہا "حسن کو آپ کیا جانیں آپ لوگ تو اپنی ہوس کو جانتے ہیں۔ دوسروں کے حسن سے واقف نہیں۔ آپ حسن کو کھال کے اوپر دیکھتے ہیں اور ہوتا ہے کھال کے نیچے"

۲۹ر مارچ ۱۹۲۹ء

"میں نے کچھ اور اداس اور افسردہ ہو کر کہا" تم کو یہ زیبا نہیں تم تو دنیا میں ہنسنے ہنسانے کے لئے بھیجی گئی ہو۔ ان حسین آنکھوں کو

آنسوؤں سے کیا علاقہ" کہنے لگیں "میرا پیشہ ہنسنا ہنسانا مگر میری فطرت غمگین ہے۔ حسن ہمیشہ غمگین ہوتا ہے اور عشق بھی۔ ہوس البتہ خندہ لب ہوتی ہے اور گناہ قہقہے مارتا ہے۔"

سجاد انصاری کا شمار ان طنز نگاروں میں ہے جن سے اُردو ادب میں طنز نگاری کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کے یہاں سلطان حیدر جوش کی طرح فکر و فلسفہ ہے مگر ان کے قلم میں جوش سے زیادہ تیزی اور بے باکی ہے۔ سنجیدگی اور متانت کو وہ کبھی کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کی ظرافت بھی عام فہم نہیں تھی اور صرف پڑھا لکھا طبقہ ہی اس سے محظوظ ہو سکتا تھا۔ وہ جماعتی نظام اخلاق کو ریاکاری اور جبر و تشدد کا نام دیتے ہیں۔ وہ فرد کے تصورات اور تخیلات کے مقابلہ میں جماعتی اقدار کو ٹھکرا دینا چاہتے ہیں وہ صرف انفرادی عظمت، انفرادی قوت ارادی اور انفرادی قوت فکر کے ستائش گر ہیں۔ انھوں نے انفرادیت کا ایک ایسا صنم تراش رکھا ہے جو ان کی نظر کو صرف اپنے ہی جلوؤں تک محدود دیکھنا چاہتا ہے۔ جماعت اور فرد کے باب میں لکھتے ہیں کہ

"جماعت محض جاہل، کمزور اور بزدل افراد کا اتحاد ہے جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بلند نظر اور بلند حوصلہ افراد کی قوتوں کو ابھرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ جماعت چاہتی ہے کہ برگزیدہ شخصیتوں کی قوت ارادہ اور قوت عمل دونوں ہمیشہ کے لئے برباد ہو جائیں۔ نظام اخلاق جماعت کے ایسی بزدلانہ اتحاد کا دوسرا نام ہے۔ بلند نظر

افراد کا فرض اور اہم ترین فرض یہ ہے کہ جماعت کے اخلاقی قوانین کو پامال کردیں ورنہ وہ ایک دن ان کی انفرادی عظمت کو پامال کردے گی۔ ۱۱

گویا وہ خود اپنے خیال اپنے عمل اور اپنی تخئیل کے قائل تھے اور کسی ہادی یا رہبر کے محتاج نہ تھے۔ اور ایسے ہی کچھ خیالات اور عقائد مذہب اور اخلاقیات کے بارے میں بھی رکھتے تھے۔ بہرحال ان کے معتقدات سے قطع نظر جہاں تک ان کے ادبی نظریات کا تعلق ہے وہ ادب برائے ادب کے قائل تھے اور اپنے معتقدات میں جس طرح وہ منفرد تھے ویسی ہی کچھ ان کی تحریریں تھیں چنانچہ انسان کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

'انسان'

"شیطان اور فرشتے کے درمیان انسان محض ایک بزدلانہ اور ریاکارانہ صلح ہے جس کی خود کوئی مستقل ہستی نہیں۔ وہ نہ حق ہے نہ باطل۔ اس کا وجود ایک فریب کائنات ہے۔ اس کی ہستی فطرت کی اس بزدلی کا نتیجہ ہے جس نے فرشتے اور شیطان دونوں سے عاجز آکر ایک پیکر اعتدال پیدا کر دیا۔ اعتدال اصل میں شکست حق ہے اور فتح باطل۔ انسان کی حقیقت اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ شیطان کی سرکشی کامیاب ہوئی کائنات ازلی نے اس کی ایک مستقل ہستی تسلیم کرلی۔ فرشتگی اور شیطنت کو ملاکر ایک تیسری مخلوق پیدا کی جس کا نام انسان رکھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تخلیق انسانی

کا باعث محض بغاوت شیطانی تھی۔"

جھوٹ کے باب میں ان کا کہنا ہے کہ

"ایک لطیف جھوٹ حسنِ خیال اور لطافتِ اظہار پیدا کر دیتا ہے لیکن وہ جھوٹ کبھی لطیف نہیں ہو سکتا جو ضرورتاً بولا جائے۔ راست گوئی گفتگو کو دلاویز نہیں بنا سکتی اس لئے کہ ہر اخلاقی فرض دلفریبیوں کا دشمن ہوتا ہے۔ دروغ گوئی اس لئے اور کبھی دلفریب ہوتی ہے کہ سچ کی طرح اُسے واقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

جس طرح اپنے مذہبی عقائد میں وہ ڈکٹیٹر کی حیثیت رکھتے تھے ویسی حالت کچھ ان کی تحریروں سے بھی ظاہر ہوتی اُن کا طرز فلسفہ کے آغوش کا پروردہ تھا۔ دوسروں کے جذبات کا احترام ان کے مسلک سے دور تھا۔ رشید احمد صدیقی نے بہت ٹھیک لکھا کہ

"سجاد کو فریب سے دشمنی تھی اور وہ بھی ازلی، وہ ہر فریب سے بیزار تھے خواہ اس کا اثر دوسروں پر پڑتا یا اس کا مورد خود "فریبی" ہوتا وہ مذہب میں "مذہبی" کے درپے تھے۔ اس میں شک نہیں وہ اصلاح کے قائل نہ تھے ان کا ایمان صرف جہاد پر تھا جہاد کامیاب ہوا ہو یا نہ ہو سجاد یقیناً کامیاب رہے۔"

'روزِ جزا' کے نام سے ان کے ڈرامہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں ایک جگہ وہ فرشتوں اور شیطان سے ایک مکالمہ دکھاتے ہیں۔

"جبرائیل۔ ہم لوگ کسی حالت میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتے۔

تم جاکر اپنے عقیدت مندوں کو تشفی دو اگر آج دے سکتے ہو۔ ہماری
حمد و تسبیح کا ترنم تمہاری آواز سے برباد ہو رہا ہے۔
شیطان۔ میرے عقیدت مندوں کو آج کسی تشفی کی ضرورت نہیں ان کے
اعمال کی رنگینیاں ہی ان کی تشفی کے لئے کافی ہیں۔
اسرافیل۔ میں نے تو آج کسی چہرے پر رنگینیوں کی جھلک نہیں دیکھی۔
شیطان۔ زاہدان خشک اور جوانان صالح حسن خیالی اور حسن عمل
دونوں سے محروم تھے اس لئے آج بھی ان کے چہرے پژمردہ اور
ان کے طبائع مضمحل ہیں۔ میں ان کا ذمہ دار نہیں۔ البتہ میرے
عقیدت مندوں کے چہرے دیکھو۔ نہایت بشاش اور نہایت شگفتہ
ان میں معاصی لطیف کی رنگینیاں جھلک رہی ہیں میرے عاصیان
رنگین آج مسرور ہیں کہ انھیں اپنے لطف کی لطیف سزائیں ملیں گی
گناہوں کی رنگینیوں سے جب سزاؤں کی رنگینیاں مل جائیں گی ان کے
لئے ہزار جنتوں کا سرمایہ فراہم ہو جائے گا۔ وہ خود اپنی بہشت
ہوں گے اور خود اپنی بہشت کے کارفرما۔ معصیت رنگیں کی سزا
محاسن خشک کی ہزار جزاؤں سے دل فریب تر ہے۔"
سجاد انصاری کے نزدیک مذہب نام ہے خلوص نیت اور صدق عمل کا ان کے
مضامین کے مجموعہ محشر خیال میں روز جزا کے نام سے جو ڈرامہ ہے اس میں بھی بد اعمالی
پر ایک طنز ہے۔ اس میں شیطان خدا سے سفارش کرتا ہے کہ تمام گناہ کبیرہ کے مرتکب
ہونے والوں کو دوزخ بھیج دیا جائے۔ وہ صرف ان لوگوں کی سفارش کرتا ہے جن کی

سفارش رومی اور اقبال نے بھی کی ہے۔ سجاد انصاری کا طنز در اصل ان لوگوں پر ہے جو مذہب اور اخلاق کا سہارا لیکر دوسروں پر مظالم کرتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کی شوخ نگاری اور ظرافت پر لکھنے سے پہلے خواجہ صاحب نے اپنی ظرافت کے بارے میں جو لکھا ہے وہ خود اُن ہی کے قلم سے ملاحظہ ہو۔

"میری طبیعت کی افتاد شوخی اور ظرافت کے خلاف واقع ہوئی ہے میں زیادہ تر غم و درد کے مضامین میں اپنے دل کو مائل پاتا ہوں......

جس فطرت کا بہاؤ دکھ کی جانب ہے سکھ کی جانب نہیں۔ مگر جناب اکبر کی ہم نشینی اور کچھ اس احساس کے سبب کہ نثر اردو میں مفید ظرافت کا رواج بڑھے مجھکو بھی شوق ہوا کہ اُردو کے اِس میدان میں طبع آزمائی کروں..... میری ظرافت...... درحقیقت ظرافت نہیں ہے میں نے خود اقرار کیا ہے کہ یہ اُردو ہے اور لوگوں میں زندہ دلی اور لطیف نکتہ چینی کا شوق پیدا کرنے کو یہ طومار تیار کیا ہے...

... اکثر مضامین میں جناب اکبر کا پیرایہ میرے پیش نظر ہے وہ نظم کے دو جملوں میں جو بات کہتے ہیں میں نے اس کو ایک بڑے مضمون نثر میں ادا کیا ہے بعض مضامین کی شوخی کھلی ہوئی بعض کی عبارت اوپر کی سطح سے سنجیدہ معلوم ہوتی ہے مگر اثر دل پر ظرافت کا ہوتا ہے دانستہ کبھی ایسا کیا ہے کہ بعض شوخ مضامین کو رکاکت میں گر جانے کے اندیشہ سے متانت کی چادر اُڑھادی ہے...... ہنسی مذاق میرا

کام نہ تھا مگر میں نے محض اُردو زبان کی خاطر اس میں دخل دیا ہے
گو میں جانتا ہوں کہ لطافت اور ظرافت جس کا نام ہے......
وہ ان مضامین میں نہیں ہے۔ تاہم نہ ہونے کے مقابلہ میں کچھ ہونا بہتر ہے۔"

خواجہ صاحب کے مذکورہ بالا بیان کو پڑھ کر ہر پڑھنے والے کو یہی اندازہ ہوگا کہ خواجہ صاحب کو فطرتاً ظرافت سے کوئی لگاؤ نہیں ہے اور انھوں نے جو ظریفانہ مضمون لکھے ہوں گے ان میں محض دوسروں کی نقالی کی ہو گی مگر ایسا نہیں ہے بلکہ جن لوگوں نے ان کے ظریفانہ مضامین کے مجموعے کو جواب سے چالیس برس پہلے "چٹکیاں اور گدگدیاں" کے عنوان سے شائع ہوا تھا پڑھا ہے اُس سے وہ اُن کی بچھی ہوئی "ظریفانہ رستمی" کے قائل ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس مجموعہ میں ان کا ایک مضمون "مس چڑیا کی کہانی" ہے جو طنز و مزاح کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

ملاحظہ ہو۔

"ایک چڑے چڑیا نے نئی روشنی کی ایک اونچی کوٹھی میں اپنا گھونسلا بنایا تھا۔ اس کوٹھی میں ایک مسلمان رہتے تھے جو ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے اور ایک میم کو ساتھ لیکے آئے تھے۔ ان کی بیرسٹری کچھ چلتی نہ تھی مگر گھر کے امیر زمیندار تھے۔ گزارہ خوبی سے ہوا جاتا تھا۔ ولایت سے آنے کے بعد خدا نے ان کو ایک لڑکی بھی عنایت کی تھی جو ماشاءاللہ چلتی پھرتی تھی اور باپ کی طرف سے مسلمان اور ماں کی طرف سے مس بابا تھی۔
چڑے چڑیا نے کھپریل کے اندر ایک سوراخ میں گھر

بنایا تنکوں اور سوت کا فرش بچھایا۔ یہ سوت پڑوس کی ایک بڑھیا کے
گھر سے چڑیا لائی تھی وہ بیچاری چرخہ کاتا کرتی تھی۔ الجھا ہوا سوت
پھینک دیتی تو چڑیا اُٹھا لاتی اور اپنے گھر میں اُسے بچھا دیتی۔

خدا کی قدرت ایک دن انڈا کھسک کر گر پڑا اور ٹوٹ گیا۔ ایک ہی باقی
رہا۔ چڑے چڑیا کو اس انڈے کا بڑا صدمہ ہوا جس دن انڈا گرا ہے تو چڑیا
گھونسلے میں تھی۔ چڑا باہر دانا چگنے گیا ہوا تھا۔ وہ گھر میں آیا تو چڑیا
کو چپ چپ اور مغموم دیکھ کر سمجھا میرے دیر میں آنے کے سبب خفا
ہو گئی ہے۔ لگا پھدک کر چوں چوں۔ چیں۔ چڑ چوں۔ چڑ چوں۔ چیں
چڑ چوں۔ چڑ چوں۔ چڑ چوں۔ چوں کرنے۔ کبھی چونچ مار کر گدگدی کرتا
کبھی خود اپنے پروں کو پھیلاتا۔ تھرکتا ناچتا اور چڑیا کی چونچ پر اپنی
چونچ محبت سے رکھتا۔ مگر چڑیا اسی طرح پھولی ابھری خاموش
بیٹھی رہی اس نے مرد ذات کی خوشامد کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چڑا سمجھا
بہت ہی خفگی ہے۔ مزاج حد سے زیادہ بگڑ گیا ہے۔ خوشامد سے
کام نہ چلے گا۔ مجھ مرد کی کتنی بڑی توہین ہے۔ کہ اتنی دیر خوشامد درآمد
کی۔ بیگم صاحبہ نے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ یہ خیال کر کے چڑا بھی منہ پھیر کر
بیٹھ گیا اور چڑیا سے بے رُخ ہو کر نیچے بیرسٹر صاحب کو جھانکنے
لگا جو اپنی لیڈی کے سامنے آرام کرسی پر لیٹے تھے۔ اور ہنسی مذاق کر رہے
تھے۔ چڑے نے خیال کیا کہ یہ آدمی کیسے خوش نصیب ہیں۔ دونوں
کا جوڑا خوش اور بشاش زندگی کاٹ رہا ہے۔ ایک میں بدنصیب

ہوں سویرے کا گیا گیا دانہ چگ کر اب گھر میں گھسا ہوں مگر چڑیا صاحبہ کا مزاج ٹھکانے میں نہیں ہے۔ کاش میں چڑا نہ ہوتا اور گم اند کم آدمی بنا یا جاتا۔ چڑا اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ چڑیا نے غمناک آواز نکالی۔ چوں۔ چڑے نے جلدی سے مڑ کر چڑیا کو دیکھا اور کہا۔ چوں چوں چڑ چوں چوں۔ کیا ہے۔ آج تم ایسی چپ کیوں ہو۔ چڑیا بولی انڈا گر کر ٹوٹ گیا۔

انڈے کی خبر سے پہلے تو چڑے کو بڑا رنج ہوا مگر اُس نے صدمے کو دبا کر کہا۔ تم کہاں چلی گئیں تھیں۔ انڈا کیونکر گر پڑا۔ چڑیا نے کہا میں اڑ کر ذرا چمن کی ہوا کھانے چلی تھی جھپٹنے کے صدمہ سے انڈا پھسل گیا۔ یہ بیان سن کر چڑا آپے سے باہر ہو گیا اس کے مردانہ جوش میں طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کڑک دار گرجتی ہوئی چوں چوں میں کہا۔ پھوہڑ۔ بدسلیقہ۔ بے تمیز تو کیوں اڑی تھی۔ تجھکو چمن کی ہوا کے بغیر کیا ہوا جاتا تھا کیا تو بھی اس گوری عورت کی خصلت سیکھتی ہے جو گھر کا کام نوکروں پر چھوڑ کر ہوا خوری کرتی پھرتی ہے۔ تو ایک چڑیا ہے۔ تیرا کوئی حق نہیں ہے کہ بغیر میری مرضی کے باہر نکلے تجھکو میرے ساتھ اُڑنے اور ہوا خوری کا حق ہے۔ آجکل تو انڈوں کی نوکری تھی تجھے یہاں سے ہٹنے کا اختیار نہ تھا۔ تو نے میرے انڈے کا نقصان کر کے اتنا بڑا قصور کیا ہے کہ اس کا بدل کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو نے میرے بچے کو جان بوجھکر مار ڈالا۔ تو نے خدا کی امانت کی قدر نہ کی جو اُس نے

ہم کو نسل بڑھانے کی خاطر دی تھی۔ میں تو پہلے دن منع کرتا تھا کہ ارے کمبخت
اس کوٹھی میں گھونسلا نہ بنا ایسا نہ ہو ان لوگوں کا اثر ہم پر بھی پڑ جائے۔
ہم بچارے پرانے زمانے کے دیسی چڑے ہیں خدا ہم کو نئے زمانے کے
چڑے چڑیا سے بھی بچائے رکھے۔ کیونکہ یہ پھر گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ
کے۔ مگر تو نہ مانی اور کوٹھی میں رہوں گی۔ کوٹھی میں گھر بناؤں گی یہ کہہ کر
میرا ناک میں دم کر دیا۔ اب لا میرا بچہ لا۔ میں تجھ سے لوں گا۔ نہیں تو مارے
ٹھوکروں کے کچلا بنا دوں گا۔ بڑی صاحب نکلی تھیں ہوا کھانے۔ اب
بتاؤں تجھے ہوا کھانے کا مزہ۔ چڑیا پہلے تو اپنے غم میں چپ چاپ
چڑے کی باتیں سنتی رہی۔ لیکن جب چڑا حد سے بڑھا تو اس نے زبان
کھولی اور کہا "بس۔ بس سن لیا۔ بگڑ چکے۔ زبان کو روکو۔ انڈے
بچے پالنے کا مجھی پر ٹھیکہ نہیں ہے۔ تم بھی برابر کے شریک ہو۔ سویرے
کے گئے یہ وقت آ گیا خبر نہیں اپنی کس سگی کے ساتھ پھرے اڑاتے پھرتے
ہوں گے۔ دوپہر میں گھر کے اندر گھسے ہیں اور آئے تو مزاج دکھاتے
آئے۔ انڈا اگر پڑا میرے پنجہ کی نوک سے ابھی کیا کروں۔ میں کیا
انڈوں کی خاطر اپنی جوان جان کو گھن لگا دوں۔ دو گھڑی باہر کی ہوا
بھی نہ کھاؤں۔ صبح سے یہ وقت آیا ایک دانہ حلق کے نیچے نہیں گیا
تم نے جھوٹے منہ سے یہ نہ پوچھا کہ تو نے کچھ ٹھونگا۔ کچھ نگلا۔ یا مزاج ہی
دکھانا آتا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ اکیلی چڑیا پر سب بوجھ تھا۔
اب آزادی اور برابری کا وقت ہے آدھا کام تم کرو۔ آدھا میں کروں

دیکھتے نہیں۔ میم صاحبہ کو وہ تو کچھ بھی کام نہیں کرتیں۔ صاحب ہی کو
سارا کام کرنا پڑتا ہے اور بچے کو آیا کھلاتی ہے۔ تم نے ایک آیا
رکھی ہوتی۔ میں تمھارے انڈے بچوں کی آیا نہیں ہوں"
"چڑیا کی اس تقریر سے چڑا سن ہو گیا اور کچھ جواب نہ بن پڑا بیچارہ
غصہ کو پی کر پھر خوشامد کرنے لگا۔ اور اس دن سے چڑیا کے ساتھ آدھی
خدمت انڈے کی بانٹ کر اس نے اپنے ذمے لے لی۔

مس چڑیا کی پیدائش

"ایک انڈا تو ٹوٹ چکا تھا دوسرے انڈے سے ایک بچہ نکلا جو مادہ یعنی
چڑیا تھی یہ بچہ ذرا بڑا ہوا اور اس نے میم صاحبہ کے بچے کو دیکھا کہ وہ
کاٹ کے گھوڑے پر سوار رہتا ہے گھڑی گھڑی دودھ پیتا ہے۔ ٹب
میں بیٹھ کر نہاتا ہے۔ نئے نئے خوبصورت کپڑے پہنتا ہے تو اس چڑیا
زادی نے بھی باپ سے کہا "چیں۔ چیں۔ چیں۔ ابا مجھکو بھی گھوڑا
منگادو۔ ابا میں بھی ٹب میں نہاؤں گی۔ ابا مجھکو بھی ایسے رنگ برنگ
کے کپڑے لا کردو چڑے نے چڑیا سے کہا سن۔ دیکھا مزا کوٹھی میں
گھر بنانے کا۔ اب اپنی لاڈلی کے لئے گھوڑا لا۔ ٹب منگا کپڑے بنا۔
چڑیا نے کہا۔ دیکھو پھر وہی لڑائی کی باتیں نکالیں۔ ایک کی تو تمھاری کل
کل سے جان گئی۔ یہ نگوڑی بچی ہے تم اس کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔
بچہ ہے کہنے دو۔ یہ کیا جانے ہم غریب ہیں اور یہ چیزیں نہیں لا سکتے
بڑی ہوگی تو آپ سمجھ لے گی کہ چڑیوں کو آدمی کی ریس سے کیا سروکار

مس چڑیا نے ماں کی بات سن کر کہا واہ جی اماں جب تم عزیب تھیں۔ تم چڑیا تھیں تو اس امیر کی کوٹھی میں آکر کیوں رہی تھیں۔ گاؤں کے کسی چھپر میں گھر بنایا ہوتا۔ میں تو ہرگز نہ مانوں گی اور میم صاحبہ کے بچے کی سی سب چیزیں منگا کر رہوں گی نہ لاؤ گی تو لو میں گرتی ہوں اور مرتی ہوں پاپ کاٹے دیتی ہوں نہ زندہ رہوں گی نہ تم پر میرا بوجھ ہوگا۔

چڑے چڑیا نے گھبرا کر کہا۔ ہے ہے۔ ایسا غضب نہ کیجیو۔ اچھا اچھا ہم سب کچھ منگا دیں گے۔ یہ کہہ کر اور مس چڑیا کو دلاسا دے کر دونوں نے چونچ سے چونچ ملائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا۔ روتے تھے اور یہ کہتے کہتے ہائے اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے اور بروں کی صحبت برا کر دیتی ہے۔ یہ بیرسٹر صاحب اچھے سہی مگر ان کی صحبت سے ہمارا تو ستیاناس ہو گیا ہائے ہماری لاڈلی ہاتھوں سے نکل گئی۔ ہائے یہاں تو اور چڑیا بھی نہیں جو ہمارے دکھ میں شریک ہو۔ چڑے چڑیا روتے تھے اور مس چڑیا قہقہہ لگاتی تھی کہ نئے زمانے کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے۔"

اس کہانی میں نئی تہذیب پر جس لطیف انداز میں خواجہ صاحب نے طنز کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ خواجہ صاحب کے طنز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آسان زبان میں الفاظ اور مواقع دونوں سے ایک انوکھی ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ ان کی ظرافت میں کبھی رشد و ہدایت کا رنگ ہے۔ ان کی سادہ اور ہلکی زبان ہی کیا کم لطیف ہوتی

ہے پھر اس لطافت میں جب شوخی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ دو آتشہ بن جاتی ہے۔ وہ دوسرے ظرافت نگاروں کی طرح فقرے بازی یا پھبتی سے پڑھنے والے کے دل کو نہیں گدگداتے اور نہ طنز میں کوئی ایسی زہرناکی پیدا کرتے ہیں جس سے پڑھنے والے کو تلخی محسوس ہو۔ وہ ظرافت کے تیر دھڑا دھڑ سر کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ ہاتھ روک کر تیر چلاتے ہیں اور بتدریج مزاح کے اثرات دل و دماغ پر بٹھاتے ہیں۔ وہ سودا کی طرح دوسروں کی پگڑی کبھی نہیں اُچھالتے بلکہ ایسا انداز اختیار کرتے ہیں گویا۔ پھونک ڈال رہے ہیں جس سے پگڑی رفتہ رفتہ خود ہی اپنی جگہ چھوڑنے لگتی ہے۔ چونکہ خواجہ صاحب کی ظرافت پیشہ ورانہ ظرافت نہیں ہے بلکہ سوچی سمجھی ہوتی ہے اس لئے اس میں کہیں کہیں آورد بھی پھوٹ نکلتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت میں سنجیدگی، متانت اور اپنے کو لئے دئے رہنے والی کیفیت ہے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں قلمی چہرے لکھے ہیں جو اللہ میاں سے لیکر شیطان تک چلے گئے ہیں ان خاکوں میں بھی جو لہجہ وہ اختیار کرتے ہیں وہ باوجود حد درجہ متین ہونے کے ظرافت میں رچا بسا ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"یہ شیطان ہے خبر نہیں لمبا ہے یا ٹھنگنا ہے داڑھی والا ہے یا بے داڑھی، کالا ہے یا گورا۔ امیر ہے یا غریب، شہروں میں ہے یا جنگلوں میں اور ہے یا نہیں، تاہم ہر اچھے بُرے، چھوٹے بڑے، عورت مرد انسان کو اس کی شرارتوں کا کسی نہ کسی طرح پر شکار ہونا ہی پڑتا ہے اگر کبھی میرے سامنے آجائے تو میں فوراً میلادی جنتری کے لئے اس کا فوٹو کھینچنے کی کوشش کروں۔ مگر وہ یہ کہتا ہوا فوٹو کے کیمرے

کے سامنے سے بھاگ جائے کہ جتنی فلم ایکٹرسیں فوٹوگرافر کے سامنے آئیں وہ سب میری ہی ہم شکل ہیں۔ سب میرے فوٹو اور چلنے کی تم انسانوں کو کیا ضرورت ہے“

اسی طرح ”لال ہلال“ کے عنوان سے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”الہلال بند ہو گیا۔ یہ بے نقط اخبار تھا اور سب کو بے نقط سناتا تھا۔ جب چارہ کار کی تدبیریں ہونے لگیں تو اس کے حروف کو بھی اُلٹ کر دیکھا تو حکم ملا (لال ہلال) معلوم نہیں الہلال کے محرر خصوصی لالوں کا ہلانا منظور کریں گے یا نہیں، طوطے کو بہت پال چکے ہیں۔ لالوں کا پنجرا ابھی رکھ لیں تو کیا مضائقہ ہے“

پرانے شعراء اور ادباء رعایت لفظی اور ضلع جگت سے اپنی تحریر میں مزاح پیدا کرنے کے عادی تھے جس کا نمونہ نہ صرف اودھ پنچ کے شعراء اور نثر نگاروں میں ملتا ہے بلکہ ان تمام نثر نگاروں اور شاعروں کے کلام میں اب تک ملتا ہے جو پرانے اسکول کے مقلد ہیں چونکہ حسن نظامی بھی اُسی اسکول کے خوشہ چینیوں میں تھے اور اکبر الہ آبادی کو اپنا استاد سمجھتے تھے اس لئے ان کے وہ مضامین جن میں رعایت لفظی کی بھرمار ہے وہ طبیعت پر بار ہو جاتی ہے۔ اکبر نے چونکہ اس کو شاعری میں استعمال کیا اس لئے وہ چیز بڑی حد تک نبھ گئی مگر خواجہ صاحب کے یہاں وہ چیز کچھ اچھا اثر نہیں پیدا کر سکی مگر اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خواجہ صاحب کی سنبھلی سنبھلی ظرافت کی مثال ہم کو اردو ادب میں کم ملتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کا شمار اس وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے ان مزاح نگاروں میں ہے جن سے ظرافت کے سوتے پھوٹتے ہیں اور جن کو طنز و ظرافت کی اقلیم کا ایک حکمراں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ وہ دور حاضر کے ان مزاح نگاروں میں ہیں جن کی ظرافت ادبی محاسن سے مالا مال ہے۔ اور اسی چیز نے ان کی ظرافت میں انفرادیت پیدا کر دی ہے۔ ادبی محاسن کے علاوہ اور بھی بعض عناصر ان کے مزاح میں انفرادیت کی تخلیق کے ذمہ دار ہیں جن میں ایک اُن کے "پیر و مرشد" یعنی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ہیں جو ان کے لنگوٹیا یار ہم جماعت اور ہم مذاق ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں اُسی طرح رچے بسے نظر آتے ہیں جس طرح شوکت تھانوی کے یہاں ان کی بیگم۔ چنانچہ سید علی عباس حسینی نے "رشید احمد صدیقی" کے عنوان سے علی گڑھ میگزین کے علی گڑھ نمبر میں جو مضمون لکھا ہے اُس میں وہ بڑے دلکش انداز میں اس "واقعہ بائلہ" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس کا آئیڈیل انسان "پیر و مرشد" ہیں لیکن رشید ان کی کمزوریاں پیش کرنے میں اُسی بے ساختگی اور بے تکلفی سے کام لیتا ہے جیسی ان کی خوبیاں پیش کرتا ہے۔ بلکہ بعض وقت تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ رشید نے پیر و مرشد کی ذات سے ایک ایسی کھونٹی کا کام لیا ہے جس پر ہر وضع قطع، رنگ و روپ، ڈھنگ اور ساخت کے جوڑے بھی نہیں ٹنگے ہیں بلکہ اس پر اچار کے مرتبان، چٹنی کی اچاریاں، دلّی کا چھینکا، دوا کی شیشی، جونپوری تیل کی کپی اور پہاڑی طوطے کا پنجرا بھی لٹکا دیا گیا ہے اُس کے اکثر مضحکات، مطائبات اور

طنزیات کا وسیلہ، سہارا اور بہانہ یہی ذات پر اخلاص ہے۔ وہ اکثر فن کاروں شاعروں اور ادیبوں سے متعارف ہوتا ہے تو انھیں کے ذریعہ اور اس کے بشتر اقوال حکیمانہ پیش کئے جاتے ہیں تو انھیں کی زبان سے، بیوی کی قدرح کی طرح ان کی مدح بھی رشید کی زندگی کے ساتھ ہے یہ گویا جیون ساتھی ہیں۔ رشید کی خوش قسمتی سے پیر و مرشد کو وائس چانسلری اور بلند افسری کا تاج اب ملا ہے جب رشید اردو ادب میں اپنے جھنڈے گاڑ چکا ہے ورنہ شاید نگاہ بد بیں اس میں "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کا پہلو ڈھونڈ نکالتی لیکن اب ایسی بات زبان سے نکالنا نظر پُر اخلاص و جوہر شناس کو رسک کرنا ہی نہیں ہے بلکہ ایک نیا بین الاقوامی مسئلہ چھیڑنا بھی ہے۔"

مگر رشید صاحب کے پیر و مرشد اور شوکت تھانوی کی "بیوی" یا بیگم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ شوکت کو ان کی "بیگم" صرف ان کی مزاح نگاری میں کشوخ اور ظریفانہ فقرے نکالنے میں اپنا کاندھا پیش کر دیتی ہیں جس پر رکھکر وہ اپنی ظرافت کی بندوق چلا لیتے ہیں مگر رشید صاحب کے "پیر و مرشد" ایک ایسے پیر ہیں جنکی معرفت اردو ادب کو نئی نئی اصطلاحات، مزاح کے نئے نئے گوشے اور نئی نئی علمی بحثیں ملی ہیں جس کے احسان سے اُردو ادب کبھی روگردانی نہیں اختیار کر سکتا انھوں نے پیر و مرشد کے وسیلے سے نثر میں وہ بہت سی چیزیں جائز طور پر جائز قرار دے لی ہیں جیسے کہ نامور شعراء نظم میں بہت سے الفاظ جائز قرار دے لیتے

ہیں۔ رشید صاحب نے انواع واقسام کے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے اور انھوں نے ہر موضوع کو ایک نیا روپ دے کر اردو ادب میں پیش کیا ہے اس میں مبالغہ اور غلو سے بھی انھوں نے استفادہ کیا ہے مگر ان کا اسلوب بیان غلو پر بھی اسی طرح غالب آتا ہے کہ غلو غلو نہیں معلوم ہوتا۔ جن لوگوں سے وہ بے تکلفی کی حد تک قریب ہیں ان کی شخصیت پر جب وہ سنجیدگی سے لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کی زبان قلم سے فنکاری کے معجزات ظہور میں آتے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اپنے استاذوق کے بارے میں جس فیاضی سے غلو کا سرمایا لٹایا ہے اسی فیاضی سے مٹھیاں بھر بھر کر انھوں نے بھی اپنے بعض مضامین میں دوستوں سے اچھا دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ مگر ان کے انداز بیان میں جو شگفتگی اور جو دل آویزی ہے اس میں محو ہو کر پڑھنے والا ان مٹھیوں کی طرف نگاہ نہیں کرپاتا جو مدح سرائی کا خزانہ لٹاتی ہوتی ہیں بلکہ وہ لوٹنے والوں میں خود شامل ہو کر اور "پھینک" اور "پھینک" کے خود نعرے لگانے لگتا ہے چنانچہ ان کے بعض مضامین مثلاً مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر اقبال، سر سلیمان وغیرہ میں یہی چیز ہم کو ملتی ہے۔ ان کے مضمون "مولانا محمد علی مرحوم" کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"محمد علی کی موت کا حال جب میں نے سنا تو تھوڑی دیر کے لئے یقین نہیں آیا۔ رہ رہ کر یہ خیال آتا رہا کہ محمد علی کو آخر موت نے زیر کس طرح کیا۔ خود موت پر کیا گذری ہوگی! ...... ملک و ملت کی جنگ اب بھی جاری ہے لیکن نعرۂ جنگ خاموش ہے۔ فتح وشکست تو اسی لئے بنائے گئے ہیں کہ فتح وشکست ہوتی رہے

لیکن جنگ آزادی کہاں ہے۔ شہادت کس کو نصیب ہوگی! ایسا
حسین کہاں جس کی خود یزید کو تلاش ہو"!

یوں تو ان کے سنجیدہ اور نیم شوخ مضامین میں سے ایک مضمون کا ٹکڑا تھا لیکن اُن کے خالص مزاحیہ مضامین میں مضحکات سے زیادہ حقیقی طنز ملتا ہے۔ وہ دوسرے مزاح نگاروں کی طرح فقرے چست کرتے ہیں مگر ان فقروں سے بھی ادب کی خوشبو نکلتی ہے اُن کے فقروں کی پھلجھڑی سے جو روشن پھول نکلتے ہیں وہ متانت اور سنجیدگی کے نور میں اکثر ابور ہوتے ہیں۔ اُن کے مزاج میں فکر کی گہرائی۔ نظر کی بینائی متوازن ہنسی اور نغمہ بردوش مسکراہٹ چھپی ہوتی ہے اس سلسلہ میں "ارہر کے کھیت" کا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"جوانی کا کھونا اور وہ بھی ارہر کے کھیت میں ایسا مسئلہ ہے جس پر ناک بھوں پر زور دینے سے پہلے دل و دماغ پر زور دینا زیادہ ضروری ہے۔ ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقے پر ہوتا ہے اکثر شفا خانے میں ورنہ جیل میں۔ جیل خانے کا راستہ تو اکثر ارہر کے کھیت سے ہی گزرتا ہے اور شفا خانے کا شہروں کی صاف شفاف سڑکوں سے جس سے موٹر بھی گذرتے ہیں اور مولوی بھی۔ یہ ہندوستان کی بدنصیبی ہے کہ اس کے نوجوانوں نے اسراف شباب کے لئے شفا خانوں کو جیلخانوں پر ترجیح دی زندگی کے آثار آپریشن ہال کے نشتر سے زیادہ جیلخانے کے ڈنڈے میں پائے جاتے ہیں۔ شفا خانے سے زندگی اور جیلخانہ سے موت

گھبراتی ہے۔

شباب اور مفلسی کا اجتماع اتنا ہی بے کیف ہے جتنا لبِ مرحوم کا السن یا بے تنباکو کا پان مانا کہ مرچ اور تنباکو مضر صحت ہیں لیکن تندرستی کا مصرف تحفظ تندرستی نہیں بلکہ اس سے لطف اندوز ہونا ہے۔ شباب میں پیرانہ سالی کا لطف (اگر اسے لطف کہہ سکتے ہیں) اٹھانا ممکن ہے لیکن پیرانہ سالی میں شباب کا کیف کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شباب اور پیری دونوں حالات منتظرہ ہیں ایک کا مقصود انتظار "دشمن ایمان و آگہی" یا "رہزن تمکین و ہوش" ہے دوسرے کا ——— ؟ لیکن یہ ستم ظریفی ہندوستان کے مطالبہ آزادی سے زیادہ دلچسپ ہے کہ شباب ایک طرف تو عقل سے شرمسار ہونے پر ضد کرتا ہے اور دوسری طرف سب کا انتقام بھی پورا پورا لیتا ہے۔"

رشید صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ تبذل سے تبذل بات بھی کہتے ہیں تو اس کے لئے ان کے پاس الفاظ کا ایک ذخیرہ اور ایک انداز ہے جس سے وہ پہلے ماحول پیدا کر لیتے ہیں اور پھر حقیقت نوازی کا لقمہ دے کر وہ بعض اوقات لطیف اشاروں میں اور بعض مرتبہ ایک لفظ میں وہ سب کچھ کہہ دیتے ہیں جو دوسرا کہے تو اس کی زبان بگڑ جائے اور اس پر عریاں نگاری کا الزام لگ جائے چنانچہ ایک ریل کے سفر میں ایک مارواڑی اور بنگالی کے لباس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ان کی دھوتی ستر پوشی کا اتنا کام نہیں دیتی جتنا کہ موقعہ کی نمائش اور نمائندگی کرتی ہے۔"

اسی طرح ایک جگہ بندروں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اس درمیان میں دو بندروں ہیں جو درخت کے اوپر تھے کسی نازک مسئلہ پر اختلاف آرا ہوا ایک کے سینے سے کوئی ولی عہد چپٹے ہوئے تھے اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا دوسرے بزرگ کا چہرہ سنجیدہ، لیکن بیک گراؤنڈ کے بارے میں غالب کا خیال تھا ؎

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر"

مگر رشید صاحب کے مزاج میں پروفیسر کلیم الدین کو حسب عادت دو خامیاں نظر بھی آگئیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"رشید صاحب کا مخصوص عیب یہ ہے کہ وہ اکثر موضوع سے بھٹک جاتے ہیں "آپ معاف فرمائیں میں یقیناً موضوع گفتگو سے دور جا پڑا ہوں" اس قسم کے جملے اکثر لکھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اپنی کمزوری کا احساس ہے اگر یہ بھٹکنا رواداری ہو اور اسے جائز حدود کے اندر رکھا جائے تو یہ دلچسپی کا باعث ہوتا ہے لیکن رشید احمد صاحب ضرورت سے زیادہ بھٹک جاتے ہیں اس لئے اکثر پڑھنے والے کی طبیعت میں الجھن سی پیدا ہونے لگتی ہے اس کے علاوہ وہ کبھی بسیار نویسی کے دام میں جا پھنسے ہیں۔"

جہاں تک پہلے اعتراض کا تعلق ہے اس قسم کے جملۂ معترضہ جہاں جہاں رشید صاحب نے استعمال کئے ہیں وہاں مزے کی بات کہتے کہتے ایک دم ہاتھ روک کر وہ دوسری بات اس غرض سے کہنا شروع کر دیتے ہیں تاکہ ناظر کی تشنگی اور بڑھ جائے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ایک پیاسے کو ایک گھونٹ پلا کر آپ ہاتھ روک لیں، تو اس حرکت سے اس کے پینے کے لطف میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ در اصل رشید صاحب کی یہ ایک ظریفانہ ادا ہے جو خود ان کی ایجاد کردہ ہے۔ جہاں تک دوسرے اعتراض کا تعلق ہے وہ حیرت انگیز ان معنوں میں ہے کہ عام پڑھنے والوں کو رشید صاحب سے اسی بات کی شکایت ہے کہ وہ کم لکھتے ہیں بلکہ لکھنے کے بارے میں وہ کاہلی کے بنئے بنائے گوشے نکالتے رہتے ہیں نہ کہ ایم۔ اسلم، شوکت تھانوی اور دوسرے لکھنے والوں کی طرح وہ ظرافت کو ہمیشہ حبیب اللہ سمجھے ہوئے ہیں۔

ملا رموزی کی شہرت ان کی گلابی اردو پر مبنی ہے۔ وہی اس کے موجد اور خاتم تھے۔ جس زمانہ میں انھوں نے طنز و اصلاح کی خاطر یہ اسلوب اختیار کیا اُس زمانے میں ہر اصلاحی قدم خشک و غلط سمجھا جاتا اور اس کے معنے قوم کی حالت زار پر آنسو بہانے کے لئے جاتے تھے ملا صاحب نے اپنی جودت اور فکر کی جدت سے خشکی اور آنسوؤں کو طنز و مزاح کے لطیف پیرائے میں بدل دیا۔ انھوں نے گلابی اُردو کی ہیئت کو وہ مواد بخشا جو طنز و مزاح سے بھرپور تھا۔ انھوں نے ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر قلم اٹھایا اور اس خشک اور بنجر میدان کو زعفران زار بنا دیا۔ طنز و مزاح کا بے پناہ امتزاج جو ان کی تحریروں میں تھا اُن کے مرنے

کے بعد اب اُسے آگے لکیر کوئی چلنے والا نہیں۔ ان کی تحریروں میں طنز کے نشتر جگہ جگہ پوشیدہ ہیں لیکن انھوں نے کوئی نشتر ایسا نہیں چبھویا جس سے پڑھنے والا تلملا جائے۔ انھوں نے پہلے ظرافت کے کلوروفارم سے اعصاب کو ماؤف کیا۔ پھر نشتر لگایا۔ کانگریس نے جب پہلی مرتبہ وزارتیں قبول کیں تو ملا صاحب نے ان لفظوں میں تبصرہ کیا۔

"پس یہ ہیں اسباب قبول کرنے وزارتوں کے کہ بہ سبب افلاس کے نرخ اونچا ہوگیا ہے ستیہ گرہ اور بھوک ہڑتال کا۔"

یہ فقرہ ملا رموزی کی فن کاری کا نمائندہ ہے انھوں نے گلابی اُردو سے بڑے بڑے کام لئے ہیں سنجیدہ باتوں کے لئے صفحات درکار ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اندیشہ ہے کہ خدا جانے لوگ اِن باتوں کو سنیں نہ سنیں انھیں ملا رموزی نے چلتے پھرتے فقروں میں بیان کردیا اور اس اعتماد کے ساتھ کہ لوگ پڑھنے کے لئے مجبور رہیں۔ یوں تو گلابی اُردو میں ملا صاحب نے "ہر قسم کے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے لیکن چند موضوعات خاص ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن کی مخالفت جدید طریق تعلیم کی تکذیب مسلمانوں کو شعائر اسلام کی دعوت وہ شرقیت کی حمایت میں اس درجے شدت سے کام لیتے ہیں کہ اُن میں انگریزوں کے لائے ہوئے کھیل ہاکی اور فٹ بال سے بھی چڑھ ہے۔ انھیں مغربی لباس ایک آنکھ نہیں بھاتا انھیں میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا بُرا معلوم ہوتا ہے انھیں مغربی فرنیچر سے سجے ہوئے کمرے زندانِ غلامی نظر آتے ہیں۔ وہ دوڑتی ہوئی کاروں اور گونجتے ہوئے ریڈیو کو افلاس کا پیش خیمہ مانتے ہیں۔

دراصل نثر کے میدان میں وہ کسی حد تک اکبر الہ آبادی سے ملتے جلتے خیالات رکھتے ہیں کیونکہ اکبر الہ آبادی کے یہاں بھی جگہ جگہ مغرب پرستی سے ایسا ہی تنفر ملتا ہے۔ وہ نہایت اطمینان سے برطانوی پارلیمنٹ کا مذاق اڑاتے ہیں لیڈروں کی ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کرتے ہیں مسلم لیگ کی مخالفت کرتے ہیں مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں لیکن ان کی نکتہ چینی کا انداز کچھ ایسا دلکش تھا کہ نہ کبھی انگریزی راج نے اُن سے باز پرس کی اور نہ مسلم لیگ اُن سے الجھی اور یہ سب ان کی گلابی اُردو کا اعجاز تھا۔ اس اسلوب بیان کے ساتھ ساتھ اُن کا انداز خطابت بھی بڑا انوکھا ہوتا تھا مثلاً

”اے دودھ کی طرح سفید لباس والے طلباء“ یا ”اے حد سے زیادہ اولاد والے“ ان کے اس انداز تخاطب سے مخاطب اس درجہ مرعوب ہو جاتا کہ اس کے بعد ملا رموزی جو سخت سے سخت بات بھی کہتے وہ انگیز کرتا چلا جاتا انگیز ہی نہیں بلکہ جس پر وہ نکتہ چینی کرتے ہیں وہ بھی اُسے پڑھ پڑھ کر مسکراتا ہے۔

ملا رموزی کے طنز میں ایک تشخص ہے باوجود کانگریسی ہونے کے انھوں نے ایک سچے طنز نگار کی حیثیت سے کانگریس کو بھی معاف نہیں کیا بلکہ وہ اپنی ذات پر بھی طنز کرنے میں نہیں چوکتے تھے۔ اور یہی پہچان ایک کامیاب طنز نگار کی ہے۔ ان کے طنزیہ مضامین میں نہ کوئی پلاٹ ہوتا ہے اور نہ وہ اس کے لئے کوئی اہتمام کرتے ہیں اُنھیں ہر جگہ ہنسنے ہنسانے کا پہلو نظر آتا ہے چاہے کسی ادبی محفل کا ذکر ہو یا زکام کا وہ واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ ایک مضحکہ خیز سین نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ ان کی ظرافت

ان کے انداز بیان میں پوشیدہ ہے وہ کسی واقعہ کو نمک مرچ لگا کر نہیں بیان کرتے بلکہ اسلوب بیان کے ذریعہ ایک مزاح پیدا کرتے ہیں اسی لئے اُن کے یہاں آورد کم اور آمد زیادہ ہے۔ جتنا جتنا وہ جذبات کی گہرائیوں میں جاتے ہیں اتنا ہی پڑھنے والے کو ہنسی آتی ہے۔ وہ "روزمرہ" لکھتے ہیں مگر بعض اوقات اپنی رو میں وہ چیزیں بھی لکھ جاتے ہیں جو انھیں نہیں لکھنا چاہئے۔ اسی وجہ سے بعض جگہ اُن کے یہاں عریانی پیدا ہو جاتی ہے کسی موضوع کے دماغ میں آتے ہی ان کی تخئیل میں ظرافت کے سوتے ابلنے لگتے ہیں وہ ادھا دھند ظرافت کے وار شروع کر دیتے ہیں جس سے بہت سی بے تکی باتیں بھی ان کے قلم سے نکل جاتی ہیں۔ چونکہ وہ فطرتاً ظریف ہیں اس لئے عبارت میں شگفتگی اور برجستگی کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ان کی زبان میں پختگی اور لہجہ ہے۔

گلابی اُردو کے علاوہ جس کے اُردو ادب میں وہ امام کی حیثیت رکھتے ہیں ان مضامین کی ظرافت کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"خدا جانے یہ کنگ پرائمری پڑھے ہوئے ہندوستانی اپنے قومی لباس کو چھوڑ کر کوٹ پتلون کس جذبہ کے ماتحت استعمال فرما رہے ہیں اور تو کچھ نہیں ملباس کی اس یکانگت سے ہمیں یہ تکلیف ہوتی ہے کہ ہم ہر پتلون پوش کو مسلمان سمجھ کر السلام علیکم کہہ گذرتے ہیں۔ بس اس اسٹیشن پر ایسے ہی ایک ہندو بھائی ہمارے ڈبے میں عین اس وقت گھس پڑے جب ہم صبح کے ناشتے کے لئے ڈھائی آنے پاؤ والی پوریاں لوگوں کی نظریں بچا کر لینے کے لئے پلیٹ فارم

پر گھوم رہے تھے۔ انھوں نے ڈبہ ذرا خالی پاکر ایک سیٹ پر شیا
انگریزی وضع کا بستر بچھایا اور مع کوٹ پتلون اس پر لیٹ گئے
اور ایک کتاب کھول کر سینے پر تان لی۔ پھر ایک پتلون کی جیب میں
لیٹے لیٹے اس طرح ہاتھ ڈال لیا گویا سر آسٹن چیمبرلین وزیر خارجہ
وکٹوریہ اسٹیشن لندن سے جمعیتہ الاقوام کی شرکت کے لئے اپنے
خانے کے اسپشل میں جنیوا جا رہے ہیں کبھی کبھی پتلون کی جیب سے
ہاتھ نکال کر سر سہلا لیتے تھے گویا کسی بڑے ہی زبردست سیاسی
معاہدے کو ملاحظہ سے حل فرما رہے ہیں"

ملا رموزی چونکہ بغیر موضوع اور الفاظ کا انتخاب کئے لکھنے کے عادی ہیں
اسی لئے بعض بعض جگہ ان کی زبان میں ڈھیلا پن پیدا ہو جاتا ہے اور محل اور موقع
کی مناسبت باقی نہیں رہتی وہ چونکہ ایک ادیب، صحافت۔ اور ظرافت نگار سب
کچھ تھے اس لئے ان کے مضامین مذہب۔ سیاست۔ معاشرت۔ تہذیب و تمدن
اور قومیت سب ہی پر ہیں اور ان میں ان کے ظریف اور شوخ قلم نے بحث کی
ہے ان کے بہت سے مضامین پر شوکت تھانوی کے مضامین کا شبہ ہوتا ہے
جس طرح شوکت روزمرہ کے واقعات کو مزاحیہ رنگ دے کر پیش کرتے ہیں اُسی
طرح ملا رموزی بھی مخصوص موضوعات کے قائل نہیں۔ اگرچہ وہ ظرافت کے کسی اصول
کو مدنظر نہیں رکھتے لیکن لکھتے وقت کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ان کے پیش نظر رہتا ہے
ان کے اُن مضامین میں جن میں وہ معاشرت کے عیوب پر طنز کرتے ہیں ایڈیسن
کا شبہ ہوتا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری ان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"ان کی کسی تحریر کا مقصد ہمارے مذموم روایات کی برائیوں کا استیصال ہے کسی کے ذریعہ عاری حالت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن وہ اڈیسن کی طرح ہمارے معاشرتی عیوب بے نقاب کرتے ہیں "

سلطان حیدر جوش اپنے ایک مخصوص فلسفیانہ انداز اور لب ولہجہ کے مالک ہیں وہ بلا کے ذہین، شوخ مزاج اور زندہ دل انسان تھے اگرچہ ان کے یہاں برجستگی اور بے ساختگی کی کمی ہے جس کی وجہ شاید یہ ہے اُن کا انداز تحریر ہی کچھ ایسا ہے کہ جس میں بے ساختگی اور برجستگی کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ وہ شوکت تھانوی۔
پطرس بخاری ایم۔ اسلم کے رنگ کے طنز نگار نہیں ہیں ان کے طنز میں غور و فکر، تجربہ کی گہرائی اور لہجہ کی سنجیدگی اور متانت ہے۔ ان کا طنز برائے طنز نہیں ہوتا بلکہ وہ بڑے نپے تلے فقرے لکھتے ہیں اور الفاظ کے تانے بانے سے ظرافت نہیں پیدا کرتے وہ ہر چیز کا تجزیہ دلائل اور براہین کے ساتھ کرتے ہیں۔ انکی ظرافت عوامی ظرافت سے بلند ہے اُن کے طنز نگارش سے صرف پڑھا لکھا طبقہ ہی محظوظ ہو سکتا ہے۔ ان کے یہاں سطحی رنگینی اور سطحی خیالات نہیں ہوتے اسی لئے اُن کے مضامین عام پسند نہیں ہو سکتے۔ وہ تفنن طبع کی خاطر نہیں لکھتے اسی لئے اُن کی ظرافت ایک قسم کا اکتابی رنگ لئے ہوتی ہے۔ اگرچہ اُس میں زور اور روانی کی کمی نہیں مگر اس کے باوجود اس میں ایک قسم کی گرانی سی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ اُس میں مصنوعیت کی بو نظر آتی ہو ان کا طنز

بہ اعتبار لطافت و سنجیدگی بہت کچھ سجاد انصاری کے طنز سے مشابہ ہے۔ صرف پختہ کاری کا فرق ہے سجاد انصاری کے یہاں ان کی جیسی پختگی نہیں وہ پہلے طنز نگار ہیں جنھوں نے مغربی ظرافت کو مشرقی رنگ ظرافت میں سمونے کی کوشش کی ہے وہ اپنے طنز میں فلسفہ سے مدد لیتے ہیں ان کے طنز کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"جس وقت سے اسکول اور نئی یونیورسٹی نے جنم لیا۔ سنسر کی ذات نے بھی اس دائرہ میں بشکل ممتحن میں جلوہ فرمایا۔ جس قدر تعلیم کی تیز روشنی کے ساتھ طلباء کی تعداد بڑھتی گئی اسی نسبت سے جز و سنسری ممتحن کی ذات و صفات پر غالب آتا گیا چنانچہ فی زمانہ اگر تعلیم اس حد پر پہنچ گئی ہے کہ قلی بھی انٹرنس پاس سے کم نہیں لیا جاتا۔ تو ممتحن کا فعل قطع و برید بھی اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ اگر سو لڑکے انٹرنس میں شامل ہیں تو ایم۔ اے پاس کرنے تک بلا مبالغہ صرف ایک ذات واحد رہ جائے گی اور اگر اس سے آگے قدم بڑھایا گیا تو شاید سنسر تعلیم کی جرح قطع و برید کر سیر کرنے کے لئے فردوس بریں کے رہنے والے تعداد کو پورا کرنے کی خاطر طبقۂ اسفل کی طرف تشریف لیجا کر شریک امتحان ہوں گے!

ہر چیز کے لئے ایک خاص حد مقرر ہے اور جب کوئی چیز اپنی حد مقررہ سے متجاوز ہو جاتی ہے تو سنسر کی ذات قاطع اور موزوں شکل میں جلوہ گر ہو کر ضروری اصلاح کا فرض پورا کر دیتی ہے انسانی آبادی ہمیشہ رو بہ ترقی ہے اس لئے جب کبھی اور جہاں

کبھی یہ آبادی مردم شماری کے معین حدود سے بڑھ جاتی ہے تو فوراً حسب رفتار ترقی اس کی قطع برید ہو جاتی ہے "حسب رفتار ترقی" سے یہ مطلب ہے کہ جس حصہ ملک میں دو افراد انسانی کی باہمی کوشش سال بھر میں صرف ایک تیسرے وجود کو پیدا کر سکے وہاں سنسر کی روح محض وبائی موسمی رنگ میں تھوڑے سے اجسام کا قطع وقمع کر کے اعداد کی اصلاح کر دیتی ہے اور جس طبقہ مردم خیز میں ایک اور ایک مل کر گیارہ ہو جاتے ہیں وہاں سنسر کی ذات کبھی جنگ تباہ کن کی شکل میں بلائے آسمانی کی طرح نازل ہو کر درجن کے درجن لمحوں میں فنا فی الحرب کر ڈالتی ہے"

ایک دوسرا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"پھر انسان نے گاڑی بنائی تو اس کا الٹ جانا اور زیادہ مہلک چیز وجود میں آئی جب ریل نے دنیائے وجود میں قدم رکھا تو ریل سے لڑ جانے کا سخت مہلک حادثہ بھی ساتھ ساتھ پیدا ہوا۔ مختصر یہ کہ انسان جس قدر راہ آرام و آسائش حاصل کرنے کے زور میں آگے بڑھتا جاتا ہے پھر اسی قدر تکلیف اور مشکلات حائل کر لی جاتی ہے یہی حالت سوسائٹی کی ہوئی وہ جس قدر آگے بڑھتی گئی پابندی اور دھوکہ سے گو خلاصی حاصل نہ کر سکی مگر اس کی ترقی ابھی ختم نہ ہوئی تھی ابھی وہ سوشلزم کی اس حد تک نہیں پہنچی تھی جہاں اس کا پہنچنا مقصد تھا........"

موجودہ مزاح لکھنے والوں میں میاں عبدالعزیز فلک پیما جتنے عمر میں اتنے ہی طنز نگاری میں مشاق اور گرگ باراں دیدہ ہیں "مضامین فلک پیما" میں اُن کے جس قدر مضامین ہیں ان سب کی تان تہذیب، تمدن، معاشرت، شعروادب پر کچھ ایسے دلکش اور لطیف طنزیہ انداز پر ٹوٹتی ہے کہ سماج کی ساری بداعمالیاں چلا اٹھتی ہیں۔"

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

وہ طنز نگاروں میں بڑے مشاق ہیں جن ہیں اُن کے انداز میں ہم کو بانکپن اور گہرائی ملتی ہے۔ وہ دورِ حاضر کے صفِ اول کے طنز نگار ہیں۔ ان کی زبان شگفتہ اور سلیس ہوتی ہے اُس میں تفکر اور ادبیت دونوں کا امتزاج ہے۔ اُن کا ایک مخصوص لہجہ ہے ان کے مزاح کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

(دقتیں)

"نرم دل ہونا بھی کیا مصیبت ہے!

دن کے نو بج جاتے ہیں مگر بستر میرا پیچھا نہیں چھوڑتا کبھی کہتا ہے ایک انگڑائی تو اور لے لو۔ کبھی کہتا ہے۔ آخر جلدی کیا ہے چار بھی لیٹے لیٹے نوش کیجئے لیجئے اس ایک تکیے کو بغل کے نیچے دوہرا کر کے رکھیئے اور دوسرے کو زانو کے نیچے دبائیے تاکہ فرش کی سختی محسوس نہ ہو اور میز کی طرف جھک جائیے۔

بے وجہ دل دکھانا میرے مذہب میں کفر ہے چنانچہ بستر کا کہا ماننا ہی پڑتا ہے ایک دن جو چار پیتے پیتے کچھ غنودگی سی

آگئی تو کس نظر محبت سے سفید چادر میرے پاؤں سے لپٹی جاتی کی ایک خوبصورت بیل جو تکیہ کے غلاف پر تھی وہ تو بالکل میرے تکیے پر نثار ہو گئی اس صدق نیاز سے مجبور نہ ہو جاؤں تو کیا کروں۔ ایک گھنٹہ روزانہ اٹھتے اٹھتے ابستر کی نذر ہو ہی جاتا ہے۔ شکر ہے کہ گھر میں مجھ پر کوئی تنقید کرنے والا نہیں۔"

ایک دوسرا نمونہ اُن کے "میاں رحموں" سے ملاحظہ ہو۔

"حکما فرماتے ہیں کہ کسی کا دولتمند ہونا خود اس کے لئے اور نیز قوم کے لئے بڑا بھاری بوجھ ہے۔ بعض تو سرے سے دولت مند خاندان میں پیدا ہونے کے ہی مخالف ہیں اور اسے بدقسمتی خیال کرتے ہیں۔

اطبا کی درفشانی یہ ہے کہ بے خوابی۔ سوء ہضمی و ہیجوں قسم بیسیوں دیگر جسمانی سمیات کے لئے صرف غربت ہی تریاق ہے صلحی کی نصائح کا لب لباب بھی یہی ہے کہ جتنی دیر میں ارل دول اپنی شاندار قبروں کے نیچے سے بمشکل جنبش کر سکیں گے اتنی دیر میں مانگے تانگے کے کفن والے جنت میں داخل ہو کر حوروں سے پاؤں دبواتے ہوں گے گویا خوش قسمتی صحت اور اخروی فلاح کا زیادہ تر دار و مدار ناداری پر ہے۔ ایک شخص نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اللہ میاں کو غریب مسکین بہت پسند ہوں گے جو اس قدر سال بہ سال اُن کو پیدا کرتا رہتا ہے۔"

"فرانس و ہندوستان ساری دنیا میں سب سے چالاک ملک ہندوستان ہے
جسے یہ باور نہ ہو ہندوستانی بیوی سے شادی کر کے خود آزما لے آج شادی کی
کل بچہ۔ بہ قول اس کی تقریب ساتھ کے ساتھ ہو رہی۔ پھر اپنا
مرنا اس قدر چالاک بیویاں ہیں کسی اور پر شوہر کو مرنے کی فرصت
ہی نہیں دیتیں"

عظیم بیگ چغتائی ظرافت کے میدان میں بہت بعد میں آئے مگر بہت جلد
چھا گئے اور ان کو ویسی ہی مقبولیت حاصل ہوئی جیسی کہ شوکت تھانوی کو حاصل ہوئی
ان کو واقعہ نگاری میں ایک خاص ملکہ ہے ان کی ظرافت کے سوتے واقعات کے اتار
چڑھاؤ سے پھوٹتے ہیں وہ اپنے پلاٹ کے لئے مواد روزمرہ کے واقعات سے فراہم
کرتے ہیں اور ان میں ظرافت کے گل بوٹے کھلاتے ہیں۔ ان کی ذہنی اور جذباتی مزاج
کا پس منظر ہمیشہ اصلاح ہوتا ہے ان کے یہاں طنز سے زیادہ ظرافت ہے مگر
وہ اصلاح کے معاملہ میں مولوی یا خطیب کا پیرایہ نہیں اختیار کرتے بلکہ مشاہدہ کی
باریکی اور تخیل کی رنگینی سے مدد لے کر اپنے مزاح میں تاثر پیدا کرتے ہیں۔ وہ
مشرقیت کے دلدادہ ہیں مگر اکبر الہ آبادی کی حد تک نہیں وہ دوسروں کی کمزوریوں
کا تجزیہ اس انداز میں کرتے ہیں کہ اس سے دوسروں کے دلوں میں گدگدی پیدا
ہو۔ ان کی عبارت میں بے ساختگی، رنگینی، زبان میں لچک اور سادگی ہے۔ ان کی
ظرافت میں زہرناکی نہیں بلکہ ہلکا پھلکا مزاح ہوتا ہے۔ ان کی خامہ کا ایک ٹکڑا
ملاحظہ ہو۔

"تین چار روز تک خانم سے سخت ترین جنگ رہی یعنی خاموش جنگ۔ اُدھر وہ چپ ادھر میں چپ۔ خانم کی مددگار استانی جی اور میرے مددگار خانصاحب پانچویں دن یہ شطرنج دوبھر معلوم ہونے لگی۔ میری سپاہ کمزوری دکھا رہی تھی۔ جی تھا کہ الٹا جاتا تھا۔ خاموش جنگ سے خدا محفوظ رکھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے گیس کی لڑائی ہو رہی ہے۔ غنیم کا گیس دم گھوٹے دیتا تھا خاں صاحب طرح طرح کے حیلے تجویز کرتے تھے مگر جناب اس گیس کی لڑائی میں کوئی تدبیر نہ چلتی تھی خاں صاحب ماہر فنون جنگ تھے مگر جرمن گیس کا جواب توپ اور بندوق نہیں دے سکتی۔ یہ انھیں معلوم نہ تھا وجہ یہ ہے کہ وہ پرانے زمانہ کی لڑائیاں لڑے ہوئے۔ بیچارے کیا جانیں کہ نازنینی کا گیس کیا بلا ہوتی ہے۔ میری کمزوری پر دانت پیستے تھے کہتے تھے۔ نہ ہوا میں .... دکھا دیتا۔

"خاں صاحب اول تو خود جنگی آدمی اور پھر جنرل بھی اچھے۔ مگر جناب جب سپاہی ہمت ہار جائے تو جنرل کیا کرے۔ چھ دن گذر گئے اور اب میں جنگ مغلوبہ لڑ رہا تھا۔

بہت کوشش کی مگر ہار ہی گیا۔ شرائط بھی بہت خراب تھیں شاید معاہدۂ ورسیلز جس طرح ترکوں کے لئے ناقابل پذیرائی تھا اسی طرح میرے لئے بھی مگر بقول کسے بزور شمشیر و بنوک سنگین مجھکو مجبوراً صلحنامہ پر دستخط کرنا پڑے اور صلحنامہ کی سخت ترشرط

ذرا ملاحظہ ہوں۔

(۱) خانصاحب سے تمام تعلقات دوستی منقطع کردوں گا۔ وہ گھر پر آئیں گے دکھلوا دوں گا کہ نہیں ہوں۔ ویسے حقہ وغیرہ اُن کے یہاں جائے گا اور آئے گا۔

(۲) شطرنج کھیلنا بالکل بند۔ اب کبھی شطرنج نہیں کھیلوں گا خصوصاً رات کو تو کھیلوں گا ہی نہیں۔

(۳) شطرنج کے علاوہ تاش بھی نہیں کھیلوں گا سوائے اتوار کے رات کو وہ بھی نہیں۔

(۴) رات کو دیر کرکے آنا شطرنج کھیلنے رہ جانے کے برابر متصور ہوگا کوئی ثبوت ملے بغیر تصور کر لیا جائے گا کہ شطرنج کھیلی گئی کوئی عذر تسلیم نہ کیا جائے گا۔

پانچویں اور چھٹی شرطیں خود بیان کرنا پسند نہیں کرتا۔ ساتویں شرط یہ تھی کہ اگر اس معاملہ کی پابندی نہ کی گئی تو ہم تم اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش۔

خانصاحب سے میں نے اپنی شکست اور شرائط صلح کا ذکر صاف صاف تو نہیں کیا مگر اتنا ضرور تسلیم کیا کہ میرے برابر اتالی جی کے لڑکے سے جیدا نے جاتے رہے۔ پھر صلح کا ذکر کیا۔ خانصاحب تجربہ کار آدمی تھے۔ دانت نکال کر انھوں نے ران پر ہاتھ مار کر پہلے دنیا بھر کی لڑاکا بیویوں کو گالیاں دیں اور پھر کہا۔ میاں ملتے ہو، مجھ سے

باتیں بنانے آئے ہو۔ بیوی کی جوتیاں کھا رہے ہو........ شطرنج کھیلیں گے...... یہ شطرنج ہے!...... ہونہہ...... سر پکڑ کر روؤگے...... گھر والی کو اتنا سر پر نہیں چڑھاتے...... تم جا نو تمہارا کام...... جب کبھی ملاقات ہو گی علیک سلیک کر لی بس لکھ لو..."

خانصاحب کی گفتگو سے کچھ پھریری سی آئی۔ گھر میں آیا تو خانم کو پھول کی طرح کھلا پایا...... لاحول ولا قوۃ"

عظیم بیگ کے یہاں آورد نہیں اور نہ وہ لفظوں کو توڑ مروڑ کر ظرافت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ زندگی کی جلتی پھرتی تصویروں کا جائزہ لیتے ہیں جن کے پیچھے اہم سنجیدگی اور تبصرۂ حیات کے پردے جھلملاتے رہتے ہیں اُن کے کرداروں کی حرکت پڑھنے والے کے دل ودماغ پر ایک انبساطی اثر ڈالتی ہے اُن کے یہاں افسردگی اور جمود کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ سوسائٹی کے ہر پہلو پر کھل کر تنقید کرتے ہیں اُن کے قہقہوں میں اصلاح اور عمل کی کرنیں لپٹی ہوتی ہیں وہ ہندوستانی تصویروں سے اپنے مرقع کو زینت دیتے ہیں۔ نہ تو وہ غیر ملکی زبان سے مدد لیتے ہیں اور نہ غیر ملکی کرداران کے پیش نظر رہتے ہیں۔ ان کی زبان ٹکسالی اور صاف ستھری ہے۔ ملاؤں اور نام نہاد مذہب پرستوں پر وہ بڑے دلکش انداز میں چوٹ کرتے ہیں ان کے طنز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ گہرے سے گہری چوٹ کر جاتے ہیں مگر کوئی شخص اس پر ناگواری محسوس نہیں کرتا۔

عشرت رحمانی نے شوکت تھانوی کے بارے میں بڑے مزے کی بات لکھی کہ

"حقیقت یہ ہے کہ زندہ دلی کے ایک دلکش اور نفیس حادثہ کا نام
"شوکت تھانوی" ہے۔"

اور یہ واقعہ بھی ہے۔ دراصل شوکت تھانوی کی شہرت ان کی سودیشی ریل سے ہوئی جو اُس زمانے میں جس زمانے میں کہ وہ لکھی گئی ایک بھرپور طنز کی حیثیت رکھتی تھی آج بھی وہ ان کی شوخیٔ تحریر کا ایک اچھا نمونہ شمار کی جاتی ہے شوکت فطرتاً بذلہ سنج اور ظریف ہیں لکھتے لکھتے وہ اُس درجہ پہنچ گئے ہیں کہ بحیثیت ظریف کے لوگ ان کی مثالیں دینے لگے ہیں۔ ان کے یہاں طنز بہت کم ہے۔ شیش محل میں انھوں نے اپنے دوستوں کے جو ظریفانہ خاکے لکھے ہیں اُن سے ان کی ظرافت میں خاصی ادیبانہ شان ظاہر ہوتی ہے عظیم بیگ چغتائی کی طرح اگرچہ وہ بھی روز مرہ واقعات کو ظریفانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں مگر ان کی بذلہ سنجی اور ظرافت عظیم بیگ چغتائی کی ظرافت سے زیادہ لطیف اور زیادہ بھاری بھرکم معلوم ہوتی ہے اُن کا شمار دورِ حاضر کے ایک مشاق ظرافت نگار میں ہے وہ اپنی ظرافت میں واقعات سے کم اور فقروں اور لفظوں سے زیادہ کھیلتے ہیں۔ اُردو کے موجودہ لکھنے والوں میں وہ ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ پروفیسر کلیم الدین اپنے مجموعہ سخنہائے گفتنی کے ایک مضمون میں ان پر اپنی خفگی اور ناراضگی کا اظہار ان الفاظ سے کرتے ہیں۔

"مزاح نگاری کی حیثیت سے اس وقت پطرس، رشید احمد صدیقی شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی مرحوم کافی شہرت رکھتے ہیں، شوکت

تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی اپنی شہرت کے باوجود کبھی کوئی اہمیت
نہیں رکھتے اصل یہ ہے کہ ان دونوں کی ذہنیت ترقی کے مدارج
طے کرنے کے دوران میں ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئی ہے
اور یہ ذہنیت وہی ہے جسے انڈر گریجویٹ ذہنیت کہتے ہیں۔
دونوں استعداد بہم پہنچانے سے پہلے مصنف بن بیٹھے۔ ان کے
کارناموں کو اگر کسی طالب علم کا کارنامہ تصور کیا جائے تو لائق تحسین
ہے اس سے زیادہ وقعت دینا تنقید اور مذاق صحیح پر دانستہ
ظلم کرنا ہے ان کی خامی کا الزام ایک حد تک پڑھنے والوں پر بھی
عاید ہوتا ہے ان کے مضامین اتنی قدر مشہور ہوئے ان کی اس قدر
مانگ ہوئی کہ انھوں نے سمجھا کہ تصنیف کی دشوار منزلوں پر انھوں نے
کامل اختیار حاصل کر لیا ہے۔ جس نے مزید کاوش کی ضرورت
نہیں دونوں کو شروع سے خرمن جمع کرنے کی فکر دامن گیر ہوئی
حالانکہ ان کی کھیتی میں خود رو گھاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ انھیں لازم
تھا کہ جو کچھ وہ لکھتے اسے مشق سمجھتے۔ لکھتے اور لکھ کر پھاڑ دیتے
اور آہستہ آہستہ مطالعہ مشاہدہ غور و فکر میں وسعت باریکی اور گہرائی
پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔"

مذکورہ بالا تنقید پر کہیں سے تنقید کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ پروفیسر مذکور کو ان دونوں مزاح نگاروں کی یا تو شہرت سے تکلیف پہنچی ہے یا
پھر کسی نجی اختلاف کی بنا پر انھوں نے اپنے دل کا غبار نکالا ہے۔ ان کی ذہنیت کو

انڈر گریجویٹ بتانے سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر اُس شخص کو لائق اور قابل سمجھتے ہیں جو کسی یونیورسٹی کا سند یافتہ گریجویٹ ہو۔ اگر صلاحیتوں کو پرکھنے کا یہ معیار دنیا میں رائج ہو گیا تو پھر ظرافت اور ادب ساری چیزیں برائے سند ہو کر رہ جائیں گی اور ہر سال یونیورسٹی سے نکلے ہوئے گریجویٹ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے ادب اور ظرافت دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ بہر حال شوکت تھانوی ایک اچھے ظرافت نگار ہیں۔ ان کی زود نویسی سے ان کی ظرافت کو یہ نقصان ضرور پہنچ رہا ہے کہ اب جگہ جگہ ان کی ظرافت میں چبائے ہوئے نوالے ملنے لگتے ہیں ورنہ شوکت کی شوخی میں ایک فطری ظرافت پائی جاتی ہے جس میں شگفتگی گدگدی اور قہقہے چھپے ہوئے ہیں شیش محل میں جناب رضا لکھنوی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :۔

"مشاعرے میں ایک دولھا میاں نظر آئے۔ مخمل کی پھولدار شیروانی اُسی کپڑے کی کشتی نما ٹوپی اُسی کپڑے کی دلائی۔ ریشمی موزے۔ چوڑی دار پاجامہ، ہاتھ میں ریشمی رومال، انگوٹھا چھار رنگ۔ چال میں ایک خاص بانا پن۔ اور اداؤں میں بلا کی عروسیت۔ گفتگو کرتے ہیں "الف وہ زبران دو زبراں وہ پیش اُن" کی سی کیفیت۔ کلام پڑھنے میں ریشمی رومال اور ہاتھ کے انگوٹھے میں "اختو بختو" والا ربط اور شعر کے آخر تک پہنچتے پہنچتے چہرے پر انتہائی کرب کے پورے آثار۔ معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے شعر نہیں پڑھا ہے اپنے کلیجے میں چھپا ہوا ایک تیر بمشکل تمام نکالا ہے اور سامعین کے سامنے پیش کر کے خود بیہوش ہو گیا ہے۔ جی چاہا کہ ترس کھا کر شعر پڑھنے سے منع کر دیں معلوم ہوا

کہ آپ سید آل رضا ہیں۔ آخر کار شاعر کے علاوہ انسان کی حیثیت سے بھی آپ سے ملئے قریب سے آپ کو دیکھا۔ محبت کرنے والا دل گھل مل جانے والا اخلاق اور دل لبھا لینے والی ادائیں رکھتے ہیں۔ خیریت یہ ہوئی کہ رضا صاحب مرد ہیں ورنہ خود رضا صاحب کو نہیں معلوم

ع خدا جانے یہ دنیا پھر کبھی ہوتی یا نہیں ہوتی

خوب کہتے ہیں۔ کلام میں درد ہی درد ہے کبھی کبھی چپکے سے شوخی بھی کرتے ہیں۔ اگر وکالت نہ کرتے ہوتے تو مولانا صفی کے حریف ہوتے یا شاعری نہ کرتے ہوتے تو وکالت میں ڈاکٹر کاٹجو اور سر سپرو سے اُلجھے رہتے۔"

"بیوی کا پرور گیندہ" کے نام سے جو مضمون ہے اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"ان کے گھر پر پہنچکر زیادہ انتظار بھی نہ کرنا پڑا وہ فوراً ہی ایک طشت میں کچھ تخمی آم لئے ہوئے برآمد ہوئے۔ اور ایک عجیب ٹھاٹھ سے فرمایا "لو کھاؤ" لاش پر جھپٹنے والے گدوں کی طرح ہم آموں پر جھپٹ پڑے حالانکہ آم بہت تھوڑے تھے اور کچھ مزے میں کبھی بہت زیادہ اچھے نہ تھے لیکن ہم تو یہ سمجھ کر آم کھا رہے تھے کہ "بڑے موذی کو مارا" اور تعریف کرتے جاتے تھے۔ خیر ہم تعریف کرتے یا نہ کرتے ہمارے میزبان صاحب خود ہی تعریفوں کے پل باندھے ہوئے تھے "دیکھو! یہ آم چھوٹے ضرور ہیں اور ان کا ریشہ بھی بہت بڑا ہے۔ لیکن عجیب پرکیف آم ہیں۔ تم ان کی کھٹاس پر نہ جاؤ اور نہ رس کی

کمی پر غور کرو بلکہ یہ دیکھو کہ لطیف آم ہیں۔ مگر یار بڑے گراں ہیں۔ وہ
دیکھو یہ آم والا ہمارے یہاں بہت رعایت سے آم دے جاتا ہے۔
اور تمہاری بھاوج روزانہ اسی قسم کے آم کھا لیتی ہیں اس لئے اس نے
بمشکل تمام چھ آنے سیکڑہ یہ آم دیئے ہیں ورنہ منڈی میں ایک روپیہ
سیر نہیں مل سکتے تھے۔ بھائی اسی لئے میں نے دسہری اور سفیدہ
وغیرہ سب کو چھوڑ کر ان ہی کو پسند کیا ہے۔ واللہ سب آموں کا ان میں
مزہ ہے گویا شہد کے سربہر گلاس ہیں اور اتنے آم میں گٹھلی تو دیکھو
ماشاء اللہ کتنی بڑی ہے۔"

ان کی "سالگرہ" کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"گھر پہنچنے کے بعد پہلا کام میں نے یہ کیا کہ بیوی کو بلا کر اُن سے پوچھا
آپ کو کچھ یاد ہے آپ کس تاریخ کو پیدا ہوئی تھیں؟
وہ حیرت سے بولیں
"خیریت تو ہے۔ میری تاریخ پیدائش کی آج کیا ضرورت پیش آگئی
کوئی جادو وادو کرانا ہے مجھ پر۔"
میں اس قسم کے غیر سنجیدہ جواب کے لئے اس وقت تیار نہ تھا لہذا پوری
سنجیدگی سے کہا:
"بھئی کچھ ایسی ہی ضرورت ہے۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔"
وہ بدستور اس کو معمولی بات سمجھ کر بولیں۔ "تو بھلا مجھے کیا معلوم کہ میں کس
تاریخ کو پیدا ہوئی ہوں ابھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا

میں نے جھنجھلا کر کہا
لاحول ولا قوۃ۔ یہ بات غور کرنے سے نہیں طے پاتی۔ بلکہ طے شدہ ہوتی ہے بہر حال آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کس تاریخ پیدا ہوئی تھیں۔"
وہ سادگی سے بولی ـــ ہاں مجھے تو پتہ نہیں۔"
وہ حیرت سے بولیں۔ ۴ مارچ کو! یہ آپ کو کیسے معلوم؟
میں نے کہا۔ "بس کہہ جو دیا۔ کہ آپ ۴ مارچ کو پیدا ہوئی تھیں۔ آج ۲۷ فروری ہے اور پانچ دن کے بعد آپ کی سالگرہ ہے۔"
وہ ایک دم چونک کر بولیں۔ میری سالگرہ؟ لو اور سنو بوڑھے منہ مہاسے لوگ چلے تماشے۔ یہ آخر سوجھی کیا ہے؟"
میں نے کہا ـــ! سوجھی نہیں ہے بلکہ یہ طے ہے میں آج ہی کارڈ چھپوا تا ہوں اور آپ پارٹی کے انتظامات کیجئے۔ میں سب کو بلاؤں گا۔ کسی کو نہ چھوڑوں گا۔ ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ان سب نے سالگرہ کی پارٹیاں کر کر کے۔ ایک ایک سے بدلہ لوں گا۔ بہت بن چکا بے وقوف اور بہت دے چکا تحفے۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے میں نے تحفے دیئے ہیں تو وصول کیوں نہ کروں۔
بیوی نے حیرت سے مجھ کو گھورتے ہوئے کہا۔ مگر بیٹھے بٹھائے یہ خیال کیسے آگیا۔
میں نے کہا ـــ ہزار بارہ سو سے کم کے تحفے نہ تھے جو سراج کے لڑکے کی سالگرہ میں سب نے دیئے ہیں وہ چاہے تو نوکری چھوڑ کر کھلونوں

کی دوکان کھول سکتا ہے۔ چھٹانک بھر کے اس لونڈے کو اگر ہزار بارہ سو روپئے کے تحفے مل سکتے ہیں تو آپ کو کیوں نہ ملیں گے تحفے۔ بخدا اس نے دو ڈھائی سو روپئے سے زیادہ اس پارٹی پر صرف نہ کیا ہوگا اور تحفے بٹور لئے ہزاروں کے!"

پطرس بخاری کی ظرافت کا سب سے بڑا کمال اس میں ہے کہ انھوں نے کل دس مضامین لکھکر اُردو ادب میں ایک ایسا مقام حاصل کر لیا جو شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی اور ایم۔ اسلم جیسے زود نویس باوجود فطری ظرافت نگار ہونے کے حاصل نہ کر سکے۔ پطرس کے بیان میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خود نہیں مسکراتے مگر دوسروں کو قہقہے بلند کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں ان کی ظرافت میں ذہانت، طباعی اور مشاہدہ سب ہی چیزیں شامل ہیں۔ اُن کے مغربی کتب کے مطالعے نے ان کی ظرافت میں ایک رکھ رکھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ ان کی تخیل میں بلندی ان کی فکر میں گہرائی اور باریکی ہے ان کا اسلوب بیان پختہ ہے ان کے مضامین ستھری اور شگفتہ زبان میں ہیں اور بعض بعض جگہ انھوں نے چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے ہی البیلے انداز میں ظرافت پیدا کی ہے ان کا طنز واقعات اور ماحول سے پیدا ہوتا ہے ان کی زبان میں کہیں کہیں جو مقامی رنگ ہے وہ ان کی ظرافت کی بھٹی پر چڑھ کر اس طرح نکھر جاتا ہے کہ بہت غور سے مطالعہ کرنے پر وہ دھبہ دکھائی پڑتا ہے۔ ان کے مضمون "مرحوم کی یاد میں" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"میں کچھ دیر تک تو بیٹھا رہا۔ مرزا نے کچھ توجہ نہ کی آخر میں نے

خاموشی کو توڑا اور مرزا سے مخاطب ہو کر بولا۔

مرزا۔ ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟

مرزا صاحب بولے۔ بھئی کچھ ہو گا ہی۔ آخر"

میں نے کہا۔ میں بتاؤں تمھیں؟

کہنے لگے۔ بولو۔

میں نے کہا۔ کوئی فرق نہیں سنتے ہو مرزا؟ کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں ...... کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں! ہاں ہاں میں جانتا ہوں تم ابھی میکھ نکالنے میں بڑے طاق ہو۔ کہدوگے حیوان جگالی کرتے ہیں تم جگالی نہیں کرتے۔ اُن کے دم ہوتی ہے تمھارے دم نہیں لیکن ان باتوں سے کیا بنتا ہے اِن سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں لیکن ایک بات میں میں اور وہ بالکل برابر ہیں وہ بھی پیدل چلتے ہیں اور میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمھارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو۔ بس چپ ہو جاؤ۔ تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔ تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنے ہیں ہمیشہ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے یعنی تمام عمر میری حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں دوسرا اٹھاتا ہوں۔ دوسرا رکھتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں ایک آگے ایک پیچھے۔ ایک پیچھے ایک آگے۔

خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا اس سے حواس بیکار ہو جانے میں تخیل مرجاتا ہے آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔

میں نے از حد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابل توجہ ہی نہیں یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔

میں نے دل میں کہا اچھا مرزا یونہی سہی۔ دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔

میں نے اپنے دانت بھینچ لئے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا میں مسکرا دیا لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لئے بالکل تیار ہو گئے تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

مرزا۔ میں ایک موٹر خریدنے لگا ہوں۔

یہ کہہ کر میں بے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا

مرزا بولے۔ کیا کیا

میں نے کہا۔ سنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں موٹر کار ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں بعض لوگ کار کہتے ہیں لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو اس لئے میں نے دونو لفظ استعمال کر دئیے تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

مرزا بولے۔ ہوں۔

اب کے میں بے پروائی سے سگریٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو
اٹھالیں سگریٹ والا ہاتھ بھی منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹاتا تھا
کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا پھر بولے ـــــــ ہُوں

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے۔ مرزا پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا
تھا کہ مرزا کچھ بولے۔ تاکہ مجھے معلوم ہو کہاں تک مرعوب ہوا ہے۔ لیکن مرزا
نے پھر کہا "ہوں"

میں نے کہا مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکول، کالج اور
گھر پر دو تین زبانیں سیکھی ہیں اور اس کے علاوہ تمہیں کئی لمبے الفاظ بھی
آتے ہیں جو کسی اسکول یا کالج یا شریف گھرانوں میں بولے جاتے ہیں پھر
بھی تمہارا کلام اس وقت ہوں سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جانتے ہو مرزا
اس وقت جو تمہاری ذہنی کیفیت ہے اس کو عربی زبان میں حسد کہتے
ہیں۔

مرزا صاحب کہنے لگے۔ نہیں یہ بات تو نہیں۔ میں تو صرف خریدنے کے
نقطہ پر غور کر رہا تھا تم نے کہا کہ میں ایک موٹر خریدنے لگا ہوں تو میاں
صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لئے روپیہ وغیرہ کی
ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا لیکن روپیہ
کا بندوبست کیسے کرو گے۔

یہ نکتہ مجھے نہ سوجھا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا میں

اپنی کئی قیمتی اشیاء بیچ سکتا ہوں۔

مرزا بولے - کون کون سی مثلاً

میں نے کہا - ایک تو میں اپنا سگرٹ کیس بیچ ڈالوں گا۔

مرزا کہنے لگے۔ چلو دس آنے تو یہ ہو گئے باقی ڈھائی تین ہزار کا بھی انتظام اسی طرح ہو جائے تو سب کام ہو جائے گا۔

پطرس کے بعد کنھیا لال کپور کا شمار ہندوستان کے دور حاضر کے نوجوان طنز نگاروں میں ہے۔ پطرس کی طرح ان کے طنز میں بھی مغربی طنزیات کا رنگ جھلکتا ہے مگر پطرس بخاری کی طرز نگارش سے ان کے لکھنے کا انداز مختلف ہے۔ عظیم بیگ چغتائی کی طرح وہ سماج اور معاشرت کی خامیوں کو اجاگر کرتے ہیں ان کی زبان مقامی رنگ کے اثر سے بوجھل ہے۔ ان کا انداز بہت کچھ اسٹیفن لی کاک اور سوئفٹ مشہور انگریزی طنز نگاروں سے ملتا ہے۔ وہ ساری چیزیں صرف ہنسنے ہنسانے کے لئے ہی نہیں لکھتے بلکہ ان کے طنز میں ایک اجتماعی مقصد ہوتا ہے وہ جس طرح دوسروں کی کمزوریوں پر نگاہ رکھتے ہیں اسی طرح خود اپنی کمزوریوں کا بھی مضحکہ اڑاتے ہیں۔ وہ دوسروں کو ہنسا کر ان کی ہنسی میں خود بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ ان کے مزاح میں ایک ٹھہراؤ اور ایک توازن ہے جو والٹر کے یہاں پایا جاتا ہے۔ ان کے ہر ہر فقرے سے ان کی زندہ دلی اور طبیعت کی شگفتگی پھوٹی نکلتی ہے ان کے مضامین ایک ایسا آئینہ ہیں جن میں ہر اس طبقہ کا انسان جن سے ان کو سابقہ پڑا ہے اپنی تصویر کے خط و خال دیکھ سکتا ہے۔ ان کے مشاہدات قوی اور ان کی فکر میں بڑی وسعتیں چھپی ہیں وہ باتوں باتوں میں نئے نئے

نکتے نکالتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کا مزاح قہقہہ آور ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاحی ہوتا ہے اُن کے یہاں نہ کوئی فلسفہ ہے اور نہ خطابت۔ اُن کا طنز سماج دشمن عناصر ایک اژدہے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر اُن کے بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن میں آمد سے زیادہ آورد ہوتی ہے۔ اور ایسے مضامین غالباً وہ محض مجموعہ کو بھاری بھرکم بنانے کی غرض سے لکھے گئے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ایک اچھے مکالمہ نگار بھی معلوم ہوتے ہیں وہ بعض چیزیں دل سے لکھتے ہیں بعض دماغ سے اور بعض بغیر دل و دماغ کا سہارا لئے یہ چیز ان کے ایک مضمون میں بھی ملتی ہے اور علٰحدہ علٰحدہ مضامین کی شکل میں بھی ملتی ہے۔ "غالب جدید شعراء کی محفل میں" والے مضمون میں انھوں نے پیروڈیز دل سے لکھی ہیں اور مکالمے دماغ سے لکھے ہیں۔ اسی لئے اس مضمون میں ان کی پیروڈیز جو دل سے لکھی ہوئی ہیں ایک بھرپور طنز کا لطف دیتی ہیں مگر مکالموں کا تعلق چونکہ دل سے ہے اس لئے وہ شوخی سے عاری ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"م۔ ن۔ ارشد۔ اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غیظ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غیظ۔ میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

ہیرا جی۔ تو پھر وہی نظم سنا دیجئے۔ جو آپ پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی۔

پروفیسر غیظ۔ آپ کی مرضی تو وہی سن لیجئے عنوان ہے "لگائی"

خون پھر آیا دل زار! نہیں خون نہیں۔

سائیکل ہوگا کہیں اور چلا جائے گا۔

ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن بوسیدہ کے افسردہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمہ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

اس کی مزاح نگاری کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔

"ایک رات کا ذکر ہے ڈیڑھ بجے کا عمل ہو گا یک لخت میں زور سے کھانسا زنانہ وارڈ سے ایک لڑکی نے میری کھانسی کا جواب کھانسی سے دیا چند ثانیوں کے بعد میں پھر کھانسا۔ اس کھانسی کا جواب پھر زنانہ وارڈ سے کھانسی ہی میں آیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ایک دوسرے کو دیکھنے کے بغیر ہماری آنکھیں لڑ گئی ہیں تم کہو گے کہ کھانسی لڑ گئی۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں رفتہ رفتہ وہ لڑکی میرے عشق میں گھلنے لگی"

"تب برکی" کے مصنف جناب آوارہ کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی ان کے دوسرے مزاحیہ مضامین کے مجموعے "اپنی موج" کے مقدمے میں لکھتے ہیں

"یہ ادب و انشا کے انجمن آرا نام کے حضرت "آوارہ" بڑے چھپے

رستم نکلے۔ اپنا اُن کا ساتھ بچپن میں ایک مدرسہ میں رہ چکا ہے۔ ذہین یہ اُس وقت بھی بلا کے تھے کیا خبر تھی کہ ذرّہ کسی دن آفتاب بن کر چمکے گا اور آج کا گم نام کبھی ناموری کے آسمان کا تارہ بن کر نکلے گا!"

"دہلی اور لکھنؤ میں اب بھی بڑا بڑا اہل فن، اہل زبان پڑا ہوا ہے لیکن زبان کے محاورات پر یہ عبور، ادب کے نوک پلک پر یہ قدرت ہر فن اور پیشے کے تلازموں پر، اصطلاحوں پر، استعاروں پر بے تکلف حکومت و صاحبقرانی کی یہ دولت اس وقت شاید ہی کسی خوش نصیب کے نصیب میں آئی ہو"

آوارہ صاحب کی زبان دانی اور ان کی جملہ صلاحیتوں کے بعد طنز و مزاح اور ان کی ظرافت کے باب میں کچھ کہنے سے پہلے اُن کے ایک مضمون "ملک الموت کی دوربین" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"پلنگ پر دوشالہ پڑی میت رکھی تھی، دو چار صبح خیز پڑوسی دروازے پر کھڑے تھے۔ دیوان خانے میں صف ماتم بچھائے، سر جھکائے، منہ لٹکائے، صاحبزادے آیندو روند سے پرسالے رہے تھے۔ اتنے میں پڑوسی سعادت خاں آئے۔ عینک کے گول شیشے گرم آنسوؤں کی بھاپ سے ماند پڑ گئے تھے۔ لڑکے کے سر پہ پیار سے ہاتھ رکھا اور کہنے لگے۔ ہونے والی بات تھی ہو چکی۔ بابا دیر نہ کرو۔ دفتر کا دن ہے لوگ شریک نہ ہوسکیں گے۔" "ہاں خاں صاحب، میں تیار ہوں، دس بجے تک

فراغت ہو جائے گی۔ مولوی فیروز علی بولے: "کیا کفن دفن آ گیا؟"۔
"مولوی صاحب سنئے مرگِ ناگہاں سادی ہے شہادت کے شہید کفن سے مستثنیٰ! لہٰذا تکفین نہ صرف فعلِ عبث اور اسراف بلکہ غیر منطقی۔"
خانصاحب نے یہ مالابدسنی تو مگر نہ سمجھے خاک میاں یہ نئی روشنی کا علم ہے۔ ہم کیا جانیں! ہماری دوڑ، تو سول سروس ریگولیشنز اور اکونٹنٹ جنرل کے گشتی احکام تک ہی ہے۔ اِن مولوی صاحب سے کہو۔"
مولوی صاحب نے کہا: "ہاں بھتیا کوئی امر خلافِ سنت نہ ہونا چاہیئے۔"
"اے قبلہ۔ فرض و سنت کا اب تقدیم پارینہ میں شمار ہوتا ہے زمانہ اپنا پرانا چولا بدل چکا اب خطا معاف اولڈ فیشن کے باقیات الصالحات ہیں ان ہنوز ہی مسائل کو نہ سمجھیں گے،
میں نے حکومت کو اس واقعۂ فاجعہ کا تار دیدیا ہے جواب کا انتظار ہے آتے ہی ....؟
میاں میں سمجھا نہیں۔ وہ تو کسی کے لئے دیے میں نہ تھے حکومت کو کسی کے مرنے جینے سے واسطہ۔ خانصاحب نے کہا۔
مولوی صاحب نے سوال کیا "لاٹ صاحب کو دیا ہوگا؟" ـ "جی ہاں پھر حکومت لاٹ صاحب کا نام نہیں تو کس کا ہے؟ بات یہ ہے کہ مرحوم اوائل عمر ہی سے ایک خود ساختہ بلکہ بے ساختہ لیڈر تھے اور ان کی ارواح سے معافی چاہ کر آج یہ راز فاش کرتا ہوں کہ ایسا ہے ہز مجسٹی کی آنے والی سالگرہ کے موقع پر بین الاقوامی لیڈر تسلیم کئے

جانے والے تھے ان کی رحلت سرکاری نقصان ہے اسی کا مجھے خیال ہوا اب آپ تشریف رکھیں میں دو لقمے ناشتہ کر لوں شب کو سنیما میں دیر ہو گئی تھی۔ یوں ہی آ کے پڑ گیا۔"

میت اُٹھی اور بڑے دھوم دھام سے قبرستان میں اول منزل پہنچا دی گئی ارادہ کہ دم لیکر اس ڈیڑھ گز کی کوٹھری سے نکلوں اور دو زمین کی کرامات دیکھوں کہ خدا جانے کدھر سے دو بزرگوار وارد ہوئے نہ دعا نہ سلام خیریت نہ خیر سلا تحکمانہ انداز سے کہنے لگے "چلو اُٹھو تم سے دو باتیں کرنا ہیں۔" میں نے کہا دو نہیں چار۔ کڑک کر پوچھا تمہارا معبود کون تھا؟ عجیب سوال! یہ میرے خانگی معاملات ہیں آپ کو سوال کا حق؟ کوئی بھی تھا آپ کون؟ کہنے لگے کبھی نکیرین برادرز کا بھی نام سنا تھا۔ سنا تو تھا اور اگر آپ ہی ہیں تو معاف کیجئے گا قائل نہ تھا؟ میں نے کہا یارو۔ اصل یہ ہے کہ ایک ہو تو بتاؤں۔ میں نے تو سینکڑوں کے آگے گردن جھکائی اور ہزاروں کو سجدہ کیا۔"

اتنا ہی سنا کہ دونوں جہاں کا خسارہ اور دونوں ناپید ہو گئے۔"

مذکورہ بالا اقتباس سے آپ نے اندازہ کیا ہو گا کہ آوارہ صاحب کے یہاں کتنا لطیف طنز ہے وہ کتنے مذہبی ہیں کس ماحول کے پروردہ ہیں پرانی قدروں کی ان کی نظروں میں کیا وقعت ہے اور کتنے دلنشیں انداز میں وہ موجودہ فیشن پرستی اور جدید تہذیب پر طنز کرتے ہیں۔ آوارہ صاحب گدگداتے بھی ہیں اور چٹکیاں بھی لیتے ہیں مگر ان کی چٹکیوں کی اذیت ان کے گدگدانے میں گم ہو جاتی ہے۔ ان کو زبان پر اتنی

قدرت ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ لکھنؤ اور دلی کے شریف گھرانوں کی زبان ہی پر قدرت رکھتے ہیں بلکہ لکھنؤ اور دلّی کے پیشہ وروں کی زبان اور اصطلاحات میں وہ گھنٹوں باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے کو چھپانے کی کوشش کی مگر ان کے زمانۂ طالب علمی کے ساتھی پروفسر رشید احمد صدیقی نے جو انھیں پہلے سے پہچانتے ہوئے تھے ان کی کتاب "بے پر کی" پر مقدمہ" لکھ کر ان الفاظ کے ساتھ انھیں "طشت از بام" کر دیا ہے۔

"اس مجموعے میں اُن کا سب سے اچھا مضمون "بے پر کی" ہے ------
اس میں آپ کسی قسم کے حشو و زوائد نہ پائیے گا۔ ہر چیز نپی تلی۔ ہلکی اور سادہ ہے۔ زبان لکھنؤ کے عوام کی ہے جس میں شروع سے آخر تک آمد ہی آمد ہے اِس زبان کو شروع سے آخر تک بڑے بڑے غواص بھی نباہ نہیں سکے۔ اس زبان پر جو قدرت سید صاحب کو ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں وہ اُس زمانہ کے لکھنؤ کے عوام کی اسپرٹ سے آشنا ہیں وہ اس اسپرٹ کو عوام کی زبان سے مصور کرنے میں استادی کا ثبوت دیتے ہیں۔"

یہ واقعہ ہے کہ آوارہ صاحب کی زبان اور بیان دونوں میں وہی مٹھاس وہی شیرینی اور وہی کیف و سرور ہے جو رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد میں ہم کو ملتی ہے۔ یہ بھی طبعاً اپنی ان صلاحیتوں کی طرف سے بے پروا ہیں جیسے کہ سرشار تھے سرشار کے مضامین نثر کتابی صورت میں منشی نولکشور نے چھپوائے اور ان کے مضامین انھیں اطلاع کئے بغیر دوسروں نے چھپوائے۔ سرشار کو شراب نے تباہ کیا ان کو ان کی آوارہ گردی مارے ہوئے ہے دلّی جانے والی اکسٹرنل سروس والوں نے ان

ایسی ریشمی ڈوری میں جکڑ رکھا ہے کہ ابھی تک یہ اُسے تڑانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔
سید صاحب نے بگڑے رئیس ۔ مصاحب ۔ بٹیر باز ۔ مرغ باز ۔ پتنگ باز ۔ چابک سوار
کبوتر باز ۔ شعبدہ باز ۔ زمیں دار ۔ کرخندار ۔ بانکے ۔ پہلوان ۔ لالہ ۔ پنڈت ۔ جوتشی
رکابدار ۔ تنبولی ۔ نیم حکیم ۔ ہیجڑے ۔ بھٹیاری ۔ مشاطہ ۔ مغلانی ۔ ماما ۔ اور استاد جی میں
سے اگر کسی کو چھوڑا ہوتا تو کبھی کہا جا سکتا تھا کہ ان کا تیر دو ایک جگہ خطا کر گیا
مگر ان کے ناوک نے تو مرغ قبلہ نما تک کو تڑپا رکھا ہے ۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں
بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں ان کا ایک مخصوص رنگ ہے جس سے لطف اندوز
ہونے والے بہت سے اُٹھ گئے اور جو بچ رہے ہیں وہ اُٹھتے جا رہے ہیں ۔ انکی
زبان اصطلاحات اور محاورات میں رچی بسی ہوئی ہے اور چونکہ عربی ۔ فارسی کا انکی
عبارت پر غلبہ ہوتا ہے اس لئے صرف پڑھا لکھا طبقہ ہی ان کے مزاح کی بھرپور داد
دے سکتا ہے ۔ آوارہ صاحب کی ظرافت ۔ ہلکی سادہ اور تفریحی ہے جو ہر قسم کے
پیچ تیچ سے آزاد ہے ۔ سرشار کی زبان لکھنے والے گروہ کے یہ آخری فرد ہیں جن کے
بعد سناٹا ہے ۔

طنز و ظرافت کے میدان میں ولایت حسین مبوق ۔ مولانا محمد علی جوہر ۔ عبدالمجید
سالک ۔ سندباد جہازی اور چراغ حسرت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔
ان لوگوں نے ظفر علی خاں کی طرح صحافت میں طنز و مزاح کے پھول کھلائے ۔ مبوق
انگریزی میں بڑے اچھے مزاحیہ مضامین لکھتے تھے ۔ مولانا محمد علی مرحوم کے یہاں
ظرافت میں گرج چمک ہے جو ان کی طرز نگارش کی ایک خاص خصوصیت ہے ۔ چراغ حسن

حسرت کو صحافتی مزاح میں خاص ملکہ ہے۔ ساقی کی صحافتی ظرافت میں ظرافت سے زیادہ طنز ہے۔ امتیاز علی تاج اگرچہ سنجیدہ لکھنے والوں میں ہیں لیکن چچا چھکن لکھ کر انھوں نے ظرافت کے میدان میں بھی ایک مقام حاصل کر لیا ہے۔

امتیاز علی تاج

"چچا چھکن"

"چچا دوا دیتے اٹھ کھڑے ہوئے شیشی ہاتھ میں لیکر لیبل پڑھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ داڑھی کھجلائی۔ پیٹ سہلایا بے تاب تھے کہ کسے امداد کے لئے پکاریں لیکن آج کے دن کسی کی امداد لینا غیرت کو گوارا نہ تھا مجبوراً خود ہی دوا دینے پر آمادہ ہو گئے شیشی رکھ دوا نکالنے کے لئے پیالی لائے۔ کاگ نکالا۔ پہلے تو شیشی کو دانتوں میں پکڑ کر کاگ کو پیالے میں انڈیلنے کی کوشش فرمائی۔ اس کے بعد لاحول کہہ کر کاگ میز پر رکھ دیا اور شیشی سے دوا انڈیلنا شروع کی بوند بھر نکالتے اور آنکھیں چندھیا چندھیا کر خوراک کا نشان دیکھ لیتے۔ ذرا سی دوا نکالنا باقی تھی کہ شیشی زیادہ انڈل گئی ڈیڑھ خوراک نکل آئی۔ چچا نے پیالی ٹیڑھی کی کہ زائد خوراک گرا دیں پھر خیال آیا کہ کہیں ضرورت سے زیادہ گر کر خوراک کم نہ ہو جائے چنانچہ ارادہ کیا کہ زائد دوا شیشی میں ڈال کر اطمینان کر لیں۔ پیالی سے دوا شیشی میں انڈیلی۔ آپ جانتے ہیں کہ پیالی کے چونچ تو ہوتی نہیں کہ دوا سیدھی شیشی میں چلی جائے شیشی کے باہر بہہ کر نیچے گر پڑی۔"

جس طرح علامہ شبلی اردو شاعری میں اپنی چند طنزیہ نظموں کی بنا پر جو انھوں نے مخصوص طور پر ایک مخصوص وقت ایک مخصوص سیاست اور موضوع پر لکھی تھیں طنز نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں اگرچہ ان کا میدان یہ نہیں ہے وہی صورت مولانا نیاز فتحپوری علی عباس حسینی، تمکین کاظمی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، منشی پریم چند کی ہے جو اگرچہ ظرافت سے کوئی مخصوص لگاؤ نہیں رکھتے۔ مگر ان سب کی تحریروں میں جو نمکہ طنز اور شوخی جگہ جگہ ملتی ہے اس لئے ان کا ذکر بھی لازمی ہے مولانا نیاز نے تو باقاعدہ طور پر متعدد مضامین ظریفانہ رنگ میں لکھے ہیں جس میں "چند گھنٹے ایک مولوی کے ساتھ"۔ "دو گھنٹے جنم میں" بہت زیادہ مشہور ہوئیں۔ نیاز صاحب کے یہاں ظرافت سے زیادہ طنز ہے ان کے رومانی افسانوں اور مکتوبات میں جو زبان کے چٹخارے، رومانی لباس میں ملبوس ہو کر پڑھنے والے پر محویت طاری کرتے ہیں وہی ان کے ظریفانہ مضامین میں طنز کا چولا پہن لیتے ہیں۔ نیاز صاحب کے بعد سید علی عباس حسینی کی بعض کہانیوں میں بڑا لطیف طنز ملتا ہے انھوں نے بھی اپنے رنگ سے ہٹ کر ایک مزاحیہ ناول حکیم باقا کے نام سے سرشار کے رنگ میں لکھا اور حقیقت یہ ہے کہ بہ اعتبار زبان وہ اردو ادب میں سرشار کے فسانۂ آزاد کے بعد دوسرے درجہ کی چیز ہے۔ مگر اس کی اول خامی یہ ہے کہ کتاب کے ہیرو حکیم باقا سے جس زبان میں حسینی صاحب نے واقعات بیان کردیئے ہیں وہ خالص علماء کی زبان ہے اور دوسری کمزوری یہ ہے کہ واقعات کے بیان میں اس درجہ غلو سے کام لیا ہے کہ طلسم ہوش ربا کے واقعات اس کے سامنے ماند پڑ گئے ہیں اسی لئے یہ کتاب فسانۂ آزاد کی طرح مقبولیت نہیں حاصل کر سکی اگر حسینی صاحب نے انھی مبالغہ آمیز واقعات کو عوام کی زبان میں بیان کیا ہوتا تو یقیناً یہ کتاب عوام میں فسانۂ آزاد کے

زیادہ مقبول ہوتی۔ پھر بھی پڑھا لکھا طبقہ اس سے بہت زیادہ محظوظ ہو گا۔
دوسرے سنجیدہ لکھنے والوں کی طرح تمکین کاظمی نے بھی بہت سے ظریفانہ مضامین لکھے ہیں مگر چونکہ ظرافت ان کا مخصوص میدان نہیں ہے اور ظرافت سے زیادہ ان میں سنجیدگی ہے اس لئے ان کے مزاج پر علمیت زیادہ غالب ہے ان کے یہاں بھی طنز سے زیادہ ظرافت اور شوخی ہے۔
پریم چند کی طنز نگاری کے بارے میں ہنس راج رہبر ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"پریم چند ایک سنجیدہ انسان تھے اور انھوں نے اپنی تصانیف میں ہمارے سیاسی اور سماجی مسائل کا نہایت سنجیدگی سے نہ صرف تجزیہ کیا ہے بلکہ اپنی دانست کے مطابق ان کا حل پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے لیکن اس وقت اردو داں طبقے کا جو مذاق بن چکا تھا اس سے ایک دم کترا کر گذر جانا ممکن نہیں تھا پھر سیاسی اور سماجی مسائل میں طنز اور مزاح کی پٹ نہ دی جائے تو اچھی سے اچھی تحریر کے خشک دعظ بن جانے کا اندیشہ ہے اور اس میں قارئین کی دلچسپی قائم نہیں رہتی۔ پریم چند نے اس اندیشے کو شروع ہی سے سمجھ لیا تھا یا یوں کہئے کہ اس ادب کے گہرے مطالعہ سے اس کے بہترین اوصاف ان کی طبیعت میں رچ بس گئے تھے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جتنا ان کا موضوع خشک ہوتا ہے اتنا ہی وہ طنز و مزاح کے ذریعہ دلچسپ بنا دیتے ہیں۔"

گوڈوان سے ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:۔

ایک جگہ ٹھاکر کسان کو دس روپئے دینے پر راضی ہو جاتا ہے مگر جب روپیہ دینے کا وقت آتا ہے تو پانچ روپے پکڑا دیتا ہے اس موقع پر منشی پریم چند لکھتے ہیں۔

"یہ تو پانچ ہی ہیں مالک!"

"پانچ نہیں دس ہیں۔ گھر جا کر گننا۔

نہیں سرکار۔ پانچ ہیں

ایک روپیہ نذرانے کا ہوا کہ نہیں ؟

ہاں سرکار

ایک تحریر کا

ہاں سرکار

ایک کاگند کا ؟

ہاں سرکار

ایک دستوری کا ؟

ہاں سرکار

ایک سود کا !

ہاں سرکار

پانچ نگد۔ دس ہوئے کہ نہیں ؟

ہاں سرکار۔ اب یہ پانچ بھی میری طرف سے رکھ لیجئے۔

کیسا پاگل ہے!

نہیں سرکار۔ ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کا نذرانہ ہے۔ ایک روپیہ

بڑی ٹھکرائن کا۔ ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کے پان کھانے کو۔ باقی بچا ایک۔ وہ آپ کے کریا کرم کے لیے۔"

جن سنجیدہ لکھنے والوں کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے، اب ان کے بعض طنزیہ مضامین سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

نیاز فتحپوری۔ (دو گھنٹے جہنم میں)

"میں یہاں سے نکل کر کہاں گیا اور کن کن لوگوں کو عذاب میں مبتلا پایا۔ اس کی تفصیل کسی آئندہ صحبت پر ملتوی رکھتے ہوئے صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جب اس طبقہ میں پہنچا جو صرف شاعروں کے لئے مخصوص تھا تو میر۔ مصحفی۔ ناسخ۔ آتش وغیرہ خدا معلوم کن کن شاعروں سے مل کر غالب کے پاس پہنچا تو وہاں ایک عجیب و غریب لطیفہ انھوں نے سُنایا کہ "جب میرے اعمال کا محاسبہ ہوا اور دوزخ کے قابل نہ سمجھ کر مجھے جنت کے ایک نہایت ہی حقیر حصہ میں لیجا کر ایک ایسے حجرہ میں بند کر دیا جہاں سوائے ایک خشک گملے کے اور کچھ نہ تھا تو مجھ سے دریافت کیا کہ تم اپنی بہت سی آرزوئیں نامکمل چھوڑ کر آئے ہو اور تمہارے بہت سے ناکردہ گناہوں کی حسرت ہنوز داد طلب پڑی ہوئی ہے اس لئے بتاؤ اُن میں سے کوئی ایک پوری ہو سکتی ہے میں نے فرطِ مسرت سے گھبرا کر کہہ دیا کہ "کوئی ایک" میرے منہ سے یہ نکلا تھا

کہ فردوس کے اس حجرہ کو اٹھاکر یہاں دوزخ میں ڈال دیا۔ میں حیران تھا کہ خدایا یہ میری کون سی گنہگاری تھی جو اس طرح پوری کی جا رہی ہے کہ ناگہاں دیوار پر یہ مصرعہ نظر آیا کہ۔

دوزخ میں ڈالدے کوئی لیکر بہشت کو

اب میری سمجھ میں آیا کہ میرے اوپر اس مصرعہ کی وجہ سے یہ عذاب نازل کیا گیا ہے خیر یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا لیکن میری سمجھ میں آجتک یہ نہیں آیا کہ اس شعر کا پہلا مصرعہ "طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ۔" کو سنایا گیا یا نہیں ظاہر ہے کہ وہاں تک یہ بات نہیں پہنچی ورنہ تو مجھے تو فردوس سے بھی بلند کوئی چیز ملنا چاہیے تھی، نہ کہ ایسا حقیر و کثیف حجرہ۔ دا گر جہنم میں نہ ڈال دیا جاتا تو میں خود اس کے اندر آگ جلاکر اس کی گندگی وعفونت کو دور کرتا میں سمجھتا ہوں کہ ان ظاہر پرست ملاؤں نے یہاں بھی اپنا اقتدار قائم کر لیا ہے اور افسوس ہے کہ فردوس بھی رہنے کے قابل نہ رہا۔"

میں نے یہ سن کر کہا کہ آپ کا یہ خیال غالباً درست نہیں کیونکہ میں نے تو آج ایسے ایسے مولویوں اور تہجد گزار بزرگوں کو دوزخ میں جلتے اور سسکتے دیکھا ہے کہ ان کی نسبت کا کبھی گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اعلیٰ علیین سے ایک قدم نیچے اتریں گے۔"

یہ سن کر وہ بہت متحیر ہوئے اور بولے کہ پھر تو دوزخ بھی رہنے کے قابل نہ رہی تمام عمر ان کے صلاح و تقویٰ کے وعظ نے مجھے دنیا میں چین نہ لینے دیا۔ فردوس کا حال معلوم نہیں کہ وہاں میں نے کچھ دیکھا نہیں

جہنم میں آیا تو معلوم ہوا کہ یہ عذاب یہاں بھی موجود ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔
کہو تم یہاں کس سلسلے میں آئے ہو؟"

علی عباس حسینی

(حکیم بانا سے ایک نمونہ)

"حکیم بانا نے انھیں گھور کر دیکھا پھر وہ بولے "نقل کفر کفر نباشد"! اور جب لوگ اُن کی حاضر جوابی سے محظوظ ہوئے تو وہ بولے "میں بانا کا ہاتھ جلاتا اترتا چلا گیا۔ ہال کا مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا اور میں برآمدے کے بلند زینے ہی سے اچک کر اپنے اسپ باوفا کی پشت پر بیٹھ گیا ہوں ہوں۔ ہوں! بادشاہ نے ہال میں پہنچتے ہی کسی فوجی افسر کی کمر سے ریوالور جھپٹ کر کھینچا اور مجھے نشانہ بنانا چاہا لیکن میں نے جھک کر گھوڑے کی گردن سے اپنی گردن ملا دی اور بانا کا ہاتھ برابر چلاتا رہا۔ ہوں ہوں ہوں۔ بادشاہ کے اشارے پر شاہی گارد نے پوری باڑھ ماری مگر ایک تو کسی کی گولی مجھ تک پہنچی نہ تھی دوسرے اگر کوئی پہنچی بھی تو وہ ڈنڈے سے ٹکرا کر وہیں گر گئی ہوں ہوں ہوں۔ میں نے محل کے حدود طے ہی کیے تھے کہ فوجی تیاری کے طبل اور بگل بجنے لگے۔ سپاہی اپنی بارک سے دوڑ کر سڑک پر آگیا اور آہنی پھاٹک کرایا جانے لگا ہوں ہوں ہوں

حکیم بانا نے سب کو ہمہ تن متوجہ پایا تو خود سے رک کر ان کی بے چینیوں سے لطف لیا۔ حقے کے کئی کش کھینچے پان کھایا تھوڑی دیر ہونٹھ ہلائے" پھر بولے ہوں ہوں ہوں میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی عصا سے دو ہاتھ مارے اور وہ زمین پر بچھ گیا۔ کیا مجال کہ ہوا بھی اس کی گرد کو پا سکے ہوں ہوں ہوں۔ ہنوز آہنی پھاٹک آدھا کھلا تھا کہ اس کی گردن اور میرا جسم باہر نکل گیا۔ ہوں ہوں ہوں لیکن گھوڑے کا پٹھا اور دم ابھی اندر ہی تھے کہ پھاٹک

گر اور گھوڑے کے یہ حصے کٹ کر قلعہ کے اندر رہ گئے ! مجھے خبر بھی نہیں کہ کیا حادثہ ہوا میری نظر اس اُٹھتے ہوئے پل پر تھی۔ آہستہ آہستہ ایک ہاڑ کی بلندی اختیار کرتا جارہا تھا ہوں ہوں ہوں گھوڑے نے وہیں سے جست کی اور خندق کے پار چلا اسنے میں سپاہ ٹک کے بالائی حصے سے توپ دغی دھائیں اور گولا گھوڑے کا پورا آدھا جسم اڑا لے گیا ہوں ہوں ہوں مگر میں اس شیر دل گھوڑے کو کہتا ہوں کہ نہ تو اس کے پاؤں لڑکھڑائے اور نہ اس کے صرف نصف ہی باقی رہنے کا مجھے اس وقت تک گمان ہوا جب تک کہ میں اسی دن دمشق نہ پہنچ گیا۔"

دوسرا نمونہ (ارے یہ بندر)

"اسی لئے بندروں کا ایک خاص گروہ جن میں لال بندر کہتے ہیں بھیس بدل کر اس باغ میں آیا اس نے یہاں کے حالات دیکھے اور اپنے بھائیوں کو یہاں کی خبریں پہنچائیں۔ ان لوگوں نے بہت سوچ کے ایک خاص قسم کی لکڑی ایجاد کی جسے ہاتھ میں لیکر وہ جس طرف اشارہ کردیتے بس دھائیں دھائیں کی آوازیں ہوتیں اور اس کے سینے میں سوراخ ہو جاتے لال بندر یہ لکڑیاں لیکر اس باغ میں آئے اور انھوں نے کبھی کھتی بندروں کے ساتھ ہو کر بھوروں میں سوراخ کئے اور کبھی بھوروں کے ساتھ مل کر کھتی بندروں کو چھیلا۔ ان کی لکڑی کا ڈر آہستہ آہستہ سب کے دل میں سما گیا اور انھوں نے تھوڑے دنوں میں سارے بھورے اور کھتی بندروں پر راج قائم کرلیا۔

لال بندر سب سے زیادہ چالاک نکلے انھوں نے اس باغ کو اپنا وطن نہیں بنایا انھوں نے اپنا پچھلا دیس نہ بھلایا۔ وہ شیو کے باغ میں کچھ ہی دن رکے اور وہ جو اچھی سے اچھی چیز میں یہاں پاتے اُسے اپنے دیس ضرور بھیجدیتے۔ انھوں نے باغ کو لوٹ کر اس کے

سارے پھل میوے۔ ترکاریاں اپنے گھر بھیجدیں وہی باغ جہاں کی زمین سونا اگلتی تھی جہاں کے میوے اور پھل خس وخاشاک پر گرتے اور اچھی کھاد بنتے وہی باغ جہاں کا ہرا سی موٹا تازہ آنند کی بانسری بجا تا دکھائی دیتا تھا۔ کنگالوں کا دیس اور سوکھے ڈھانچوں کا دیس ہو گیا۔ ایک ایسا نگر جہاں کے رہنے والے بھوک سے بلبلاتے اور گرے پڑے دانوں پر آپس میں کبوتروں کی طرح لڑتے چنانچہ اسی پیٹ کے کارن بھوڑے اور کنھئی بندر ساری اکڑفوں بھول گئے اور انھوں نے ہر آن لال بندروں کا منہ تکنا اور ان کے اشاروں پر ناچنا شروع کیا"۔

حیات اللہ انصاری

"بہت ہی باعزت"

میں نے سیٹھ جی سے کہا تو وہ جس حالت میں بیٹھے تھے ویسے چلے آئے۔ چچا جان ان کی صورت دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"سیٹھ جی غضب ہو گیا۔ کل صبح چیف انجینیر معائنہ کے لئے آرہا ہے۔

سیٹھ جی یہ سن کر گھبرا گئے اور کہنے لگے۔ "یہ تو برا ہوا کسی بدمعاش نے چغلی کھادی"

چچا جان "میرا بھی ایسا ہی خیال ہے۔ اس وقت مجھے ساٹھ ہزار روپیوں کی ضرورت ہے جس طرح بنے اور جتنے سود اور جن شرائط پر بھی ممکن ہو آپ فوراً مہیا کر دیجئے۔ اس کی ضمانت میری کوٹھیوں اور کاروں میں سے جو چاہے رہن رکھ لیجئے یا خرید لیجئے یا مجھ سے پرونوٹ لکھوا لیجئے بہر حال میں ہر چیز کے لئے تیار ہوں۔ مجھے روپیہ چاہیے"

سیٹھ جی نے معاملہ پر غور کیا۔ پھر بہت شرافت دکھائی اور کہنے لگے۔ "مجھے آپ کی

بدولت بہت کچھ مل چکا ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آج آپ کی حالت سے فائدہ اٹھاؤں آپ کی کوٹھیوں یا کاروں پر قبضہ کر لوں۔ آپ دو سطریں لکھ دیجئے روپیہ حاضر ہے۔"

چچا جان نے اپنے ذہن میں اکام کا پورا نقشہ تیار کر لیا تھا روپیہ پانے ہی سب سے پہلے انھوں نے حکم دیا کہ اجمیر کے فلاں بزرگ کو تار دیدو کہ برا وقت پڑا ہے مزار پر جاکر دستگیری کی درخواست کیجئے پھر وہ خود کار پر بیٹھ کر مزاروں کی حاضری کے لئے نکل گئے۔"

(شکستہ کنگورے)

عبدالرزاق ملیح آبادی

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا شمار ہندوستان کے صف اول کے شوخ صحافت میں ہے آپ مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور زمانہ اخبار الہلال کے ادارہ تحریر میں رہ کر کئی سال تک مولانا کے دست راست رہ چکے ہیں۔ الہلال بند ہونے کے بعد ایک زمانے تک آپ کلکتہ سے اپنا روزنامہ نکالتے رہے مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی طرح آپ کا شمار ان اخبار نویسوں میں ہے جنھوں نے اردو صحافت کو شوخی اور لطافت کے پھولوں سے آراستہ کیا۔ آپ کی تحریر بہت سادہ اور لطیف ہوتی ہے اور انداز بیان بھی بہت کچھ خواجہ حسن نظامی مرحوم کے انداز بیان سے ملتا جلتا ہے مولانا کی طرز نگارش کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ معمولی سے معمولی اور خشک سے خشک موضوع پر بھی اگر قلم اٹھاتے ہیں تو دو چار شگفتہ اور شوخ فقرے ان کے قلم سے نکل ہی جاتے ہیں۔ "کیٹر کی بیتا" کے عنوان سے انھوں نے جو مضمون لکھا ہے اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"خلیل صاحب کے ان دوست نے میری ہر طرح مدارات کی اور میں

ان کا دل سے شکر گذار ہوں۔ صرف شکایت یہ ہے کہ اتنا مشرکی ہونے پر بھی یہ میرے ہم نام ہیں۔ یعنی عبدالرزاق صاحب بجوعلی ہیں، حالانکہ میں سمجھا کرتا تھا کہ یہ ثقیل نام صرف اہلِ سنّت ہی کے حصّے میں آیا ہے مگر بمبئی جاکر معلوم ہوا کہ یہ نام وہاں بہت سستا ہے اور کسی ایک فرقے کی میراث نہیں ہم نام ہونے کی شکایت کا سبب یہ ہے کہ یہ نام زبان پر بہت ہی گراں گزرتا ہے تعجب ہے کہ والدین نے ایسا بھدا اور بدھا خرانٹ نام پسند کیسے کر لیا! ہمارے گھر میں ناموں کا معاملہ یہ ہوا کہ بھائیوں کے نام مشہور صوفی اور عارف حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی تجویز فرماتے تھے والد مرحوم حضرت مولانا کے مرید تھے اور بہت مقرب و مقبول مرید مولانا کو والد سے ایسا انس تھا کہ اپنی ٹوپیاں ہی نہیں بلکہ مرشد حضرت مولانا شاہ آفاق صاحب کی ٹوپیاں بھی مرحمت فرمادی تھیں اور ہمارے گھر میں ایک کوری ہانڈی کے اندر جس پر مطلا قیمتی غلاف چڑھا رہتا تھا انتہائی اعزاز و احترام کے ساتھ محفوظ رہتی تھیں سب سے اونچی جگہ پر تبرکات رکھے جاتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پھر ایک اور مصیبت آئی۔ اپنے ایک اور ہم نام کا تذکرہ کر تا ہے کہہ چکا ہوں کہ بمبئی میں عبدالرزاق کا جر مولی کی طرح ہر گلی کوچے میں پڑے ملتے ہیں۔ یہ حضرت خلیل کے ساتھی ہیں لیکن ہم نام ہونے پر بھی میری طرح "میاں بدھو" نہیں ہیں۔ منہ پر داڑھی کا جنگل

تو بے شک کھڑا ہے مگر قسمت کے دھنی ہیں کہ ابھی تک جنگ کی وبا سے محفوظ اور مردِ معقول ہی بنے ہوئے ہیں حالانکہ "اللہ میاں" محض اسی "نورِ الٰہی" سے بدظن ہو گئے تھے"

خالص مزاح نگاروں کے علاوہ موجودہ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند نوجوانوں کی تحریروں میں بھی جگہ جگہ طنز و مزاح کی چاشنی ملتی ہے بعض کے یہاں کم اور بعض کے یہاں زیادہ۔ چونکہ زیرِ نظر مجموعہ خالص مزاح نگاروں سے متعلق ہے اس لئے ان کی تحریروں میں جو مزاح ہے اُن پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے لئے ایک علٰحدہ مجموعہ کی ضرورت ہے جو بعد میں پیش کیا جائے گا سردست یہاں مختصراً اُن کا ذکر کر دینا بیجا نہ ہوگا۔ ان نوجوانوں میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر شفیق الرحمٰن، عصمت چغتائی۔ ابراہیم جلیس، علی عباس حسینی، خواجہ احمد عباس، تکر تونسوی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں ان کے علاوہ راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی۔ بلونت سنگھ۔ مسیح الحسن رضوی، انور عظیم مہندر ناتھ، احسن عسکری، شوکت صدیقی۔ نادم سیتاپوری، پرکاش پنڈت، خرافیہ دہلوی ہیں جن کے بعض افسانوں اور کہانیوں میں طنز کے ستھرے نمونے ملتے ہیں۔

منٹو کے طنز میں زہرناکی اور تلخی کرشن چندر کے طنز کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ ایک نوجوان نقاد نے منٹو کے بارے میں بہت صحیح لکھا ہے کہ "منٹو ضرورت سے زیادہ بے باک اور باغی ہے وہ معاشرے کی سماجی زنجیروں کو توڑنے کے لئے سب سے پہلے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتا ہے اور پھر اپنے زخموں کے ساتھ کھیلتا ہوا انسانیت اور شرافت کے نگہبانوں کو گناہوں کے تدارک کے لئے پکارتا ہے وہ آرزومند ہے کہ اُس کے افسانے

کسی نئے جنسی انقلاب کے محرک و خالق نہیں اور اس طرح شاید اس کی بے چین روح
کو تسکین مل جائے۔ اس کے نزدیک کسی عصمت فروش کی وہ تشنگی جو جنسی خواہشات
کی تکمیل کا ذریعہ بنی اُس کے پس پردہ ہمارے سماجی جرائم کی آلودہ قوتیں کارفرما ہیں۔
وہ جسم نہیں بیچتی ہے صرف اس لئے کہ ہم نے اپنے ضمیر کو فروخت کرنے سے گریز نہ کیا
"کھول دو" میں اس نے جس زندگی کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ کیا ہے وہ ہمارے معاشرے
پر ایک ایسی گہری طنز ہے جس کا اندازہ کرنے سے ہمیں سخت دکھ محسوس ہوتا ہے ——
وہ یہاں بھی قہقہے لگاتا ہے مے نوشی کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کرتا ہے اور ساقی
کے جام کے گرد رقص کرتے ہوئے اپنی زندگی کے تلخ تجربوں کے ذریعہ پوری انسانی تہذیب
پر کاری ضربیں لگاتا ہے!!

منٹو کے "ٹھنڈے گوشت" اور اسی طرح کے دوسرے افسانوں میں ہمیں بڑا گہرا
طنز ملتا ہے۔ وہ معاشرے کی خامیوں کو کرید کرید کر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس
کبھی مسکرا کر اور کبھی قہقہے لگا کر دنیا والوں کو بتاتا ہے کہ سماج کی اس پرسکون سطح آب کے
نیچے کیسے گھڑیال پوشیدہ ہیں۔ وہ جنسی بداعمالیوں کی طرف زیادہ زور دیتا ہے

منٹو کے بعد کرشن چندر نے "ان داتا" — "ہم وحشی ہیں" اور اپنے دوسرے
مزاحیہ افسانوں اور مضامین میں کبھی مسکرا کر، کبھی غیرت دلا کر اور کبھی قہقہے لگا کر اپنے مخصوص
انداز میں دنیا والوں کو للکارا ہے۔ کرشن چندر کے قلم میں شوخی اور ظرافت ہے چنانچہ
اُس کا سب سے پہلا مضمون جو اُس نے انٹرنس میں اپنی زمانہ طالب علمی میں لکھا تھا مزاحیہ
ہی تھا جو اس نے اپنے فارسی کے مولوی صاحب پر لکھا تھا۔ کرشن چندر فطرتاً شوخ ہے
وہ اپنے لہجے اور انداز بیان سے ایک لطیف طنز پیدا کرتا ہے۔ اس کے یہاں عصمت

ستانی کی طرح عریانی نہیں ہے اور نہ اُس نے عصمت کی طرح زیادہ تر جنسیات ہی کو اپنا
دف بنایا ہے بلکہ معاشرے میں جہاں جہاں خامیاں نظر آئیں اس نے اُن کو افسانوی
نگ دے کر پیش کیا ہے مگر چونکہ وہ مارکسی نظریہ کا قائل ہے، اس لئے اس کی بیشتر
تحریروں پر پروپیگنڈے کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔"ان داتا" میں اس نے دکھایا ہے
سرمایہ کس طرح انسان کو انسانیت سے دور ہٹا دیتا ہے اور مفلسی انسان سے کیا
کچھ کراتی ہے، انسان کس درجہ بہیمت پرست ہے اور انسانی تہذیب محض ایک
ریک پردہ ہے جو انسان کی درندگی، خباثت اور رکاکت پر پڑا ہے اور اس کے
ٹھتے ہی انسان درندگی کی کس پستی میں پہنچ جاتا ہے "ان داتا"۔ اور "ہم وحشی ہیں"
ں اُس نے انہی چیزوں کا اپنے مخصوص انداز میں ذکر کیا ہے۔ اس کے دو اقتباس
لاحظہ ہوں۔

ان داتا

اب کسی کے پاس کچھ نہ تھا سب تجارت ختم ہو چکی تھی۔ صرف گوشت پوست کی
تجارت ہو رہی تھی۔ اُس کے تاجر شمالی ہند میں آتے تھے اُن میں یتیم خانوں کے منیجر تھے۔
ن میں یتیموں کی تلاش تھی۔ ماں باپ اپنے ننھے ننھے بچے اور چھوٹے چھوٹے لڑکے
ن کے حوالے کر کے انھیں یتیم بنا رہے تھے دراصل غربت ہی تو یتیم پیدا کرتی ماں باپ
کا زندہ رہنا یا مرجانا ایک خدائی امر ہے۔ ان تاجروں میں دودھ آشرموں کے رکن
بھی تھے اور خالص تاجر جو ہر قسم کے اخلاقی مذہبی سماجی ریاکاری سے الگ ہو کر خالص
تجارت کرتے تھے۔ نوجوان لڑکیاں بکریوں کی طرح ٹولی جاتی تھیں۔

ہاں اچھا ہے

رنگ کالا ہے

ذرا دبلی ہے

منہ پر چیچک ہے۔

ارے اس کے تو بالکل ہڈیاں نکل آئی ہیں

چلو خیر ٹھیک ہے

دس روپے دیدو

خاوند بیویوں کو۔ مائیں لڑکیوں کو۔ بھائی بہنوں کو فروخت کر رہے تھے۔ یہ وہ

لوگ تھے جو اگر کھاتے پیتے ہوتے تو ان تاجروں کو جان سے مار دینے پر تیار ہو جاتے

لیکن اب یہی لوگ نہ صرف انھیں بیچ رہے تھے بلکہ بیچتے وقت خوشامد بھی کرتے تھے

دوکانداروں کی طرح اپنے مال کی تعریف کرتے گڑگڑاتے جھگڑا کرتے ایک ایک پیسے

کے لئے مر رہے تھے۔ مذہب اخلاقیات۔ روحانیت۔ امتیاز زندگی کے قومی سے قومی

جذبوں کے چھلکے اتر گئے تھے اور ننگی، بھوکی، پیاسی خونخوار زندگی منہ پھاڑے سامنے

کھڑی تھی۔"

اسی طرح گدھے کی سرگذشت میں ہندوستانی سیاست پر اُس نے بڑا لطیف طنز کیا

اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"گدھے نے کہا کہ پنڈت جی میں سوچتا ہوں کہیں آپ اس لئے

انکار نہ کر دیں کہ میں ایک گدھا ہوں"

پنڈت جی ہنس کر بولے "میرے پاس انٹرویو کے لئے ایک سے ایک

بڑا گدھا آتا ہے ایک گدھا اور سہی۔ کیا فرق پڑتا ہے ——؟"

کرشن چندر کے بعد حیات اللہ انصاری کی چند کہانیوں اور افسانوں میں بڑا ستھرا طنز ملتا ہے۔ بیرواز میں انھوں نے لکھنؤ کے فرقہ وارانہ فسادات پر نہایت لطیف انداز میں طنز کیا ہے۔ ایک دوسرا افسانہ "بہت ہی باعزت" میں محکمہ تعمیرات میں جو رشوتیں چلتی ہیں ان پر ایک گہرا طنز ہے اس میں انھوں نے بتایا کہ انسان کو بعض ذمہ داریوں سے مجبور ہو کر کس طرح اپنے ضمیر کے خلاف عمل کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اُن کے افسانوں کے مجموعے "بھرے بازار" میں جو کہانیاں اور افسانے ہیں اُن میں بھی سماج پر طنز کے لطیف اشارے ملتے ہیں۔

حیات اللہ کے بعد ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کے مضامین کے کئی مجموعے جو "لہریں" حماقتیں، کرنیں، شگوفے" وغیرہ کے نام سے شائع ہوئے ہیں ان میں طنز کم اور مزاح زیادہ ہے۔ شفیق الرحمٰن کنھیا لال کپور کی طرح اسٹیفن لی کاک سے متاثر ہیں اُن کے انداز میں طبعی ظرافت اور شوخی ہے ان کی تحریروں میں انگریزی مزاج کی جھلک ہے۔ جو اردو ادب میں ایک نئی چیز ہے۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں کرشن چندر کی تحریروں جیسی لطافت نہیں ہے اور نہ وہ سنجیدگی ہے جو حیات اللہ انصاری کے یہاں پائی جاتی ہے اُن کے یہاں مسکراہٹ نے قہقہوں کی شکل اختیار کرلی ہے ان کے مضمون ریویو سے ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

> ہم نے شام کو کتاب خریدی اور علی الصبح ریویو لکھ کر پریس بھیج دیا۔ ریویو کچھ ایسا مقبول ہوا کہ ان کی کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا۔ اس ریویو کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو کچھ حصہ اس لئے کہ ہمارے ریویو بے حد طویل ہوتے ہیں۔

"یہ اور وہ" حضرت آغا بابر کے دو افسانوں کا مجموعہ ہے۔ لکھائی دیدہ زیب چھپائی زرق برق۔ کاغذ سفید اور چکنا۔ دیباچہ از حضرت بدنصیب محمد وقی مصنف کی تین تصویریں شامل ہیں۔ ضخامت اسّی صفحے۔ قیمت صرف پونے چار روپے جو زیادہ نہیں۔ مصنف نے صرف دو افسانے لکھ کر اردو ادب میں ایسا نام پیدا کیا ہے جو کوئی اور ادیب دو افسانے لکھ کر ہرگز پیدا نہیں کر سکتا۔ ان گنے چنے صفحات میں زندگی کی وہ تصویریں پیش کی گئی ہیں کہ پڑھنے والا عش عش کرنے لگتا ہے۔ حسن اور عشق کی گھاتیں۔ چوری کی ملاقاتیں نفرت و عداوت کے قصے۔ دیوانی اور فوجداری کے قضیئے زمین کاشت کرنے کے نئے نئے طریقے جانور اور پرندوں کے متعلق دلچسپ باتیں۔ کہانوں کی تو کہیں کیا ہے جو اس کتاب میں نہیں ہے۔

پہلے افسانے میں ہیرو ہیروئن اونٹ پر سوار ہو کر بھاگ جاتے ہیں وہاں مصنف کی حساس طبیعت اور تیز نگاہیں اونٹ کو نظر انداز نہیں کر دیتیں۔ مصنف اونٹ کے متعلق لکھتا ہے۔ "اونٹ ایک مستطیل جانور ہے جس کا ہر کونہ زاویہ قائمہ ہے اونٹ کی گردن اس کے دھڑ سے سینتالیس درجہ زاویہ بناتی ہوئی دفعتاً جسم سے مل جاتی ہے۔ اور لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں اونٹ کی پیٹھ پر ایک ابھری ہوئی نوک دار چیز ہوتی ہے جسے کوہان کہتے ہیں یہ اونٹ کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے اونٹ خورد و اونٹ کلاں اونٹ کی گردن اس لئے لمبی ہو

کہ اس کا سر اس کے جسم سے کافی دور ہے اونٹ ایک شریف الطبع اشرف المخلوقات مخبوط الحواس اور مہماں نواز جانور ہے اس کا ذکر دنیا کی ہر مذہبی کتاب میں موجود ہے وغیرہ وغیرہ۔"

عصمت چغتائی کو زبان پر بڑی قدرت ہے وہ الفاظ سے جادو کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں مگر ان کا قلم جنسی موضوعات پر بڑی روانی سے چلتا ہے وہ سماج کی خامیوں پر بھی طنز کرتی ہیں ان میں لوٹ پھیر کر کسی نہ کسی شکل میں عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کا ذکر آہی جاتا ہے ایسا کیوں ہے اس کا جواب ماہر نفسیات ہی دے سکتے ہیں۔ بہر حال ..... ٹیڑھی لکیر اور ان کے دوسرے افسانوں و ناولوں میں یہ چیز جگہ جگہ ملتی ہے اسی لئے باوجود ترقی پسندوں کی صف اول کے نثر نگاروں میں شمار کئے جانے کے انپر عریاں نگار ہونے کا الزام عائد ہوتا ہے۔

(بن بلائے مہمان)

"کہتے ہیں کہ اونگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ، ہم ہندوستانی ایسے جنگجو واقع ہوئے ہیں کہ بس بات بے بات پر جوتم پیزار۔ مسجد کے سامنے کافروں نے ڈھول پیٹے مسلمانوں نے ڈھول پیٹنے والوں کو پیٹ ڈالا۔ مندر کے آگے تعزیے نکلے اور لٹھ چلا۔ در اصل ہم لوگ حساس بہت واقع ہوئے ہیں ——!

پیپل کا ایک شریر گدا مین سڑک پر جھک آیا۔ اور جب قد آور تعزیوں نے اُدھر سے جبل قدمی کی کوشش کی تو جھکنے کی ضرورت

پڑی۔ تعزیے اور جھلکیں اور گدا وہ بھی پیپل کا! توبہ کیجیے اسی طرح ڈھنا رہا۔ نتیجہ؟ سینکڑوں گھر لٹ گئے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھر پھونک دیے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو کاٹ کے رکھ دیا۔ یہ تو لمبی داستان ہے۔ مگر ہم میں سے کون ایسا ہے جس کے لئے یہ نئی بات ہے۔ ہمارے پردادا کے وقت سے لیکر اب تک تعزیوں اور پیپل کے گدوں کا خاندانی بیر چلا آتا ہے اور خدا نہ کرے جو ہم اپنی تو نئی خوبیوں کو خیرباد کہیں۔ اور جب مسلمانوں نے گدا کاٹا تو اندازہ لگا لیجئے کیا ہوا!"

"اے خدا! تو جب دعائیں قبول کرنے پر آتا ہے تو یوں دعا قبول کرتا ہے؟ تیرے بندوں کو کسی کل چین نہیں۔ یہ تیری ناچیز بندی تنہا تھی اس نے دوسرا ساتھ چاہی تو تو نے یوں عذاب کی طرح مسافر نازل کرنا شروع کر دیے۔ اور مسافروں سے زنانہ اسباب ویسے بھی، ہمیں کیا حق کہ بے بات تیری مصلحت میں دخیل ہوں مگر پروردگار اتنا تو سوچا ہوتا کہ انسان میں جتنی تو نے برداشت دی ہے اتنا ہی بوجھ لادتے ہیں ہم تو بس!۔ اور میں دل میں ڈری کہ اگر دعاؤں کے قبول ہونے کا یہی ڈھنگ رہا تو کہیں وہ شوہر کے لئے جو ابھی ابھی دعا مانگی تھی اس کا بھی کچھ ایسا قصہ نہ ہو جائے اور لے چلا چل ایک پہ ایک میرا تو دم ٹوٹ جائے گا۔ میں ایک کے ہی قمیص میں بٹن لگا دوں اور چائے

بناؤں تو بہت جانو۔ مجھ سے بھلا اتنے کاہے کو جھیلے جائیں گے۔ سست اتنی ویسے ہی ہوں اب اتنے بناؤں کو کون میرے بیٹھ کے بھگتے گا۔ کہتے ہیں کہ ڈاک خانہ میں اگر بھولے سے کوئی غلط خط پڑ جائے تو تھوڑی سی رشوت دے کر واپس لے سکتے ہیں۔ کاش دعاؤں کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی انتظام ہوتا۔ مگر دعا ایک دفعہ مانگی جا چکی تھی اور پے درپے قبول ہو رہی تھی۔" (ایک شوہر کی خاطر)

نوجوان ترقی پسند لکھنے والوں میں ابراہیم جلیس کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں "چالیس کروڑ بھکاری" اور "جو نہ دیس میں" جو طنز ہمیں ملتا ہے ویسا طنز یا تو کرشن چندر، سعادت حسن منٹو کے بعض بعض افسانوں میں یا عزیز احمد کے چند ناولوں میں ہے۔ کرشن چندر کے یہاں طنز میں ایک صحافتی لہجہ ہے مگر ابراہیم جلیس کے طنز میں ایک فنی انداز ہے۔ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

(چالیس کروڑ بھکاری)

"ماجد پھر بولنے لگا

میں آپ کو ہندوستان کا یہی حزن — یعنی حسن دکھانا چاہتا تھا تاج محل پر بھی آپ ایسا ہی حزن و ملال دیکھیں گے یہاں مسرت سے چمکتی ہوئی آنکھوں کی کوئی تعریف نہیں کرتا یہاں آنسو بہانے والی آنکھیں بہت پسند کی جاتی ہیں یہاں کی عورت کی آنکھوں سے جو آنسو ٹپکتا ہے وہ صدف سے نکلے ہوئے موتی سے زیادہ قیمتی اور حسین ہوتا ہے۔

آپ اس لڑکی کی چوٹی دیکھئے ۔۔۔ کتنی لمبی ہے مادام۔ دنیا کی ہر عورت نے اپنی چوٹی کٹوا کر آزادی حاصل کر لی ہے لیکن ہندوستان میں شب ہجر اور گیسو کا طول متوازی متوازی ہے دراصل یہاں عورت کے لئے چوٹی نہایت ضروری ہے۔ اس کو گھر سے باہر ڈھکیلنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے اس کا جسم سمٹ سمٹ کر گولا ہو جاتا ہے صرف چوٹی ہی ہاتھ میں آتی ہے جیسے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے دروازے کے باہر بازار میں ڈھکیلا جا سکتا ہے۔ پھر چاندی کے سکوں کے عوض یہ چوٹی دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے دوسرا مرد جب تک اپنا اور اس کا پیٹ بھرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس کی نظریں چوٹی کی طرف نہیں اٹھتیں لیکن جس دن چولھے کی سرد راکھ میں کوئی بلی سو جائے اس دن وہ اس عورت کی چوٹی پکڑ کر فارس روڈ گرگام، گول پیٹھ، سفید گلی، کناری بازار بٹی بازار۔ چاوڑی۔ سونا گاچی۔ محبوب کی مہندی۔ چوک۔ ہیرا منڈی کے کوٹھوں کی سیڑھیوں پر گھسیٹتا ہے پھر وہاں کئی کئی مرد اس کی چوٹی پکڑتے ہیں۔ درد کی شدت سے بیتاب ہو کر وہ رونے لگتی ہے۔ لوگ جھوم جھوم کر واہ واہ کرتے ہیں کہ کیا اچھا گا رہی ہے ۔۔۔ کیا اچھا ناچتی ہے۔!"

. . . .

کتنی رسیلی آواز ہے ۔۔۔! دراصل کپڑوں کے چیتھڑوں کی آواز سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا بعض عورتیں بڑی چمکیلی ساڑھیاں پہنتی

ہیں لیکن ان کی آواز سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے گلے میں ٹین بج رہا ہو
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

"آپ شاید یہ سوچ رہے ہوں کہ اسے اپنی خاک میں ملتی جوانی کا
احساس ہے — نہیں مطلق احساس نہیں — یہ گانا تو اسے ایک استاد
نے سکھایا تھا۔ جب وہ بالکل نئی نئی جوان ہوئی تھی۔

ہندوستان میں جوان عورتوں کی کمی نہیں۔ دراصل یہاں گرمی بہت
ہوتی ہے اس لئے تاریخی روایت کے مدِ نظر پانچ پانچ پانڈو ایک دروپدی
کو اپنی باہنوں میں کھینچ لیتے ہیں۔ اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں — کچھ
عرصہ پہلے یہ بھکارن اسی فارسی روڈ کی اس اونچی جالی میں رہتی تھی لیکن
پانڈوں نے اس کو اس بری طرح اپنی باہنوں میں کھینچا سینے سے چمٹا لیا
کہ وہ زخمی ہو گئی — اب وہ ایک ٹوٹا ہوا کھلونا ہے — اب اسے سڑک
پر ایک بجلی کے کھمبے کے پاس پھینک دیا گیا ہے پانچ برس پہلے میں نے
اس کی جالی میں اس کو پانچ روپے دیئے تھے — آج اس کو صرف
ایک پیسہ دیتا ہوں۔"

فکر تونسوی موجودہ ترقی پسندوں میں ایک کامیاب طنز نگار ہیں ان کے طنزیہ
مضامین کا ایک مجموعہ "تیر نیم کش" کے نام سے شائع ہوا ہے وہ بھی عام ترقی پسندوں
کے یہاں سیاست اور سماج دونوں کی خامیوں کو بڑے دلکش اور طنزیہ انداز میں پیش
کرتے ہیں۔ اگر پیٹ ان کو صحافتی زندگی بسر کرنے پر مجبور نہ کرتا تو شاید "ترقی پسندوں

میں ایک ممتاز طنز نگار کی حیثیت رکھتے۔ وہ روزمرہ کے سیاسی اور سماجی واقعات پر
اس انداز میں روشنی ڈالتے ہیں کہ پڑھنے والے کے لبوں پر مسکراہٹ ناچنے لگتی ہے
ان کے یہاں ظرافت سے زیادہ طنز ہوتا ہے۔

(پروفیسر نفسی اور بکری)

"پروفیسر نفسی جو یونیورسٹی بھر میں علم نفسیات پر اتھارٹی مانے جاتے تھے
وہ میری بکری کا علاج کریں اس سے زیادہ قابل فخر بات اور کیا ہو سکتی
تھی چنانچہ میں نے دودھ سوکھنے کا یہ کیس پروفیسر نفسی کے حوالے کر دیا۔
پروفیسر نفسی نے علاج کا آغاز کرتے ہوئے کہا:۔ سب سے پہلے ہمیں یہ تحقیق
کرنی ہے کہ بکری کا بچپن کن حالات میں گزرا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بچپن
کا کوئی گھناؤنا واقعہ بکری کے لاشعور میں موجود ہو اور تمہارے یہاں
آ کر کوئی اس سے ملتا جلتا واقعہ ظہور پذیر ہوا ہو جس سے بکری کے ذہن
کو شدید صدمہ پہنچا ہو۔ اور ماضی کا وہ لاشعوری واقعہ اچانک شعور کی
سطح پر ابھر آیا ہو"

میں نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "پروفیسر نفسی! میرے
خیال میں اپنے بچپن کی داستان تو خود بکری ہی بتا سکتی ہے۔ میں کس
قابل ہوں"!

پروفیسر نفسی شاید اس کی داستان سننے کے لئے بکری کی طرف بڑھے
مگر میں نے ان کا بازو پکڑتے ہوئے روک دیا اور کہا۔ "پروفیسر صاحب
بکری بول نہیں سکتی۔ وہ انگریزی اردو ہندی میں سے کوئی زبان بھی نہیں

جانتی۔"

پروفیسر نفسی نے انگلی سے اپنی پیشانی کھجلائی اور دوبارہ کرسی پر آکر بیٹھ گئے اور بولے "خیر کوئی ہرج نہیں، علم نفسیات کی اپنی ایک زبان بھی ہوتی ہے تم مجھے بتاؤ کہ جس دن اس کا دودھ سوکھا کیا اس دن بکری کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آیا تھا؟"

"اور تو کچھ نہیں ہوا صرف اس دن اس کا کھونٹا اکھڑ گیا تھا جسے میں نے ٹھونک ٹھونک کر دوبارہ مضبوطی سے گاڑ دیا تھا۔"

پروفیسر نفسی یہ سنتے ہی بے تابانہ اٹھ کھڑے ہوئے اور چٹکی بجا کر بولے "بس مل گیا راز۔ بکری کھونٹا اکھیڑ کر آزادانہ طور پر رہنا چاہتی ہے مگر تم نے اس کی گردن میں رسی ڈال رکھی ہے یاد رکھو کائنات کی ہر چیز اپنے فطری مرکز کی طرف پرواز کرنا چاہتی ہے اور اس فطری جذبہ کو جب کھونٹے سے باندھ دیا جائے تو دودھ تو ایک طرف تخیل تک سوکھ جاتا ہے۔"

یہ کہکر پروفیسر نفسی کھونٹے کی طرف بڑھے اور اس سے پہلے کہ میں انھیں بتاتا کہ کھونٹا بکری نے نہیں اکھیڑا تھا بلکہ گھر کے بچوں نے شرارتاً اکھیڑ دیا تھا ـــــ انھوں نے بکری کی گردن میں سے رسہ کھولا اور بکری کو آزاد کر دیا۔ بکری آزاد ہونے کے بعد گم سم کھونٹے کے قریب جہاں کھڑی تھی بدستور کھڑی رہی" در اصل ہوتا یوں ہے کہ، پروفیسر نفسی نے بکری کو بدستور گم سم کھڑے دیکھ کر کہا کہ کامپلکس لاشعور کی گہری تہوں سے ابھر کر بوری

طرح شعور کی سطح پر نہیں آچکے تھے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کامپلکس کا کچھ حصہ
لاشعور میں اور کچھ حصہ شعور میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بکری کے اندر
آزاد ہونے کی زبردست تمنا تو موجود ہے مگر وہ آزاد ہونا نہیں چاہتی
وہ ڈرتی ہے کہ یہ کھونٹا اور رسی کہیں پھر اس کی آزادی نہ چھین لیں۔"
یہ کہکر پروفیسر نفسی نے کھونٹا اکھیڑا اور پھر اس کے اوپر رسی لپیٹ کر
دونوں چیزیں باہر گلی میں پھینک دیں۔ میں نے دل ہی دل میں حساب
لگایا کہ رسی آٹھ آنے میں آئی تھی اور کھونٹا چھ آنے میں گویا بکری کو
جو پہلا انجکشن دیا گیا وہ چودہ آنے کا تھا۔"

خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور سڑک پر چلنے والوں کی جنسی خواہشات کا مضحکہ
اس انداز میں اڑاتی ہیں کہ بقول شخصے "پڑھنے والا بجائے ان کے مضحکہ میں ان کا ساتھ دینے
کے ان کے "سرخ ڈورے" اور "بھیا کا پلنگ" کی طرف آنکھیں گاڑنے پر مجبور
ہو جاتا ہے۔ شاید ان کا خیال ہے کہ ادب میں جلی کٹی سنانے ہی کا دوسرا
نام طنز ہے۔

نوجوان ترقی پسند لکھنے والوں میں مسیح الحسن رضوی کے یہاں بھی کئی کہانیوں
اور افسانوں میں ستھرا طنز ملتا ہے بالخصوص "دوستی کا ٹیکس" اور "یہاں سب خیریت
ہے"۔ یہاں سب خیریت ہے کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"اس پر اخبار نویس نے دریافت کیا۔ سر وہ بھگدڑ کے واقعات کے
بارے میں آپ کچھ تفصیل بتا سکتے ہیں؟ اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو

ایک دم غصہ آگیا۔ "بھکمری کے واقعات غلط، واہیات، تحصیل کے بعض دیہاتوں میں موتیں ضرور ہوئی ہیں لیکن ہم انھیں اسٹارویشن ڈیتھ نہیں کہہ سکتے۔ اسٹارویشن ڈیتھ قانونی اصطلاح میں اس موت کو کہتے ہیں جس میں مرنے والا ایک ایک دانہ اناج کے لئے تڑپ تڑپ کر مر جائے۔ لیکن اس تحصیل کے مواضعات میں جو موتیں ہوئی ہیں وہ اس قانونی اصطلاح پر پوری نہیں اترتیں۔ مثال کے طور پر منجھو چمار کو مرنے سے دو گھنٹے قبل چاول کا نہایت مقوی پانی دیا گیا تھا۔ جس میں انگریزی حروف تہجی کے جملہ وٹامنسز موجود تھے۔ پھر ڈاکٹر اس کے مرض کی تشخیص نہیں کر سکے ایسی حالت میں آپ اُسے اسٹارویشن ڈیتھ نہیں کہہ سکتے۔"

اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے داد طلب نگاہوں سے مقامی رپورٹروں کو دیکھا۔ یہ رپورٹر مقامی اسکول کے ٹیچر تھے۔ وکلا تھے اور بعض تیسرے درجے کے سیاسی لیڈر سب نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی رائے سے اتفاق کیا۔"

ہجو نگار شعراء

۱۔ جعفر زٹلی

۲۔ سودا

۳۔ انشاء

۴۔ مصحفی

جعفر زٹل

بہادر شاہ کے "ظفر نامے" سے

بھلائی بھیک کی ہوتی ملک مارے شہر لوٹے ۔۔۔ جیسی تس[۳۰] دن بہت مالا کبھی بوڑھا کبھی بالا
بھلائے بھیک کے ٹکڑے سپاہی ہو بہت اکڑے ۔۔۔ جلیں جنگل ہیں جوں لکڑی اگن دوزخ جلایا ہے
بجا ندرائی میں دیکھو اس نرد بلی میں ۔۔۔ دخل دیدیں واغول عجب یہ نام پایا ہے

اورنگ زیب کی شان میں

زہے دھاک اورنگ زیب شاہ دہلی ۔۔۔ کہ در ملک دکھن پڑی کھلبلی
درین پیر سالی و ضعف بدن ۔۔۔ مچائی دھما چوکڑی در دکن

بشنو بیان نوکری جب گانٹھ ہوتی کھوکری ۔۔۔ تب بھول جاوے چوکڑی یہ نوکری کا خبط ہے
مردم پشیماں یک دگر گشتہ سپاہی دربدر ۔۔۔ خوردہ بسے خون جگر یہ نوکری کا خبط ہے
دھنیا جولاہا طاق ہے کنجڑا اتھائی چاک ہے ۔۔۔ دیویں قرم ساق ہے یہ نوکری کا خبط ہے
ہر صبح ڈھونڈیں چاکری کوئی نہ پوچھے بات ری ۔۔۔ سب قوم ڈھوویں لاکڑی یہ نوکری کا خبط ہے
دن بیس مجرے میں کٹے دن بیس غیر حاضری نے لئے ۔۔۔ دن بیس جھگڑے میں کٹے یہ نوکری کا خبط ہے
چوکی لکھیں اور حاضری کھانے نہ پاویں باجری ۔۔۔ تس پر جلاویں تاج ری یہ نوکری کا خبط ہے
کیسے رہیں ایمان سے عاجز ہمیشہ نان سے ۔۔۔ بیزار ہیں مہمان سے یہ نوکری کا خبط ہے

جعفرؔ خدا کو یاد کر غمگین دل کو شاد کر — یہ گفتگو برباد کر یہ نوکری کا خبط ہے

فوج کی حالت

جب دوڑ کر سب اُٹھ چلے سوار بیٹھے یوں کہے — ٹٹو بچارا نہ ہلے یہ نوکری کا خبط ہے

امرا ہیں سب بے خبر احدی بے چارے بے قدر — اسوار یا جی سے بتر یہ نوکری کا خبط ہے

صاحب عجب بیداد ہے محنت ہمہ برباد ہے — اے دوستاں فریاد ہے یہ نوکری کا خبط ہے

ہم نام کو اسوار ہیں روزگار سے بیکار ہیں — یارو ہمیشہ خوار ہیں یہ نوکری کا خبط ہے

نوکر خدائی خان کے محتاج آدھی نان کے — لیکن ہے ایمان کے یہ نوکری کا خبط ہے

دم خیر ہو گھوڑا رہا یہ دکھ بچارا ہو گیا — پیشاب کر کے سو رہا یہ نوکری کا خبط ہے

دیکھ مہاجن کا جھمیلا جن سود کا لالچ کیا — بے قرض پوتا ہے پیا یہ نوکری کا خبط ہے

دربار دیکھا خان کا بیڑا نہ پایا پان کا — ٹکا نہ پایا نان کا یہ نوکری کا خبط ہے

رات دن بھوکے مریں اس حال سے کیسے مریں — تم ہی کہو ہم کیا کریں خشکہ کریں (کش) کا ذوق ہے

گولکنڈہ کی فتح پر طنز

نخیتق کلاں ترکہ برکھنڈ کر — ہمہ کاروبار پدر کھنڈ کر

مرزا محمد رفیع سودا

جا صبا ضاحک سے کہہ بعد از سلام — کیوں کیا کرتا ہے ہجو خاص و عام
آپ کو کہتا ہے تو سید ہوں میں — جد میرا پوچھو تو ہے خیر الانام
پس دکھا تو اب کسی کی ہجو میں — ہو اگر ختم رسالت کا کلام
کون ہے تیری سیادت کا مقر — جانتے ہیں خاص سے لے تا عوام
تیرے والد کو ہوئی تپ ایک سال — تب حکیموں نے یہ تشخیص تمام
دق سمجھ کہ یہ دوا تجویز کی — شیر خر با قرص کافور یکدام
مول لے ایک مادہ خر پینے لگا — ہر سحر اس شیر خر کا بھر کے جام
آخر کار اس مرض کے بھی لئے — وہ جو مادہ خر تھی آئی اس کے کام
ایم سوز اک پدر ہے تو شریر — رحم مادر سے اُلٹا نکلا ہو میسر

لشکر کے بیچ آج یہی قیل و قال ہے — کھانے کی چیز کھانے کا سب کو خیال ہے
یوں دخل امر و نہی میں کرنا محال ہے — جو فقہ داں ہیں سب کا یہ اُن کا خیال ہے
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

حامی انھوں کے قول کا موٹے ہیں چاند خاں — اور دوسرے میں کیا کہوں اک اپنے مہرباں
کچھ شک رہا ہے کوے کی حلت کے درمیاں — ہم سے جو کوئی پوچھے تو ہم بھی کہیں کہ ہاں
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

یار و سبو ہو تم اسی دیر خراب میں — بیٹھا اٹھا کرو ہو سدا شیخ و شاب میں

حلت لکھے ہے زاغ کو سبھی کتاب میں | جتنی کتابیں فقہ کی ان کے جواب میں
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

بگڑا ہے آج مجتہدوں بیچ کیا یہ نیل | ملا لطیف بولے کہ کھانا روا ہے جبیل
کہتا ہے جانور حلال کیا کن نے حرام خیل | حلت پہ سیّد کی گئی ایلچی کی سو دلیل
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

سودا کا گھوڑا

حشری اس قدر کہ بجز اس کی پشت پر | دجال اپنے منہ کو سیہ کر کے ہو سوار
اتنا وہ سن رسیدہ ہے کہ سب اتر گئے ہیں دانت | بجھڑے پہ ہیں کہ ٹھوکر دل کی نت بیٹھے ہے مار
ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن | پہلے وہ نکلے ریگ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے | شیطان اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

گھوڑے کی مستی۔

اک دن گیا تھا مانگے یہ گھوڑا برات میں | دولہا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہو سوار
سبزے سے خط سیاہ و سپید ہوا سفید | تھا سرو سا جو قد سو ہوا شاخ بار دار
پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں | شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گزار

مرہٹوں کی فوج سے مقابلے کے لئے گھوڑے کا مالک اس پر سوار ہو کر جس نشان سے نکلا تھا اس کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔

جس تجمل سے سوار تھا اسپ دن میں کیا کہوں | دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھے دونو ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ ۔۔۔ تک تک سے پاشنہ کی مرے پانو تھے فگار

آگے سے توبڑا اسے دکھلائے تھا سئیس ۔۔۔ پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام ۔۔۔ اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار

پہلے اسے لگا وہ کہتا ہوئے یہ رواں ۔۔۔ یا بادبان باندھ یوں کے دو اختیار

کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ ۔۔۔ کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

دھوبی کمہار کے گدھے اس دن ہوئے تھے گم ۔۔۔ اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے واں گذار

مردک نے اسکو اپنے گدھے کا خیال کر ۔۔۔ پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمہار

میدان جنگ میں پہنچنے پر جو کیفیت گذری ملاحظہ ہو۔

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پر ۔۔۔ دوڑوں تھا اپنے پانو سے جوں طفل نے سوار

جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل ۔۔۔ لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف ۔۔۔ القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

گھوڑے کے مالک کی مفلسی جو گھوڑے کے لئے دانہ تک نہیں فراہم کرسکتا۔

نہ دانہ و نہ گیاہ نہ تیمار نہ سئیس ۔۔۔ رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار

ناطاقتی کا اس کی کہاں تک کروں بیاں ۔۔۔ فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا ۔۔۔ ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال ۔۔۔ کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد ۔۔۔ امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

گھوڑے کی بھوک کی شدت ملاحظہ ہو۔

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر ۔۔۔ دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بیقرار

تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھاس کا
چوکے کو آنکھ موند کے دیتا ہے وہ پسار

خط شعاع کو وہ سمجھ دستۂ گیاہ
ہر دم زمیں پہ آپ کو ٹپکے ہے بار بار

اس کے ضعف اور ناتوانی کا حال۔

ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے
میخیں گر اس کی تھان کی ہو دیں نہ استوار

نہ استخواں نہ گوشت نہ کچھ اسکے پیٹ میں
دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لہار

سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ
خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار

ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی اس اعتبار

ترجیع بند میر ضاحک کی ہجو میں ہے۔

ناحق کہے ہے شرم سے دو لہا سے سرنگوں
اب کیونکہ تیل روے مقدس کو میں ملوں

شانہ کروں میں ریش کو یا وسمہ سے رنگوں
جی کی امان پاؤں تو ایک بات میں کہوں

منہ کو کلنگ اپنے اگاتے ہیں شیخ جی

القصہ شیخ جی کی جو حرمت خدا گنوائے
بارہ برس کی چھوکری باجا بجاتے لائے

آئے دلھن کے گھر سے جو مقنع میں منہ چھپائے
جیسا ہمارے کہنے کو خاطر میں وہ نہ لائے

اپنے کئے کو ویسا ہی پاتے ہیں شیخ جی

تھے بسکہ شیخ بات سے دنیا کی پاک صاف
مسواک لے کے جورو سے کرنے لگے زفاف

ان نے تب اپنی چوٹی سے لی کھولکر سیاف
مشکیں اکھڑوں کی جکڑ کے کہا کیجئے معاف

مجھ کو تو کچھ ولی نظر آتے ہیں شیخ جی

لایا غضب میں شیخ کو گھر کا یہ بندوبست
مشکیں تڑا پہنچ گئے جورو سے کرکے جست

بال اسکے انکے ہاتھ یہ ریش انکی اسکے دست
تھمدے ہے بر نہ آئے تھے از بس ضعیف و پست

بالپوشیں تب سے جورو کی کھاتے ہیں شیخ جی

جورو سے شیخ جی کو یہ صحبت ہے اب مدام ۔ بھسڑاو مسخرا و جھنڈ رہے ان کا نام
خلوت میں جب بلاتے ہیں اسکو بوقت شام ۔ دیتی ہے تب وہ بھیج کے لوگوں سے یہ پیام
بیٹی کو اپنے کیوں یہ بلاتے ہیں شیخ جی

یہ تو ہیں بوڑھے خرس وہ ہے شوخ اچپلی ۔ ماری کبھو تو دھول کبھی داڑھی نوچ لی
ان کو تو جانتی ہے کہ ہیں شیخوں میں ولی ۔ کھلتی ہے ان کی جورو کی تب اسطرح کلی
پھولے نہیں بدن میں سماتے ہیں شیخ جی

جب دیکھتی ہے وہ کہ ہے برسات کی ہوا ۔ دس بیس دن جھڑی کو ہوئے ہے نہیں کھلا
آتی ہے ان کے پاس لئے تیل اور توا ۔ کہتی ہے یہ نہ مانئے گا آپ اب برا
ہم تم کو شیخ توند بناتے ہیں شیخ جی

جب گھونگرو پہن کے چلے ہی لٹکتی چال ۔ آتا ہے شیخ جی کے تئیں اس بلا پہ حال
عمامہ سر سے پھینک کر ہو جاتے ہیں نڈھال ۔ تب مہربانی سے یہ کہتی ہے وہ چھنال
اب ہم کو اپنی چاہ جتاتے ہیں شیخ جی

ایک روز شیخ جی کو جو جورو سے جا لڑے ۔ کہنے لگی کہ تم ہو بڑوں کے مرے بڑے
اب بس داڑھی رکھو کہیں جو کانا گر پڑے ۔ ڈرتا نہیں ہے مجھ سے تو لے کبڑے زن مرے
کہہ دوں ابھی ددا سے ستاتے ہیں شیخ جی

ایسی ہے بے ادب نہ خدا سے بھی وہ ڈرے ۔ آکر کے شیخ جی کے مصلے پہ ہگ بھرے
شانہ کو انکے داڑھی کے لے بالوں میں کرے ۔ یارب کہ وہ چھنال شتابی سے اب مرے
ورنہ ہمارے ہاتھ سے جاتے ہیں شیخ جی

جورو کہے ہے شیخ سے اے شیخ تم سنو
چھوے کو تم نے دی ہے دغا چپکے ہو رہو
میں جانتی ہوں اتنا کہ تم فیلسوف ہو
سودا زیادہ کیا کہے ہے بات گو مگو
جیسے ہیں تیسے جوتیاں کھاتے ہیں شیخ جی

انشاء

چاند سے مکھڑے کو اس کے دیکھ گرداگرد سے
چار چار انگشت سورج کا کنارہ جم گیا
کیمیا کا شوق تھا جنکو اکر بٹ کرتے ہوئے
تھا جہاں تک شہر میں موجود پارہ جم گیا
جھٹ پٹ جھپٹ کے تم نے جو مونڈے کو دار خوب
چوکھٹ پہ گر کے رات میں کھائی پچھاڑ خوب
درویش بلانوش بلا چیٹ ہیں میاں دوست، پینک میں جو آویں
افعی کو مسل کر کریں افیون کا گھولا، ہیں ایسے ہی آفت
سانپ سی زلف گئی اسکے جو گھونگھٹ سے لپٹ
پیچ کر میرے گلے تب وہ گیا جھٹ سے لپٹ
جوں گلی سے مجھے آتے ہوئے دیکھا تو وہ شوخ
اپنی چوکھٹ سے اچک جھٹ سے گیا پٹ سے لپٹ
تنہا نہ ہم ہی در سے ترے لگ رہے ہیں یار
ہیں اور بھی کھڑے بس دیوار چار پانچ
اب کسی موذی کو جرمانا ہوں پھر اک بھنگ گھٹتا
ہو مدر، حق ہو مدر، ہو ہو مدر، ہاہا مدر
انشا یدل کے قافیے رکھ چھیڑ چھاڑ کے
چڑھ بیٹھ ایک ارزنچھیرے اکھنڈر یر
کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرت انسان پر
فعل بد تو ان سے ادر ہے لعنت کریں شیطان پر
اے نالہ چھوٹے چھوٹے پہاڑوں سے مت الجھ
یک بار قصد قلعۂ چرخ بلند باندھ
ٹک شیخ سیہ رو کے تبسم کو نہ دیکھو
معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہنستا ہے توا گرم

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے
سر خرس کا، منہ خوک کا لنگور کی گردن

بولے تو اپنے سروِ خراماں کو تاڑ باندھ
گر قصد بوسہ ہووے تو گرد اسکے باڑ باندھ

ہر دم یہ موچھ آپ کی اے شیخ تکیہ ریش
دکھلاتی ہے مجھے ذَنبُ الفار کی شبیہ

ہے شیخ سیہ چہرہ جو مجلس میں بہد کتا
یاروں کو ہے یاں روٹی کے لنگور کی سوجھی

یہی وضع ہے تو مجھے کھوئے گا
پڑے پھرے گا ہاتھ رکھے کمر پر

دیا نامۂ سید انشا، تو ان نے
دھتر چڑھی اک سرنامہ بر پر

گھر سے باہر تمھیں آنا ہے اگر منع تو آپ
اپنے کوٹھے پہ کبوتر تو اڑا سکتے ہیں

ہاتھ کیا پھیر وہ عارض پہ ابھی کیا ہو وہاں
خط کا کچھ دخل نہیں گال بلے جاتے ہیں

کالی بلا کی شکل بنا کر چمٹ نہ جا
میں نے کہا کہ دور ہو مجھکو نہ تھام چھوڑ

کیونکر نہ گدگداہٹ ہاتھوں میں اسکے اٹھے
وہ گوری گوری رانیں جن نے دبائیاں ہوں

خلوت میں فائدہ کچھ اغیار سب ہم ہوں
سب کو ہوا بتا دو بس اتم ہو اور ہم ہوں

سو فتت تو جو ہم کو دے ڈالے ایک بوسہ
فدوی غلام بندے بے دام بے درم ہوں

بڑی داڑھیوں پہ نہ جا دلا، یہ سب آہوؤں سے کے ہیں مبتلا
یہ شکار کھیلے ہیں پر ملا انھیں ٹٹوں کی تو آڑ میں

انشا تو اینڈتے ہیں پڑے میکدے کے بیچ
کہیو سلام زاہد شب زندہ دار کو

وقت کے بادشاہ ہیں درویش
ان کا چھوٹا سا یہ نہ قد دیکھو

مصحفی

چالیس برس کا ہے چالیس ہی کے لائق — تھا مرد معمر کہیں دس بیس ہی کے لائق
لے آئے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے — ہم بھی تھے کہیں دو نو ونیں پچیس کے لائق
استاد کا کرتے ہیں امیران کے مقرر — ہوتا ہے جو در ماہہ کہ ستائیس کے لائق

پانی بھرے ہے یارو یہاں قمر بھی دو شالا — لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا
کاندھے پہ مشک لے کے جب قد کو خم کرے ہو — کافر کا نشہ حسن ہو جائے ہے دو بالا
دریائے خوں میں کیونکر ہم نہ نیم قد ڈوبیں — لنگی کے رنگ سے جیٹھ ہاں تا کمر ہو لالا

اس کے در پہ میں گیا سوانگ بنائے تو کہا — چل بے چل دور ہو کیا لے کے فقیری آیا
سرگرم سیر گلشن کیا خاک ہوں کہ اپنا — نزلہ سے ہو رہا ہے آپ ہی دماغ ٹھنڈا
جئے عاشق نہ کیوں اسکے ممولے — کہ چشم شوخ اس کی ہے ممولا
جز اک اللہ بنایا تو نے صیاد — قفس میں از پے بلبل ہنڈولا

کھٹمل نامہ

کھٹملوں کی زبسکہ ہے افراط — تلخ ہے ان سے اپنا خواب نشاط
کافروں نے یہ سر اٹھایا ہے — سارے پنڈے کو توڑ کھایا ہے
کیا کہوں ان گزندوں کی زشتی — کہ مجھے کر دیا ہے خار رشتی

ہے بھکی آگ سی بدن میں تمام | پڑ گئے ہیں ددوڑے تن میں تمام

بسکہ بے چین ہوں میں انکے ہاتھ | نیند آتی نہیں ہے ساری رات

دمبدم کروٹیں بدلتا ہوں | اِدھر اُدھر پڑا اچھلتا ہوں

پائنچے میں کبھی گھس آتے ہیں | کبھی نیفے میں سرسراتے ہیں

اک خلش ساری رات ازار میں ہے | آنکھیں بند اور ہاتھ ازار میں ہے

گاہ رو گہ جبیں کھجاتا ہوں | گاہ سر گہ سریں کھجاتا ہوں

مارتا جاتا ہوں انھیں جوں جوں | کان پر انکے رینگتی نہیں جوں

ان کے ملنے سے وقت بدخوابی | چٹکیاں ہو گئی ہیں عنابی

بلکہ غصے سے جو دیا ہے فشار | سرخ ناخن ہیں جوں لبِ سوفار

ان کی گردن پہ خون میرا ہے | خوں سر انگلیوں پہ ان کا ہے

اس سے رنگیں کوئی نہ تھا مضمون | باندھا ہیں انگلیوں پہ انکا خوں

گو کہ اب ہو چکے سب بدن کو گزند | ہو گئیں انگلیاں تو فندق بند

لوہو پی پی تر بس ہوئے موٹے | ریزۂ لعل ہیں بڑے چھوٹے

لیکن اس تب پہ یہ سبھی خناس | منہ میں رکھتے ہیں سوزن الماس

ان کے نیشوں سے ہے مری فریاد | ہیں ہوں اور کتنے نشتر فصاد

ہر سر مو پہ میرے ایذا ہے | یعنی ان موذیوں کا بلوا ہے

گرچہ اک قطرہ مجھ میں خوں نہیں | لیکن یہ خالی از جنون نہیں

تلے کروٹ کے آ جو جاتے ہیں | وہ ہیں جھنجھلا کے کھاٹ کھاتے ہیں

کچھ مرا ان سے بس نہیں چلتا | میں تو رہتا ہوں ہاتھ ہی ملتا

کاٹتا ہے جو کوئی آ کے کہیں
بیٹھے بیٹھے اچھل پڑوں ہوں وہیں

بسکہ ہے ان دونوں انھوں کا وفور
لیٹنے کا تو سمجھے کیا مذکور

انکے ہاتھوں سے ہے مجھے اے یار
بیٹھنا چارپائی پر دشوار

پانوں میں جو موا اس ان کا ہے
اس کا ہر پایہ بھڑ کا چھتا ہے

الغرض شام سے ہو شب بیدار
کھیلتا ہوں میں کھٹملوں کا شکار

مارے جو موٹے موٹے چن چن کر
چھینٹ کا تھان بن گئی چادر

گھسے دیوار پر جو کر کے تلاش
کر دیا گھر کو خانۂ نقاش

نہ زمیں ہی میں خاکمال ہوئے
گھر کے کونے تمام لال ہوئے

نہیں مرتے ہیں تو یہی بد ذات
کیا انھوں نے پیا ہے آب حیات

کوئی کیونکر کرے انھوں کا شمار
پیدا ہوتے ہیں ایک سے یہ ہزار

ہے بجا بسکہ ہیں زمیں پہ زیاد
کہئے راون کی ان کو گر اولاد

فائدہ ان سے کچھ نہیں زنہار
غیر اس کے کہ ہوں میں شب بیدار

یہ سمجھ کر کر لوگ جاگتے ہیں
چور بھی ان کے ڈر سے بھاگتے ہیں

دوڑتے ہیں زبسکہ ہیں چالاک
میری آنکھوں میں ڈال جاتے ہیں خاک

آ پڑے ہیں جو میرے ہاتھ کہیں
راہ لیتے ہیں آستیں کی وہ ہیں

کوئی آسان ہاتھ آتے ہیں
گھائیوں میں سے نکلے جاتے ہیں

ہیں زباں ان کی جوں سنان سر تیز
یاد ہے تب تو ان کو جنگ گریز

بوریے پر جو بیٹھے کوئی دم
وہاں بھی ان کا لگا رہے ہے غم

بے خبر وہ ہیں کاٹ کھاتے ہیں
کب یہ بدبخت ہاتھ آتے ہیں

میں بھی از بسکہ انکا ہوں استاد — قتل کی انکے رہے ہے مجھ کو یاد

چارپائی کو جب بچھاتا ہوں — چادر اک اُسپہ کھینچ جاتا ہوں

بعد ازاں رکھ سرہانے اک تکیا — سر کو رکھ اسپہ سو رہوں ہوں ذرا

اتنے میں سونگھ کر یہ بوئے بدن — جوں ہی یا صد ہزار حیلہ و فن

فرش چادر پہ ہو کے پھر بے غم — چلنے لگتے ہیں ایک اک از پئے ہم

میں بھی جلدی دیا منگا کے وہیں — گھس بتاتا ہوں خوب انکے تئیں

گرچہ پاتے رہے ہیں نت مالش — پر مری ان سے ہے وہی نالش

وہی راتوں کا جاگنا ہے ہنوز — اور وہی خواب صبحدم ہر روز

ان کی ایذا سے میں ہی کچھ نہیں دنگ — عرصہ کرم کتاب پر بھی ہے تنگ

یعنی مجھ پاس ہیں جو کچھ اجزا — دخل ان میں بھی کافروں نے کیا

ان میں جا کر ہوئے تو ہیں یہ بند — لفظ و معنی کے تئیں نہ پہونچے گزند

اور قلمدان میں جو گھسے جا کر — کیا نہ دیں گے مرے قلم کو ضرر

سو تو اس کی زباں ہے ایسی تیز — جس سے کرنے لگیں بریز بریز

خاصہ ہنگام ہجو کہنے کے — الاماں مانگتے ہیں سب جس سے

دشمن جاں یہ مصحفی کے ہیں — تشنہ خوں یہ ہر کسی کے ہیں

بیش و کم چلتی ہو زباں جسکی — چاہیئے ہجو ہی کریں ان کی

سردی نامہ

اب کے سردی کا جو ہوا ہے وفور — ڈھانپ کے منہ کو رہ گئے ہیں تنور

دیگداں گھر میں سب کے ہیں بیکار — یعنی آتش کا سرد ہے بازار

آئی ہے ہو کے زمہریر ہوا — ہے جہنم زمانہ سردی کا

بن رہے ہیں جو یخ ظروف تمام — برف خانہ ہے خانۂ حمام

عوض آتش کے ان دنوں اے یار — خاک کھاتا ہے مرغ آتشخوار

شمع تک جا کے کیا کرے گلگیر — شمع تو بن رہی ہے خود کشمیر

بیچ پانی کے جاڑے کے مارے — بچہ بط ہیں یخ بچے سارے

صاحب لقوہ جیسے ہے نومید — کانپتا نکلے ہے سحر خورشید

کہیں چمکے جو اک ذرا اخگر — پھر جو دیکھا تو ہیں وہ خاکستر

دلمیں سردی سے ہووے ہے اب درد — آتش عشق ہو گئی ہے سرد

آہ و نالہ میں وہ کہاں گرمی — دہر سے ہو گئی نہاں گرمی

اللہ لوں وے جو عشق کرتے ہیں — دمبدم آہ سرد بھرتے ہیں

برف باری ہے اس سحاب کا کام — نہیں اس رت میں آفتاب کا کام

ابر ہو و گل پوش آتے ہیں — دانت بجلی کے کڑکڑاتے ہیں

دیکھ پھیکا سا آفتاب کا رنگ — آتش لعل ہے نہاں در سنگ

جوہری گر کرے اب اسپہ نظر — پنبہ دانہ ہے دانۂ گوہر

باغ ہستی میں دیکھ کر یہ ہوا — سیب کیا کیا نہ سرخ و زرد ہوا

نہیں مطلق ہی کو اپنا ہوش — ناشپاتی روئی میں ہے روپوش
باغباں بھی نہ منہ کو ڈھانپتے ہیں — بید بھی اس ہوا سے کانپتے ہیں
مشک پاتا ہے قیمت کافور — سر پہ نافے کی ہے کلاہ سمور
جب غریبوں کے سر پہ آئے ہے رات — ہے ہم آغوشی ان کو زانو سات
سر پہ لیکر گلیم بخت سیاہ — گڑیں ناہیں گدا جو کر کر آہ
مار سرما نہ کاٹ کھائے کہیں — بیم سے پا دراز کرتے نہیں
اپنی حدت سے جو ہوئی ہے نفور — فلفل گرداب ہے خود کافور
فلفل سرخ کا کروں اظہار — ٹک ادھر کان دھر کے سن اے یار
اس کو گر تو زبان پر رکھے — اور ذرا اک تو اس کا مزا چکھے
تجھ کو یہ جو بجھاوے وہیں تا لب گور — یہی جانے کہ کھا لیا کافور
آگ سے شعلہ جو اٹھے ہے کبھو — وہ بھی کرتا ہے دمبدم ہوہو
سب کی مجمر پہ آنکھ رہتی ہے — جیسے ناسور ناک رہتی ہے
تھی جو گوگرد کی زمین کہیں — واں بھی گرمی کا نام خاک نہیں
ہے مزاج زمانہ جوں کافور — ہووے گرمی کسی میں کیا مذکور
تھی جنہوں کے مزاج میں سردی — اور بھی آ گئی ہے نامردی
دست و پا اپنے یخ جو پاتے ہیں — آگ پر کچھ گرے ہی جاتے ہیں
تپ کی نے حرف نے حکایت ہے — ہے تو سردی ہی کی شکایت ہے
عزت و ہیں نہیں رہی زنہار — صاف آتش پرست ہیں دیندار
سر بلاتے ہیں صاحب تمکیں — کوئی بھی جا گرم شعلہ نام نہیں

تھا سمندر جو آگ کا کیڑا
آگ ہی میں وہ ہو گیا ٹھنڈا

پاؤں چلنے سے ان کے ہیں بیکار
یہ تصور پھریں ہیں چوکیدار

چور چوری سے جی چراتے ہیں
شمع گھر بھاگ بھاگ جاتے ہیں

ہے دوشالوں کی یہ خریداری
نہیں آتی غریب کی باری

پشم پوشی پہ بسکہ مرتے ہیں
بعضے کمبل خرید کرتے ہیں

پشم پوشی سے اپنی کر کے زیب
سگ پشمی بنا پھرے ہے رقیب

دی ہے سرمانے کیا مجھی کو شکست
تا بجربا ہے آفتاب پرست

جن کے تن پر نہیں ہے اک لتا
کیا کہوں ہائے حال ہیں ان کا

آتش افروزی سے ہے سب سرکار
قرص خورشید پر ہے دن کا مدار

تھے جو بعضے خورندے پانی کے
اب وہ پانی ذرا نہیں پیتے

آگ کے بسکہ کھل گئے ہیں چھپے
ہنستے ہیں اس کو دیکھ دیکھ توے

حال کیا ہووے گا غریبوں کا
ہے روئی پر تو زور ہی لرزا

آپ کو بسکہ سرد پاتی ہے
خود وہ پردوں میں منہ چھپاتی ہے

طرفہ سردی ہے ان دنوں یارب
جس کے ڈر سے گلیم پوش ہیں سب

سنگ و آہن جو اب ہیں دوچار
برف ان سے جھڑے بجائے شرار

ہاتھ میں لیجئے گر انگارا
ہووے محسوس جیسے یخ پارا

دیکھیو شدت شب سرما
بن بجھائے چراغ ہے ٹھنڈا

جس طرف دیکھوں آگ کی ہو پکار
آگ کیا اک خدا کا ہے دیدار

مفلسوں کے بغل میں رہتے ہیں ہاتھ
ہیں نمد پوش آئینے دن رات

سرد دیکھی دکاں کبابی کی — اب کے جاڑے نے کیا خرابی کی

ہے نمکداں میں برف جائے نمک — خاک کھاویں گے بادہ نوش گزک

تھر کے پھر گئے بتان جہاں — ڈھونڈے کوئی گرم تو ہے کہاں

کر گئی ہے سفر حرارت تن — وہاں برودت کا اب ہوا ہے وطن

گرمی ہوتی نہیں ذرا اظہار — جیسے پانی ہے نبض کی رفتار

مصحفی اس ہوا میں کیا امکان — ہووے گرم سخن کسی کی زباں

ریختی گو

۱۔ سعادت علی خاں رنگین

۲۔ انشاء اللہ خاں انشاء

۳۔ جان

مرزا سعادت یار خاں رنگیں

رات باتوں میں ہمیں تو نے گذاری انا
صدقے تیرے کسی ڈھب سے اسے لا ری انا

سوچ اسکا نہ ہو گر مجھکو تو پھر کس کو ہو
جانتی تو نہیں کیا یانوں ہے بھاری انا

آٹھ آٹھ آنسو رلاتی ہے مجھے اسکی چاہ
روز و شب رہتے ہیں اشک آنکھوں سے جاری انا

ہونے جو ہوئے سو ہو بندی ملے کی شرطی
وصل کی اس سے زباں ابتو میں ہاری انا

اٹھتے ہی صبح کو آجاتی ہے رنگیں کے پاس
کہیو سب حال مرا میں ترے واری انا

چلو چل کر قطب صاحب میں جھولا ڈال کر جھولیں
دوگانہ مینہ برستا ہے مہینہ یہ ہے ساون کا

کروں قربان میں پشواز کو جالی کی کرتی پر
دوگانہ مجھ سے اٹھ سکتا نہیں ہے بوجھ آسن کا

جوانی سے وہ پھل پائے الٰہی نظر میری
وہ کون انساں ہے جو غش نہیں رنگیں کے جوبن کا

نیند آتی نہیں کمبخت دوانی آجا
اپنی بیتی کوئی کہہ اپنی کہانی آجا

ہاتھ پر تیرے موئے کسکے ہے چھلّے کا داغ
دی ہے یہ کس نے تجھے اپنی نشانی آجا

بال ماتھے کے جو ڈورے سے لئے ہیں تو نے
شکل لگتی ہے بڑی آج ڈرانی آجا

غم ہے رنگیں کو نہ میرا یونہی اس کے پیچھے
مفت برباد ہوئی میری جوانی آجا

سعادت خاں رنگین

جان دی راہِ محبت میں الٰہی صد شکر | بات جو ہم نے کہی تھی سو نباہی صد شکر
زخم کھا کر جو میں تڑپا تو لگا یوں کہنے | اچھا اچھا تو تڑپ کر مری تلوار کو توڑ
ہٹ ہے گر دل ہی پہ اسکی تو سلیماں نے ڈال | ایک دل کے لئے مت خاطرِ دلدار کو توڑ

جب کہا میں نے کہ میرے گھر چلو | تب مری گوئیاں نے اے رنگین پکار
گال پر انگلی کو رکھکر یوں کہا | میں ترے گھر جاؤں گی اے دور پار
کل جو میں نے کہا زنانخی سے | جی میں آتا ہے تجھ سے کیجئے عیش
تو لگی کہنے یوں وہ اے رنگین | بس بس اب مجھکو مت دلاؤ تیش
تو نے ڈھکا کے جو رنگین مجھے کل | لب کا بوسہ نہ دیا جانی ایک
میں نے اس سر کی قسم ہے اپنا | کیا رو، رو کے لہو پانی ایک

"انشا کی ریختی"

شرط ہے رکھنا لحاظ اتنی بھی تب ہو بے لحاظ
سانس مت بھر اد وگانا چپ ارے او بے لحاظ
سمدھنیں آویں گی تیری دیکھنے کو بیگما
ان کو تو یاں سے اٹھا دے ہو دیں جو جو بے لحاظ

ہوتے سوتوں سے کھوا اپنے چہ خوش لے وا چھوڑے
دال تے ہو یاں بھلا کہتے ہو کس کو بے لحاظ
نین متی اس قدر بن جایئے کیا فائدہ
تار سب جاویں گے بی انتی بھی مت ہویئے لحاظ

نہیں یاں کسی آشنا کی توقع — ہمیں ہے بس اپنے خدا کی توقع
اڑنچھو ہوئیں دائی جی تو کبھی کی — رہی اب تو بڑھیا دوا کی توقع
ارے بی بی سیدانی صدقے گئی تھی — مجھے ہے تمھاری دعا کی توقع
جنھیں برف و شورہ میسر نہ ہووے — انھیں ہو تو پچھوا ہوا کی توقع
نہ صاحب یہ جھوٹوں کے سر وار نکلے — نہ رکھے کوئی ان بچا کی توقع
پڑی ہے جو مشکل تو کیا ڈر ہے انشا
کہ رکھتی ہوں مشکل کشا کی توقع

نہیں جاتی کہیں مہمان مرے دل کا شوق — تم کو کیا اس سے دوا جان مرے دل کا شوق
ہم سے کیا اڑ سکے کوئی پیاری — لاکھ تاڑوں میں اپنی تاڑ ہے ایک

تم نے جو میرا اوڑھا دوبٹا ہے یہ دگانا بات کڈھب
لگتا ہے اس میں دونوں کو بٹا ہے یہ دگانا بات کڈھب
خط پڑھنے کو ڈیوڑھی کے اوپر چاہیے کوئی بوڑھا سا
انشا تو ہے یہ ہٹا کٹا ہے یہ دگانا بات کڈھب

لہر میں چوٹی کی تیری ڈر کے مارے کانپ کانپ
چونک چونک اٹھتی ہوں میں راتوں کو کہکر سانپ سانپ
نوج تم کو ٹھٹے پہ آتیں اے بڑی دائی الو
لوگ سب سوتے ہوئے تم نے جگائے ہانپ ہانپ
تو جو کہتی ہے کہ تجھکو بھا نپتا ہے اک جنا
کیا ڈرائے مجھکو لگتی ہے یہ تیری بھانپ بھانپ
ہے بڑا جگرا ترا انشاء رے تو تھر ہے
کب تلک میں تیرے کرتوتوں کو ڈھکوں ڈھانپ ڈھانپ

بس بلائیں مری نہ لے چٹ چٹ — اے دگانا تو ایک ہے نٹ کھٹ
دم دلاسا نہ دے عیش انا — چل چخی دور ہو پرے بھی ہٹ

تجھے کچھ شرم بھی ہے بیٹھ پرے او کمبخت — تاڑ جاویں گے برے لوگ ارے او کمبخت
سارے بھوتوں سے پرے ہے یہ موا خوجا خبیث
مجھکو گھورا ہی کرے ہے یہ موا خوجا خبیث
رات بھر کھانسا کرے ہے نیند آتی ہی نہیں
موت کے اب دن بھرے ہے یہ موا خوجا خبیث
تو نے کیا جوڑتا ہے اس کو مجھ تک کھینچ لا
دیکھیو کوکا اڑے ہے یہ موا خوجا خبیث

کوئی چاہت میں کسی شخص کے بدنام ہو نوج ۔ لے دوا جان وہ کمبخت برا کام ہو نوج

آ گیا تیری رضائی میں پسینا مجھ کو ۔ گرم ایسا بھی نگوڑا کوئی حمام ہو نوج

باجی کہتی ہیں کہ اک مردوے غیرش ہے تو ۔ مفت ایسا بھی کسی شخص پہ بہتان ہو نوج

کان کی لو میں گھسے موٹی سی بالی کیونکر ۔ جس کا ہو سوئی کے ناکے سے بھی ننھا سوراخ

بلائیں میں نے جو لیں ان کی کل چٹاخ چٹاخ
تو کس مزے سے کہا بیگما نے چل گستاخ

شب برات جو آئے تو دیکھیو انشا
کہ مچ رہی ہے پٹاخوں کی کیا چٹاخ چٹاخ

میں ترے صدقے گئی اے مری پیاری مست چیخ
مت جگا نیند بھرے لوگوں کو واری مست چیخ

کیوں مرا مغز پھراتی ہے اری مینا چپ
اڑ گئی دور بھی ہو جیسے گنواری مت چیخ

میں نے جو حوض میں ایک سم کی چھوڑی بطخ ۔ تو لگی دھوم مچانے یہ نگوڑی بطخ

ہے تو سہی اجی یہ نکیلا ازاربند ۔ لیکن کسی کا نوج ہو ڈھیلا ازاربند

ہے ظالم اے دگانا ترے ڈھیلے پائنچے ۔ نیفہ گلابی اور وہ نیلا ازاربند

جا کے کیلوں میں چھپو سب سے اکیلے ہو کر ۔ تاڑ لے کوئی تو تن جائیو کیلے ہو کر

یوں سمے دیں جا کے دوا مڑ کے ادھر سے چپکے ۔ انھیں حمام میں لے جاؤ طویلے ہو کر

خانمی چاہ ہے وہ جھاڑ پھاڑ سینکڑوں گھر کئے ہیں جن نے اجاڑ
جو مجھے ٹوکے سو الٹی کرے ہوتے سوتے کو اپنے کھاوے پچھاڑ
ٹوٹ جاوے کہیں یہ تیری چول ارے او بے سرے نگوڑے کواڑ
کس لئے اپنے ساتھ لاتی ہیں آپ ان لونڈیوں کی دھاڑ کی دھاڑ

ہے جو دروازہ وہ دوگانا کا اس میں بن چول کا کواڑ ہے ایک
اس کی زنجیر بھی نہیں لگتی آگے پھر شرم ہی کی آڑ ہے ایک

میں نے دیکھی ہے اس کے کان میں لونگ کیوں نہ خوش آوے مجھکو پان میں لونگ
سب ہے جگنائی ہوئی دوالی کی تھر ایک اس کے پاندان میں لونگ

بات آنوجی کی ہے ہرگز نہیں کچھ مانتی سچ تو یہ ہے بیگما تو نے برے سیکھے ہیں ڈھنگ
سینہ پہ مرے اپنے کھلے سر کے بال ڈال بے ریشہ ہیں یہ آم ارے ان کی بال ڈال
کیا چیز ہے جو دھیان میں اپنے نہیں ارے ہوں بات بات میں بھی اگر تو مجھے ڈال ڈال
جس دم چڑھائیں دائی کے سر بھیولا ان لوگ اس وقت میرے ہاتھ پہ اپنا اگال ڈال
تکیوں کو دھر کے اپنے بدل اٹھ پلنگ سے اپنا لحاف ان پہ اڑھا ان پہ شال ڈال
یارب لگائی آگ ہو جس نے یہ بیر کی پانی کے دیگ میں اسے لیکر ابال ڈال
ہولی میں جو گت ایسی بنی وہ کہ جس کو دیکھ آزاد لوگ بھول گئے اپنی چال ڈال
میں پھینک گئی ہوں چاہ میں اک ہوتے کے اوقات اس میلے بیر کو میرے دوگانا گھنگال ڈال
ہرگز غبار دل میں تو انشا سے کچھ نہ رکھ سینہ کی آرسی کو زنا خی اجال ڈال

جان صاحب

میں گری تو بھی گرا پانوں ترا تیرا ٹوٹا تیرے دل کو تو کل آئی مرا پہنچا ٹوٹا
قند والوں کے محلے میں گئی تھی مصری کھا کے ٹھوکر جو گری پانوں کا گٹا ٹوٹا
اے گل اندام یہ خوشبو جو چلی آتی ہے شاید عطار کے کیوڑے کا قرابا ٹوٹا
کیا لوں تاوان امینہ سے پری خانم میں چار پیسے کا تو یہ شیشہ تھا ٹوٹا ٹوٹا
کھا گئی بوٹ چرا کے تو بہانا تک مارا سر پہ باندی کے مرے پانوں کا جوتا ٹوٹا
باجی سمدھن ہے مری کرسی کی احمق سیدے بیٹھنے کو دیا داماد کو مونڈھا ٹوٹا

باغ کا میوہ اسے توڑ کے سب بھیجدیا
جان صاحب ہے بڑا ڈال کا آیا ٹوٹا

نہ عصمت سے یہ کام بی جان ہوگا کسی نے کیا اس پہ بہتان ہوگا
کہوں باجی اماں سے بربیرا ڈھونڈو یہ مجھ سے نہ ہرگز دوا جان ہوگا
نہ کر رات کو کنگھی سر میں تو اپنے زناخی بہت دل پریشان ہوگا
تم آئی ہو گھر میں وہ آئے گا کیونکر موا جان کے ایسا انجان ہوگا
مزا دوسری سے نہ پائیگا جیسدم مجھے چھوڑ کر تو پشیمان ہوگا

نہ ہونا اری جان صاحب پہ عاشق
ترا نام رسوا بنی جان ہوگا

مرے آگے نہ رو دکھڑا زناخی یار بار اپنا
تری باتوں سے ہوتا ہے اری دل بیقرار اپنا

دیا پھولوں کا گہنا سوت کو یہ خار ہے مجھ کو
نہ دل کیوں پھول سا کمھلائے اب نے بو بہار اپنا
پھنسا تا ہے یہی دل جان کے چاہت کے پھندے ہیں
اسی کمبخت پر چلتا نہیں کچھ اختیار اپنا
ہا گلشن سے خوش کانٹے سے بدتر ہم کو وہ سمجھا
کیا گلزار خاں پر دل فدا جنگلو ہزار اپنا
نہ بات اس سے کرا و مصری وہ بس کی گانٹھ ہے بھڑوا
نگوڑی جان کے بیری کو جانا تو نے یار اپنا
خدا نے پدمنی کو قوم میں ان کی کیا پیدا
بڑا ہر ایک سے رتبہ نہ کیوں سمجھیں چمار اپنا
ارے تو جان بک گیا کیا نور پتلی پر
تری جوتی کرے پانوں پہ اسکے سر نثار اپنا

دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا — میں تری تو جان میرا ہو گیا
پھر گئی ایکبارگی مرزا کی آنکھ — دیکھنا بی او ہی یہ کیا ہو گیا
دوستی کس مردے کی آجکل — حال یہ کیا دشمنوں کا ہو گیا
مر گئی میں جیتے جی اے بیگما — عشق میں گھر کھوج بیرا ہو گیا
کیا ہوا چل دور ہو تجھ سے موے — بیاہ میرا اور ہی جا ہو گیا
بیگما سچ بول تو ہے کیوں خفا — کچھ تو ہے نقصان تیرا ہو گیا

کیوں نہ ہو اس روح کو اے جان چین
آئے وہ دل شاد میرا ہو گیا

جب سے سایہ جن کا ان کو ہو گیا
بی پری خانم کو سودا ہو گیا

ایک نامحرم سے کنڈیا گھاٹ پر
آج محرم دل کا سودا ہو گیا

خوب بھڑکایا تھا اس کو سوت نے
بیں ہوئی جب گرم ٹھنڈا ہو گیا

نیک ہوں روشن تو کہتا ہے بُرا
منہ انھیں باتوں سے کالا ہو گیا

دیکھنا اس انکھ بندی کی چال ڈھال
کس قدر چربانک دیدا ہو گیا

مجھ سے موتی کھو گیا جوہر کا جو
کل تھا جھوٹا آج سچا ہو گیا

اب نظر میں ان کی میں چڑھتی نہیں
دل سے اتری جب سے چکلا ہو گیا

میں نہ بولی اس سے دو دن ایک رات
گلبدن جس دم وہ ترچھا ہو گیا

بل بہت کرتا تھا تکلے کی طرح
ایک ہی جھٹکے میں سیدھا ہو گیا

نوح کا طوفان ہیں آنکھیں مری
جس جگہ میں روئی دریا ہو گیا

کیا کہوں سن سن کے باتیں ہول کی
جان صاحب مجھکو دھڑکا ہو گیا

مرزا مزاج آپ کا جب سے بدل گیا
کس کس کا اُدھی جوڑ نہیں مجھ پہ چل گیا

تف اس بہادری پہ بنا مرد آپ کیوں
چھوڑا اڑاقہ میں نے ترا دل دہل گیا

کیں جسکے آگے باتوں میں جھرن نے گرمیاں
پتھر کا دل بھی موم کی صورت پگھل گیا

مالن بنے تو بہار بنی موتیا کا پیڑ
دالوں سے ٹھنڈ لیونکے بدن سارا پھل گیا

خورشید کیا کہوں انھیں آنکھوں کے سامنے
گرگٹ کی طرح رنگ زمانہ بدل گیا

تصویر ان کی دیکھ کے آنسو نکل پڑا
بچہ ہی تھا کھلونے پہ آخر مچل گیا

دے دے کے چھینٹے گر گیا مفلس سٹرن کو ہائے
سقا نگوڑا ابھی پری خانم کو چھل گیا

دائی یقین دل کو ہے گر جائے گا حمل
ننھا سا بچہ خواب میں کل پیٹ مل گیا

آنکھیں لڑا نہیں ان سے کہاری نے بانس کھائے
اور ڈکا میرے چونڈے پہ ڈولا اچھل گیا

دیوانی بن گئی تھی میں پریوں کی کھوٹ سے
چھوڑا طبق ہے جب سے مرا دل سنبھل گیا

کرتی ہے چوٹی کنگھی بڑھاپے میں بیگما
رسی زناخی جل گئی لیکن نہ بل گیا

اے جان ایسا چھاتی سے لپٹایا بھینچ کر
انگیا کا میری سارا مسالا مسل گیا

گھوڑی حمایتی نے عراقی کے ماری لات
سچ ہے مری زبان سے یہ ہاں نکل گیا

منہ زور سب ہیں جتنی ہیں نخاس و ایال
ان کا بدی میں نام ہی جیناں نکل گیا

بے تے کی مولوی نے فضیلت کی لاگ سے
دق ہو کے مدرسے سے الف خاں نکل گیا

جوتی سے کوڑا ایک قدم پر کریں گے وہ
اپنا تو پانوں بیچ سے گوئیاں نکل گیا

کل کا منور ناک کریا کی کاٹ کے
لڑکا بغل میں لے کے گلستاں نکل گیا

کوڑی نہ چرخی کھیتی ہیں چھلے کی کسبیاں
کیا مفت جان گھور کے پریاں نکل گیا

نظیر اکبر آبادی

آدمی نامہ

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال قطب غوث ولی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہی ہے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کئے
حتیٰ کہ اپنے زور و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا
شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا
یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہے نور
یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور
شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نماز یاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں
روپے کے ان کے پانوں میں سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں
کمخواب تاش شال دو شالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اک ایسے ہیں کہ جن کے بچھے ہیں نئے پلنگ
پھولوں کی سیج ان پہ جھمکتی ہیں تازہ رنگ
سوتے ہیں لپٹے چھاتی سے معشوق شوخ و شنگ
سو سو طرح سے عیش کے کرتے ہیں رنگ ڈھنگ
اور خاک میں پڑا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار
نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار
سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کے کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہے پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

روٹی نامہ

جب آدمی کے پیٹ میں آتی ہیں روٹیاں
پھولی نہیں بدن میں سماتی ہیں روٹیاں
آنکھیں پری رخوں سے لڑاتی ہیں روٹیاں
سینہ اوپر بھی ہاتھ چلاتی ہیں روٹیاں
جتنے مزے ہیں سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا
کرتا پھرے ہے کیا وہ اچھل کود جا بجا

دیوار پھاند کر کوئی کوٹھا اچھل گیا
ٹھٹھا ہنسی شراب صنم ساقی اس سوا
سو سو طرح کی دھوم مچاتی ہیں روٹیاں

جس جا پہ ہانڈی چولھا توا اور تنور ہے
خالق کی قدرتوں کا اسی جا ظہور ہے
چولھے کے آگے آنچ جو جلتی حضور ہے
جتنے ہیں نور سب میں یہی خاص نور ہے
اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں

آوے توے تنور کا جس جا زباں پہ نام
یا چکی چولھے کا جہاں گلزار ہو تمام
واں سر جھکا کے کیجے ڈنڈوت اور سلام
اس واسطے کہ خاص یہ روٹی کے ہیں مقام
پہلے انھیں مکانوں میں آتی ہیں روٹیاں

ان روٹیوں کے نور سے سب دل ہیں پور پور
آٹا نہیں ہے چھلنی سے چھن چھن گرے ہے نور
پیڑا ہر ایک اس کا ہے برفی و موتی چور
ہرگز کسی طرح نہ بجھے پیٹ کا تنور
اس آگ کو مگر یہ بجھاتی ہیں روٹیاں

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہی جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا اس نے کہئے یہ ہے دل کا نور کیا
اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سن کے تیرا گیا ہے شعور کیا
کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا
جتنے ہیں کشف سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

روٹی جب آئی پیٹ میں سو قند گھل گئے
گلزار پھولے آنکھوں میں اور عیش کھل گئے
دو تر نوالے پیٹ میں جب آئے ڈھل گئے
چودہ طبق کے جتنے تھے سب بھید کھل گئے
یہ کشف یہ کمال دکھاتی ہیں روٹیاں

شیخ ولی محمد نظیر اکبرآبادی

بڑھاپا

آگے تو پریزاد یہ کہتے تھے ہمیں گھیر — آتے تھے چلے آپ جو لگتی تھی کہیں دیر
لو آکے بڑھاپے نے کیا اور یہ اندھیر — جو دوڑ کے ملتے تھے وہ اب لیتے ہیں منہ پھیر

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

آگے جاتے تھے جہاں گلبدن اور یوسف ثانی — دیتے تھے ہمیں پیار سے چھلوں کی نشانی
مر جائیں تو اب منہ میں نہ ڈالے کوئی پانی — کس دکھ میں ہمیں چھوڑ گئی ہائے جوانی

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

ہم بھی تھے جوانی میں بہت عشق کے پورے — وہ کون سے گلرو ہیں جو ہم نے نہیں گھورے
اب آکے بڑھاپے میں کئے ایسے ادھورے — پر جھڑ گئے دم اڑ گئی پھرتے ہیں لنڈورے

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

کیا یار گیا ہم سے الٹ ہائے زمانہ — جو شخص کہ تھے اپنی نگاہوں کا نشانہ
چھیڑے ہے کوئی ڈال کے دادا کا بہانہ — ہنس کر کوئی کہتا ہے کہاں جاتے ہو نانا

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

پوچھیں ہیں جسے کہتا ہے کیا پوچھے ہے بڈھے — دیکھیں ہیں جسے کہتا ہے کیا دیکھے ہے بڈھے
بیٹھیں ہیں تو ہو دھوم کہاں بیٹھے ہیں بڈھے — آویں ہیں تو یہ غل کہ کہاں آوے ہے بڈھے

سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

بھنگ کی تعریف

ہیں اس نشے میں ظالم سو رنگ کے دھڑاکے — کونڈی کی ڈگمگاہٹ سونٹے کے سو کھڑاکے
گر دیکھتی ہوں تجھکو کچھ عیش کے جھڑاکے — تو جھاڑ اپنے پنجے اور سر کو جھڑ جھڑا کے

پی عاشقوں میں آ کر دو بھنگ کے پیالے
جو ایک دم میں تیرا گھر گھومے جھیر پالے

کیوں عبث بیٹھا ہو ڈالے کان میں غفلت کی تیل — خلق میں کیا کیا مچی ہے سبزی کی ریل پیل
کھول زلف عیش کو اور ڈال پیالے کا پتیل — پھر چڑھا دے آسمان عیش پر عشرت کی بیل

کونڈی سونٹے کو بجا اور دیکھ ٹک قدرت کے کھیل
چھوڑ سب کاموں کو غافل بھنگ پی اور ڈنڈ پیل

مرشد مولا سے پوچھا میں نے اے پیر زمن — میری کچھ لگتی نہیں اللہ سے دل کی لگن
سن کے بولے وہ بتائیں ہم تجھے اسکا جتن — جا شتاب اور جلد سبزی لیکے اک دو چار من

کونڈی سونٹے کا بجا اور دیکھ ٹک قدرت کے کھیل
چھوڑ سب کاموں کو غافل بھنگ پی اور ڈنڈ پیل

ریچھ کا بچہ

کہتا تھا کوئی جیسے یہاں آؤ قلندر
وہ کیا ہوئے اگلے جو تمھارے تھے وہ بندر
ہم ان سے یہ کہتے تھے یہ پیشہ ہے قلندر
ہاں چھوڑ دیا بابا انھیں بنگلے کے اندر
جس دن سے خدا نے یہ دیا ریچھ کا بچہ

سب کھا چکی اب مجھکو بھی کیا کھائیگی جھانپو
وہ کون سا دن ہوگا جو مر جائیگی جھانپو
شام گذر گئی یار نہ آیا رات بھی آدھی آن ڈھلی
آؤ پہر دس ... کھیلیں ٹھالی سے بیگار بھلی

غالب ۔ (انتخاب غزلیات)

غالب کی شوخیاں

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب — جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

جاتا ہوں جدھر اٹھتی ہے سب کی ادھر انگشت — یکدست جہاں مجھ سے پھرا ہے مگر انگشت

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی — بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

جفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایکدن — ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایکدن

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام — قدرت حق سے اگر حوریں یہی واں ہو گئیں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے — لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

اسد اللہ خاں تمام ہوا — اے دریغا وہ رند شاہد باز

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں — رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایکدن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں — ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ — سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں — آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ میرا ایمان ہے لیکن غالبؔ — خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

لے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ — جادۂ راہ کشش کافِ کرم ہے
اسدؔ قربانِ لطفِ جورِ بیدل — خبر لیتے ہیں لیکن بے دلی سے
ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے — وحشت کدۂ تلاش کرنے کے لئے
مغرور دغا نہ ہو کہ جوں کاغذ باد — ملتے ہیں یہ بدمعاش کرنے کے لئے
اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسدؔ — مال سنی کو مباح اور خون صوفی کو حلال
سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے — لذت سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں
تیرے بیمار پہ ہیں فریادی — وہ جو کاغذ میں دوا باندھتے ہیں
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب — گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور — تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں
اسد کو بوریئے میں دھر کے پھونکا موج ہستی نے — فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی
چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی — سائل بنے تو طالب اہل کرم ہوئے
افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو — اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو — روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
بسکہ ہیں در پردہ مصروف سیہ کاری تمام — استر ہے خرقۂ زہاد کا صوف مداد

تو پست فطرت اور خیال بسا بلند
اے طفل خود معاملہ قد سے عصا بلند

درس تپش ہے برق کو اب اسکے نام سے
وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

ستائش گر ہے زاہد اسقدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

بوسہ دیتے ہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
دل میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ
خلد بھی باغ ہے خیر آب وہوا اور سہی

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

بچتے ہیں مواخذۂ روز حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیدان وفا کا خوں بہا کیا

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اسکی گردن پر
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم برسے

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

نہ کہہ کہ طاقت رسوائی وصال نہیں
اگر یہی عرق فتنہ ہے مکرر کھینچ

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بیخودی
منہ سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
کیا وہ بھی بیگنہ کش و حق ناسپاس ہیں
حرفِ سخن نہیں ہے مجھ سے خدا نکردہ
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
گل کے لئے گر آج نہ خست شراب میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
ہمیشہ مجھکو طفلی میں بھی مشقِ تیرہ روزی تھی
مدعا در پردہ یعنی جو کہوں باطل سمجھ
مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے
دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
حریفِ مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز
شیخ جی کعبہ کا جانا معلوم
چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
لوگوں کو ہے خورشید جہانتاب کا دھوکا
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
کیوں رد قدح کرے ہے زاہد
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ

یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو
ہے نامہ بر کو اس سے دعوائے ہمکلامی
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
ہے سوئے ظن ہے ساقئ کوثر کے باب میں
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
سیاہی ہے مرے ایام میں لوحِ دبستاں کی
وہ فرنگی زادہ کھاتا ہے قسم انجیل کی
کبھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے
کھل گئی ہیچ مدانی میری
ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز
آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
جائے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے
آخر تو کیا ہے "اے نہیں ہے"

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمھیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزم یار غیر سے چاہیے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہو گی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادہ دوشنبہ کی بو آئے

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟

در خور قہر و غضب جب کوئی ہمسایہ نہ ہو
پھر غلط کیا ہے کہ ہمسایہ کوئی پیدا نہ ہو

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر

نزا ناصحت غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

خلد میں کہئے تو دوزخ بھی ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور بھی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی

دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار سے آوے

کہاں وہ اپنی اسیری کہاں وہ عیش قفس
کہ بیم برق بلا اور آشیاں کے لئے

اکبر الہ آبادی

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس

یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو اگر کرلے ایم۔ اے پاس

تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقّت میں بن جاؤں تری ساس

کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی
کجا عاشق کجا کالج کی بکواس

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود
نہیں منظور مغز سر کا آماس

یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ
تو استعفیٰ مرا باحسرت و یاس

تاکید عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے
پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

وصل ہو یا فراق ہو اکبر
جاگنا ساری رات مشکل ہے

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم
یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولیٰ

تھے معزز شخص لیکن انکی لائف کیا لکھوں
گفتنی دیج گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردی
بدھوا کڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال
خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کیساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کیساتھ

کی تھی پاپوش زنی جب ہوئی نالش دائر — کہدیا صلح کر لیتا ہوں جوتا واپس
واپسی گو تھی زبانی ہوئی نالش ڈسمس — ہوگیا کورٹ سے وہ شوخ اچھوتا واپس

کمزور ہے تیری صحت بھی۔ کمزور تری بیماری بھی
اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا بیمار پڑا تو مر نہ سکا

ظاہر کا ادب ملحوظ رہا باطن بھی مگر محفوظ رہا
واعظ سے ادھر اک بات سنی ساقی سے ادھر اک جام لیا

خدا کے باب میں کیا آپ مجھ سے بحث کرتے ہیں
خدا وہ ہے کہ جس کے حکم سے صاحب بھی مرتے ہیں

ملکی ترقیوں میں دوالے نکالئے — پلٹن نہیں تو خیر رسالے نکالئے
بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا — ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا
یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی — شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی
خوب فرمایا یہ شاہ جرمنی سے پوپ نے — وعظ ہم بھی کہتے ہیں لیکن نہ ہاں توپ سے
پری کی زلف میں الجھا نہ ریش واعظ میں — دل غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا

شیطان نے دیا یہ شیخ جی کو نوٹس — بالکل ہی گیا ہے زور اب آپ کا ٹوٹ
آئندہ پڑھیں گے آپ لاحول اگر — فوراً داغوں گا ایک ڈیفمیشن سوٹ

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں — مگر اندھیرے اجالے وہ چوکتا بھی نہیں

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
طول شب فراق کو تو ناپ دیجئے

اجل آئی اکبر گیا وقت بحث
اب الف کیجئے اور نہ بے کیجئے

ہم تو کالج کی طرف جاتے ہیں اے مولویو
کس کو سونپیں تمہیں اللہ نگہباں ہے

ظاہر ہوئی کمیٹی نہ کالج کی اک لکیر
آخر اسی لکیر کے سب ہو گئے فقیر

کتنے ہی بے وقار ہوں مرزا کو غم نہیں
کافی ہے یہ شرف کہ وفاتی سے کم نہیں

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

مس سے بیگم نے کہا کل تو کہاں اور ہم کہاں
ووٹ کی چرچہ میں کہا لکھا ہے یہ ہم تم کہاں

مس یہ بولی پڑھ کے نکلو تو ذرا اسکول سے
اور بھی چالیس نظر آئیں گی یہ عالم کہاں

باپ ماں سے شیخ سے اللہ سے کیا ان کو کام
ڈاکٹر جنوا گئے، تعلیم دی سرکار نے

کمیٹی میں چندے دیا کیجئے
ترقی کے ہجے کیا کیجئے

بے حجابی مری ہمسایہ کے خاطر سے نہیں
صرف حکام سے ملنے میں مزہ آتا ہے

ہمارے ملک میں ہونا ہے کیا تعلیم نسواں سے
بجز اس کے کہ یا وہ اور بھی گھبرائیں اماں سے

دوزخ کے داخلے میں نہیں انکو عذر کچھ
فوٹو کوئی لگا دے جو انکا بہشت میں

نہ نماز ہے نہ روزہ۔ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو خوشی پھر اسکی کیا ہو کوئی جنٹ کوئی جج ہے

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال
خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی
اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

معاذ اللہ کیا مجبوری تقدیر بسمل ہے
تڑپنا سامنے قاتل کے گستاخی میں شامل ہے

کھولی نہیں زباں کبھی فریاد کے لئے
آواز کیوں نشانہ ہو صیاد کے لئے

لکھے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

اسلام کو جو کہتے ہیں پھیلا بزور تیغ
یہ بھی کہیں گے پھیلی خدائی بزور موت

ہوئے اسقدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

بتوں کی مدح سے کل شاعری اردو کی مملو ہے
شکست اردو جو پائیگی تو میں سمجھونگا بت ٹوٹا

ناتوانی مری دیکھی تو مصور نے کہا
ڈر ہے کھنچ آؤ نہ تم بھی کہیں تصویر کیساتھ

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز
جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

کٹ گئی ناک حرم میں تو نہیں کچھ پروا
تھینک یو دیر میں سننے کیلئے کان تو ہیں

مرے صیاد کی تعلیم کی ہے دھوم گلشن میں
یہاں جو آج پھنستا ہے وہ کل صیاد ہوتا ہے

اودھ پنچ کے شعراء

(پہلا دور)

(۱) سجاد حسین
(۲) مرزا مچھو بیگ ستم ظریف
(۳) تربھون ناتھ ہجر
(۴) شہباز
(۵) منشی جوالا پرشاد برق
(۶) ظریف

سجاد حسین

چھپے ہیں قہقہے جو شوخیاں ہیں ہر طرف ۔۔۔ ہر جوہر سوفی الشمل فرخندگی فرخندگی
سال تاریخش جو ڈھونڈا ہاتف غیبی بگفت ۔۔۔ شیخ چلی آگئے دنیا میں باسنجیدگی

مرے دل کے مونڈھے پہ بیٹھو صنم تم ۔۔۔ تن زاد گھٹ کر ٹھمڑا ہوا ہے

تن ہو گیا ہے سوکھ کے کانٹا ببول کا ۔۔۔ اپنے تو حق میں عشق امر بیل ہو گیا

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں رسن ۔۔۔ دو ایک ہاتھ چاہ میں جب ڈول رہ گیا

نازیوں ہم نے بطرز دگر ایجاد کیا ۔۔۔ ساتھ سائیس کو لے گاؤں میں فرہاد گیا

سپردم زمین مایۂ خویش را ۔۔۔ وہ جانیں حساب کم و بیش را

عزیز و حق تعالیٰ کبریا ہے ۔۔۔ شرف جس نے عدالت کو دیا ہے

ہوئے بیچ کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں غرق در گڑھا
وہیں رہتے مثل مینڈھک وہیں خائیں غائیں کرتے

مرزا مچھو بیگ ستم ظریف

وہی محبوب کھٹیاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
وہی لہنگا وہی ساری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
وہی کھانا نہ پینا دس بجے جانا کچہری کا
نصیبوں کی وہی خواری جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے
وہی دولت کا نشا اور وہی ہرجے وہی خرچے
وہی پیسے کی بھرماری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
وہی دیوانوں کی سی دارات دن گردش وہی چکر
جنوں کی گرم بازاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے
اسی صورت سے ہے اب تک برے کی میان کا رہنا
طبیعت زیست سے عاری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

پنڈت تربھون ناتھ ہجر

حالی

سنبھل قومی اعزاز کے کھونے والے زمانے میں تخم حسد بونے والے
جہالت کے چشمے سے منہ دھونے والے خبردار او بے خبر سونے والے

گھٹا کی طرح چھا رہی ہے تباہی

تری قوم پر آ رہی ہے تباہی

عداوت کے شعلے کو بھڑکانے والے جہالت کی زنجیر کھڑکانے والے
دلوں کو ضعیفوں کے دھڑکانے والے نیا روز اک جوڑ بھڑکانے والے

یہ کیا نت نئی شعبدہ بازیاں ہیں

یہ کیا قوم میں رخنہ اندازیاں ہیں

اگر لکھنؤ میں تمھیں باخدا تھے بڑے نیک طینت بڑے پارسا تھے
اگر قوم میں تم ہی دھرم آتما تھے بڑے پاک باطن بڑے پارسا تھے

تو بہتر تھا گھر بار سب تیاگ دیتے

چلے جاتے کاشی میں سنیاس لیتے

یہ ذاتی تشخص یہ نخوت کہاں تک یہ پندار یہ عجب و نخوت کہاں تک
گیانوں سے اپنے یہ نخوت کہاں تک یہ مینڈھے لڑانے کی عادت کہاں تک

ذرا کھول کر کان سن اس سخن کو

ہے در پیش چہ آخرش چاہ کن کو

شہباز

تہذیب قیس

لیلیٰ کے کہنے سننے سے آخر کو قیس نے
لکھوایا نام نجد کے انگلش سکول میں

اے بی کے بعد پڑھنے گیا ایسی ٹڈ ریں
تعلیم خوش معاشی ہے جن کے اصول میں

پیٹابیر میں دیکھتا تھا انبساط کو
پاتا تھا انقباض فعولن فعول میں

ازبر تھے یو کلڈ کے تھیورم پرابلم
اقلیم حافظہ تھی گرامر کے رول میں

تھا تکیۂ کلام کی صورت زبان پر
کیا جانے کیا مزا تھا بھرا ڈیم فول میں

القصہ انٹرنس ہوا پھر ہوا ایف اے
بی اے، ایم اے کے پاس بھی آئے حصول میں

ہمت بڑھی کہ کیجئے بیرسٹری بھی پاس
رہ کر عرب میں وحشیوں کے ہوں شمول میں

لندن گیا تو اوک میں پانی لگا مزا
حاصل تھا وہ جو نجد کے بن کی ببول میں

آئی نظر جو اوک کی کرسی پہ یک مس
کھٹمل کی طرح عشق گھسا دل کی چول میں

بال اس کے سر پہ صاف شعاعیں تھیں مہر کی
ریشم کو جو شمار کریں جنس اول میں

گردن شکست دیتی تھی ظبی الفلاۃ کو
قامت و پا کے سرد کو بھرا تھا طول میں

پھل سیب نے لگائے تھے قامت کے شاخ میں
رنگت بھری تھی روزن عارض کے پھول میں

دیکھا جو یہ بجا نہ رہے قیس کے حواس
لگتی نہیں ہے دیر بلا کے نزول میں

مجنوں کو دھن کہ جلد ہوں وسکی وصال
تیری پڑی تذبذب رد و قبول میں

تیری کے کوٹ شب کا بڑھا تازہ ذوق شوق
لیلیٰ کا عشق کہنہ ملا خاک دھول میں

شہباز ہے کلام کا اکبر کے یہ جواب
لیکن بڑا ہے فرق فروع و اصول میں

معذرت انگریزی

ایک مرغے نے یہ مرغی سے کہا
لوٹتی ہے خاک پر کیوں بے تمیز
ہنس کے مرغی نے دیا اس کو جواب
جسم پر ملتی ہوں پوڈر اے عزیز
بولا مرغا ہے یہ پوڈر کیا بلا
بولی مرغی ہے یہ اک فیشن کی چیز
پوچھا مرغے نے کہ ہے فیشن یہ کیا
بولی مرغی بچہ کمفرٹ دا یز
ڈانٹا مرغے نے کہ انگریزی نہ بول
بولی مرغی تیرے سر میں ہے ڈزیز
مرغا جھنجھلایا کہ پھر پھر پھر وہی
مرغی بولی چپ بھی رہ اے بدتمیز

آثار اقبال

اہل اسلام ہیں اب راہ پہ آئے جاتے
ہیں کچھ آثار سے اقبال کے پائے جاتے
ہنس تو دیتے ہیں نہ دیں اثر غیرت سے
گر کبھی قوم کے خاکے ہیں اڑائے جاتے
دستخط چندوں کی فہرست پہ کر دیتے ہیں
دے بھی دیتے ہیں بہت گر ہیں ستائے جاتے
شوق سے بیف مٹن ہمرہ مسٹر بیکن
کھاتے سچ مچ ہیں جو جھوٹوں ہیں کھلائے جاتے
فاقہ کشی سے بھی زیادہ نہیں ان کو انکار
کورٹ شپ کے ہی اگر دام میں لائے جاتے
بار اٹھاتے ہیں وہ اکثر ولد الکلبوں کا
گر یتیموں پہ ہیں کچھ رحم دلائے جاتے

حضرت رمضان کا فوٹو

دو ہفتے سے گھر میں مرے والد رمضاں ہیں | جھلّے یہ کچھ ایسے ہیں کہ سب ان سے بجاں ہیں
ہے شام تہینوں ہی میں جاکر کہیں آتی | سنتے کہیں برسوں ہی میں مغرب کی اذاں ہیں
مسجد میں ہیں ترتیل و قرات کے وہ جھگڑے | آمین کی جا مقتدی کہتے الاماں ہیں
ہوتی ہی نہیں ختم کسی طرح سے رکعت | مغرب یہ تراویح کے یاروں کے گماں ہیں
مغرب ہی چلی جاتی ہے مغرب سے عشا تک | سن لیتے کبھی اس میں ہی مرغوں کی اذاں ہیں
مسجد سے جو آئے تو پھرے گھر سے خدا کے | الفاظ ہیں جو شکر کے سب وردِ زباں ہیں

داڑھی

بنائیں جھالرا سے عرش و کرسیِ رحمٰن | رکھیں فلک اسے سر پہ سمجھ کے کاہکشاں
لگائے آنکھ سے دیکھے جہاں اسے رضواں | ادب سے چھوٹتے ہی تو ہیں حور اور غلماں
نعیم خلد کی جھنڈی ہے درشنی داڑھی

وہ زباں جو ہے زبانوں کی کوئن | بولی وہ ہے جس کی ہر بولی کنیز
چھوٹ سکتی ہے چھڑے سے کہیں | جب تلک ہے کوٹ پتلون اور کمیز
جند اشتہاز کا حسنِ کلام | مرحبا باغِ فصاحت کی بریز
پادری نعیم نے احمد سے کہا | لو پڑھو انجیل سے سیکھو تمیز
بولا احمد اس کی اب حاجت نہیں | پڑھ چکا ہوں میں تو صاحب مسٹریز

جوالا پرشاد برقؔ

بحر طویل کا ایک نمونہ

(پہلا مصرعہ) دوش رفتم سوئے بازار، کسے یافتم عیار، زہر قید سبکبار، بہ تزویر گرفتار،
زخود رفتہ و سرشار، سبک خیز چو رہوار، تنش چون تن زنبور،
سیہ خال رخ حور، مثال شب دیجور، بہ برکوٹ و پتلون، بدن شکستہ ز صابون،
رخش زرد و دلش سرد، تن و جان ہمہ گرد، نہ او صاحب ایمان
و لے بندۂ شیطان، نہ ہندو نہ مسلمان، نہ از قوم نصاریٰ۔
(دوسرا مصرعہ) اُدَدُ بہر سمت بصد شوق، گہے تحت گہے فوق، گہے استاد و شاشید،
گہے جست و سرائید، گہے ٹھوکر و سیٹی، گہے چپاو و گہے کافی،
دُشمپیں و برآنڈی، گہے بیر و کلارٹ، گہے پاکٹ گہے جاکٹ،
گہے شیرے و گہے رم، گہے بگھی گہے ٹم ٹم، ہمیں شکر بہر دم،
کشتۂ حرص و ہوا را۔
(تیسرا مصرعہ) گفتم اے ہمسر فرعون، چرا می شدی مطعون، کسے نیست چو یارت،
چہ بود آخر کارت، ایں وضع کدام است کہ داری۔
چون شد ز فرد عاری، شیشۂ ننگ شکستی، در دانش بجہ بستی،
تونے دیوانہ و بدہوش، رہ عقل فراموش، بسر علم و ادب دور،
بہ مے گمرہی مخمور، بگو نام و نشانت، شوم آگاہ بجانت، مکن دیر خدا را۔

(چوتھا مصرعہ) گفتہ عدوے ناموس، بردڈ ام بگر ٹوس، ٹم آدمی ہے مالا،
یوسوو کالستالا، من صاحب لوگیم، فدائی بر میم، صاحب بلیلی نامم،
بجہان شہرۂ عالم، زرموزم توچہ دانی، کہ نا قابل آنی،
بزم ٹھوکرو تھپٹر، ایوگڈ امیر، شکنم روئے شمارا۔

(پانچواں مصرعہ) گفتم اے صاحب اوصاف۔ مزن بیہدہ لمن لاف،
بہ بن روے سیہ خویش، بنہ آئینہ در پیش شو طائر انقال،
مزن مفت پر دیال، بخور بسکٹ وہم کیک، مکن ترک رہ نیک،
بشو پیر وحسنات، برست از مزخرفات، بہ بیں صدق وصفا را۔

دکن کے قحط پر مرثیہ

ایک مرثیہ گو پر طنز

ملک دکن پہ قحط کی یارو چڑھائی ہے   چاروں طرف سے فوج تبہ کار آئی ہے
محتاج خانوں میں بھی خدا کی دھائی ہے   کالی گھٹا سی بھوک ہر اک سمت چھائی ہے

پھرتی امیدوار ہوں خواہش ہے کام کی
آؤ سبیل رکھی ہے کنگلوں کے نام کی

آئی گھٹا سی ریل بھرے تھے امیدوار   امڈی بلا کی فوج کہ منہ جن کے چار چار
یہ دیکھیے یار اور علی گڈھ کے سب سوار   آئی تھی طرف سے صدا بس بیا بیار

پھر دل پہ چھریاں تھیں وہ بلکیں اڑ رہی ہوئی
سمت جنوب غرب کی تھیں بالکیں مڑ رہی ہوئی

اک اور کھیپ آئی کہ اللہ کی پناہ ارغے وہ انگریز کہ بھئی واہ واہ واہ
تیور سے آشکار کہ پیسوں پہ ہے نگاہ آئے نہ کچھ خیال بھی گو خلق ہو تباہ
بگڑے ہوؤں کو اور بگاڑیں یہ زور تھا
مارا بدہ بدہ کا ہر اک سمت شور تھا

ظریف

مخمس

مسٹر پنچ ۔ گڈ مارننگ ۔ واللہ مانتا ہوں استاد کیا پھڑکتی ہوئی غزل مولانا ظریف کی آپ نے اپنے پرچہ اودھ پنچ مطبوعۂ ۱۲ ۔ اگست ۱۸۸۶ء میں طبع فرمائی ہے ۔ کہ دیکھتے ہی نیچریوں کے گرو گھنٹال اچھل پڑے ہوں گے۔

آج اس جانب کو تعطیل اتوار میں کچھ کام وام تو تھا ہی نہیں ۔ ہم نے کہا لاؤ اپنی غزل کو مخمس کر ڈالیں ۔ تمھیں واللہ نہ کہئے گا ۔ کیا مصرعہ لگائے ہیں اگر درج اخبار فرمائیے تو ہم جانیں کہ آپ آپ ہی ہیں ۔

وھو ہذا

اسی کا ہے خاص یہ مقلد جو پہلے موجد ہوا دغا کا
اسی کا منکر ہوا ہے ظالم کہ جس نے آدم کو پیلے ما کا
تمام فکر و فنوں میں کامل کیے ہوئے پاس بھی ریا کا
نظر پڑا ایک پیر نیچر نرالی سج دھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو سو برس کی یہ قہر آفت غضب خدا کا

تمام پتلون جاکٹوں میں ہر ایک جانب سے کرے جیبیں
کمی اگر ہو تو جیب میں بھی بنا کے دو چار دھرے جیبیں

جو کوئی کچھ دے کھلے خزانے نظر چرا کر وہ بھر لے جیبیں
جو دے کے لکچر وہ مانگے چندہ تو احمقوں کی کترے جیبیں
کہے جو اسپیچ بیوقوفوں پہ جال پھیلائے وہ دغا کا
نگاہ بد دور رنگ گورا گلے میں کالر وہ سرخ ٹوپی
بنی جی بھیجو کی وہ زلفیلیں بغل میں کتا وہ سرخ ٹوپی
چرٹ دھواں دھار تھوک منہ میں سیاہ پھندنا وہ سرخ ٹوپی
سفید داڑھی پہ کالا جوتہ اور اس پہ طرہ وہ سرخ ٹوپی
بدن پہ جاکٹ گلے میں پٹے سے عالم اس پر ہے اک بلا کا
گذر چکے ہیں جہاں میں ابتک ہزاروں عاقل کروروں مجنوں
بدل چکا ہے زمانہ کروٹ دکھا چکا ہے رنگ پیر گردوں
یہ ہو چکے ہیں کرشمے سارے نہ ہو مگر اب جو کچھ رہا ہوں
ہیں باتیں وہ سحر اور افسوں کہ سن لیں جس نے ہوا وہ مفتوں
غضب کے فقرے ستم کے جملے اور اس پر طرز بیاں بلا کا
کہاں ہے اس طرح کوئی ہر فن نئے جو ہر دم مچائے نخرے
کرے جو دنیا میں اور کوئی کہاں سے زائد وہ لائے نخرے
میں سخت حیران ہوں الٰہی غضب کے ظالم نئے پائے نخرے
بہت دنوں تک کئے کرشمے طرح طرح کے دکھائے نخرے
خدا کے بندوں کے دین و دنیا کو خوب اوٹا غضب خدا کا

بہت دکھائی ہے تم نے اب تک ہر اک قرینہ سے اپنی فطرت
بہت دنوں سے بڑھی ہوئی ہے تمھاری تیزی تمھاری جودت

تمھارے آگے رہی ہے باقی نہ عقلِ کل کی بھی کچھ فطانت
پر اب تو ان ہتھکنڈوں کی حضرت زمانہ پر کھل گئی حقیقت

یہ بوڑھے غمزے دکھا کے کب تک بھروگے تم سوانگ.... کا
بچائے آفت سے اس کی خالق لگائے ٹھکنگی جو آسماں میں

مٹیں وہ جھگڑے معاد کے سب ہوئے ہیں ظاہر جو خاکداں میں
ہر ایک ساعت بصد تفرع اٹھا کے دستِ دعا جہاں میں

ظریف کی ہے دعا الٰہی تو اپنے بندوں کو رکھ اماں میں
کہ دین و دنیا کی رہزنی میں وہ شوخ مشتاق ہے بلا کا

اودھ پنچ کی شاعری کا دوسرا دور

متفرق اشعار

کتنے گورے تھے سواروں میں تو کالے کتنے
ٹٹیاں پھاند گئے پھاندنے والے کتنے

دی منہ میں زباں آپ نے تا شکر کروں میں
کھلوائیے کنجی سے مرا قفل دہن آج

ٹوک دیں فیل نشینوں کو وہ بیباک ہیں وہ
پوچھ لیں حضرت موسیٰ کا سر طور مزاج

دل کی دل ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
لاٹ صاحب کی مدارات نہ ہونے پائی

بعد مدت مقر وعدہ خلافی وہ ہوئے
کھل گیا قفل دہن یار کا جھوٹا ہو کر

صبح کی توپ چل گئی دن سے
دونوں بہنیں نکل گئیں سن سے

آپ مشہور ہیں ہزاروں میں
ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں

زر علیہ السلام کے مارے
اتر آتے ہیں عرش کے تارے

ہم خوش ادھر ادھر وہ خوش اپنی پسند سے
ہم ہنکڑی سے شاد ہیں وہ دست بند سے

ہے فیض سے کسی کے شجر انکا باردار
اس واسطے کیا ہے تخلص امیدوار

ہزاروں ہار گئے نقد جاں سواری میں
جو آج دیکھ لیا آپ کی مجھولی کا

فرمائشوں میں جان بھی جائے گی ایکدن
دل لیکے پھر کہیں گے کلیجا نکال دے

جینے کا یہ مزہ ہے کہ دونوں ہوں بیقرار
دونوں طرف ہو درد کی زحمت لگی ہوئی

وبا ٹیکس افلاس قحط و گرانی
ملے ہند کو مہرباں کیسے کیسے

رنڈی کی تان سن کے جو بیخود ہوا فقیر | گفتا گرفت و یادِ خدا را بہانہ ساخت
خدا کا شکر کرتے ہیں جو پاتے ہیں وہ کھاتے ہیں | نہ شوق فارغ البالی نہ فکرِ تنگدستی ہے
آدمی زادہ چوں شود بے کار | یا شود دزد یا شود بے کار

ہم ہیں پھر ہم ہاں جی ہم دس بار ہم سو بار ہم
گھر میں ہم - باہر بھی ہم دالان ہم دیوار ہم

کسانوں کا سالِ نو

(۱۰) تمہید

جب سے بھئی یہ پچھلی بر کھا جاڑے سے نکسے لاگی جان
جوڑ سے تھر تھر دینہ کپت ہے ہوت کھتنا و سان
خطا حواس ۱۲
کوؤ دو پردے کا اوڑھت ہے اور سووت کوئی رجائی تان
رضائی ۱۲
کوئی بچاری بین ہاری بیٹھی پیست اپن پسان
سردی لگت ہے کھات پون ہیں نکسے جات ہیں تن سے پران

(۲) تقابل از سرمایہ دار

بات امیر کی نا ہیں بھیا جن کے پنر ہیں پیسا چار
پاس
کھات ہیں بیٹھے گھر ماں تاجی روٹی سکر گھی اور چٹنی اچار
تازی ۱۲

پہنے دگلا باندھے پھینٹیا جا تو بڑے بڑے سردار
پگڑی
اوڑھے کے گھر سے سال دوسالا میل کرت ہیں ہاٹ بجار
بہروں
بھوک ماں گھومت پا تر وہ زہ منہ دابے دوئی دوئی پان
تیسرا
زندگی
دبا کر

(۳) استرحام

حال گریب کا صاحب دیکھے تمہرے بھاگیں ہوش حواس
غریب
ہوش
کوئی بچارا ہے سسوا وت بھائی کمر یا ناہیں پاس
سسکیاں لیتا ہے
کمبل
کوئی اگھار کھیوں ہے بیٹھا رام سے اپنے لگائے آس
کہیں
کوئی کھوں ہے اگی تاپت گھر ماں اپنے کیے اپاس
افاقہ
اینٹھت کوئی روت کوئی یاک دنا کا ہے مہمان
ایک

(۴) ایضاً

کھو کا سردی دا بس، کوئی کھانسی سے بالکل بے حال
کوئی مرت ہے جاڑے کے مارے کیہو کی بھائی تن کی کھال
کوئی ہے تڑپت گدڑی کھاتر، جان کیہو کی ہے جنجال
خاطر
گوڑ سمیٹے کوئی بیٹھا کوئی کا ناہیں جہ بات بیال
بستر
بیا کل ہوئے گئے جاڑا کے مارے جات لہے سب کے اوسان
بے چین

(۵) غبطہ

سکھ ہے امیرن کھاتر بھیا۔ بدھنا لکھیس ہے چین آرام
کاتب تقدیر
بھوک کھلت ہے جاڑے ماں جنکی کھات ہیں تل کے لڈوا بدم
لڈو

انگا سُتھنا پہنے پھرت ہیں ۔ رنڈی باجی ان کا کام

یا کے یاک پتریا گھر ماں جن کی کھرچی ہمرے نام،

گھر ماں بیٹھو کھات مجے سے کلیا بھلکا اور پکوان

مزے ۱۲ قلیا ۱۲

(۶) ذکر اعیش

میتھی کی کھچڑی کوؤ بناوت کوئی بناوت ہے باجوم

معجون ۱۲

کونو پوہیڑا جنڈ ویت ہے کوئی گھولت جھبو ما جھوم

لبلبا ۱۲

کہوں تو بھیا بیاہ رچا ہے ۔ کہوں ہے بالک کیری دھوم

جشن ناس تولود ۱۲

کوؤ کرت ہے کہوں سکھاوت کوؤ بنا بیٹھا کاردم

سخاوت گر قاروں

ہم کا ڈر ہے پوارت کا بھیا جیسے بھٹے ہیں گم اوسان

ارکان ۱۲ جیسا کے ۱۲

(۶) حسن اعراض و تدبیر صبر

کوؤ گریب جو گھر سے کھیس ہے کھات ہے بیٹھا روٹی دال

خوش ۱۲

دن کا کما وا رات کا کھا وا گھر ماں نا ہیں الکھت مال

بھائی چدریا اوڑھ کے لیٹا اور بچھا بکھری ماں پیال

دیکھو تو گھر ماں کوڑی ناہیں چور کا کہ کو ہوئے کھیال

خیال ۱۲

کھائے بھرے کا ہے بھجائے روج روج ان کا بھگوان

روز ۱۲

(۷) حسن خطاب از تیج

بیچ بھیسل ہے جاڑے کی نیکی ہوئیں جو ٹینٹ پیا چار

فصل ۱۲

کھوب بنائیں ادھی کی کھچڑی اور منگائیں گڈ کا اچار

ابھی ۱۲ اودہر ۱۲

کبھو پکائیں روٹی پینتھی کبھو کریں کلیلا تیار
(کلیا ۱۲)

کبھوں اڑائیں بیٹھ کے دارو ہوئیں نسایاں بیس سرشار
(شراب — نشہ ۱۲)

کبھوں بجاویں کھنجڑی مجیرا کبھوں لگاویں تان کے تان

(مرلی ولدچیا)

ساقی نامہ رند قدیم

ساقی پلوا دے اک پیالا　　زندہ رکھے تجھکو حق تعالےٰ

انتیسواں سال اس صدی کا　　حامل تھا فساد اور بدی کا

صد شکر اٹھا جنازہ اس کا　　اب تک ہے وبال تازہ اس کا

ہو واقع رنج ہاں وہ شے دے　　کہتا ہوں صاف صاف دے دے

مرنے والے کے سن لے کرتوت　　کیونکر گزرا یہ پیر فرتوت

آتے ہی ادھم مچا یا کیسا　　جائے دوزخ میں ایسا تیسا

ساقی مے ارغواں کا دے جام　　بے حد کرنا ہیں آج تو کام

دفتر شکوے میں کروں باز　　انتیس کا حال کردوں آغاز

ماضی کا مرثیہ سنانا　　اور حال نو کا آلھا گانا

تقدیر میں میری لکھ گیا ہے　　فرماں ہے جو پنچ کا بجا ہے

تعمیل حکم ہے ضروری　　ہر حال میں میں کروں گا پوری

ہے گرم ملیریا کا بازار　　ہر ایک ہے بتلائے آزار

میں بھی ہوں مریض کانپتا ہوں　　گرمی سے تپ کی ہانپتا ہوں

پابندی وضع پر ہے لازم	ہوں پنچ کا میں قدیم خادم

ہر حال میں حکم مانوں گا میں	دکھ بیماری نہ مانوں گا میں

کہنا ہے خلاصہ حالِ ماضی	ہوں حضرت پنچ تاکہ راضی

تمہید تو ختم پر ہے ساقی	دکھ خم میں نہ اب شراب باقی

جتنی ہو پاس سب پلادے	اور پھر گرنک مٹر منگادے

دختِ رز کا جمال دکھلا	ساقی ماضی کی چال دکھلا

ہوں تاک میں اسکی کب سے ساقی	ملوالب جام لب سے ساقی

تاکسل طبع دور ہو جائے	ہلکا سا کچھ سرور آجائے

ہو بحر طبع میں روانی	مشکل مضموں ہو پانی پانی

ساری دنیا کو چھان ڈالوں	اور لب لباب پھر نکالوں

سب حال گزشتہ آئینہ ہو	ناظر کو خوشی ہر آئینہ ہو

اترا شحنہ ہے سال ماضی	مردک سے نہیں ہے کوئی راضی

اس نے کیسا ہمیں ستایا	سکرات کا ذائقہ چکھایا

آفت ہمراہ اس کے آئی	یعنے یہ تھی مزدِ رونمائی

رنجوری شہ کو دے دیا طول	علت ہوئی یہ بغیر معلول

صد شکر کہ تندرست ہیں شاہ	پیری میں چاق و چست ہیں شاہ

لیکن باقی ابھی ہے ناصور	ہوتا ہے دیکھیے وہ کب دور

انشاء اللہ دور ہوگا	ہم سب کے لیئے سرور ہوگا

دے جام برائے جارج پنجم	ساقی یوزپ کی عقل ہے گم

آیا طوفان برف و باراں — ساری خلقت ہوئی پریشاں
انساں مرے جہاز ٹوٹے — وہ داؤں پڑا کہ چھکے چھوٹے
ہنگامہ یہ بھی ہو گیا طے — ان سب کی یادیں بلائے
کابل میں ہوئی حبیب شاہی — افغانیوں کی ہوئی تباہی
بھشتی بچہ ہوا جہانگیر — تھی گردش چرخ کی یہ تاثیر
سقے کے جو یوں نصیب جاگے — منہ موڑ کے گھر سے شاہ بھاگے
سر سیوں کٹے ہتھیلی پر جمائے — کیا خیر بسنت کی منائے
افغانی رسوم کو بگاڑا — جھنڈا عیسائیت کا گاڑا
ملاؤں کو پادری بنایا — اضحوکہ دین کو بنایا
سیلاب کی رو میں ڈالی بنیاد — محنت کی مدتوں کی برباد
نادانی سے سب کیا کرایا — کاندھو کے نالے میں بہایا
بو دو جو زمیں میں کوئی بیج — ہوتا ہے درخت وہ بتدریج
یاں شاہ کو تھی ہمارے یہ دھن — ہو تخم درخت کہتے ہیں "کن"
جمہوریت کا کھیل کھیلا — گلشن کو بنا دیا طویلا
آخر خمیازہ یہ اٹھایا — گھر بھاگ کے اٹلی میں بسایا
عزت گئی ملک و مال چھوٹا — سقا بچے نے گھر کو لوٹا
محکوم ہیں غیر کے جو تھے شاہ — جو کوہ تھے بن گئے پر کاہ
ہیں پیر چرخ کی یہ چالیں — تا اہل زمانہ دیکھیں بھالیں
یوں چلتے ہیں بند کرکے آنکھیں — کھولیں دیدے گریں نہ آنکھیں

تنبیہ یہ بہر دیگراں ہے　　غفلت میں اگرچہ کل جہاں ہے
دستور کہن نہ بھولیے آپ　　قد قطع سے پہلے لیجئے ناپ

ضمیمہ اودھ پنچ

سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی

صوفیانہ خیالات کی بوکھلاہٹ کا جو نمونہ ایک ہمارے حیدرآبادی اجنبی دوست نے پیش کیا ہے اس قابل ضرور ہے کہ جب آپ کو خدا نخواستہ کوئی صدمہ یا ملال ہو تو اکیلے بیٹھ کے کمربند ڈھیلا کیجیے کرتا اتار ڈالیے اور توند پر ہاتھ پھیر کے اسے پڑھنا شروع کر دیجیے مگر باآواز بلند۔ اللہ نے چاہا تو پھر کوئی اثر باقی نہ رہے گا۔

اگر کہیں پڑھنے میں ناموزوں ہونے کی وجہ سے جھول پڑے تو زبان میاں دک کو تھوڑا سا جھٹکا دے دیجیے جھول صاف۔ جرس غائب۔ شکن ندارد۔ حرف اس ٹھوکر میں گر جائے تو بلا سے کون کہتا ہے کہ اس شعر کا آج تک جواب ہو سکا ہے

اللہ نے اللہ کو پانی نہ پلایا　　اللہ نے اللہ کے خیموں کو جلایا

اجی فَضَّلْنَا بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ خدا کی خدائی کبھی اہل کمال سے خالی نہیں ہوتی جو کمال سے دنیا خالی ہو جائے تو بس مرکز ثقل کرۂ ارض کا ٹل جائے اور یہ جس مداری (آفتاب) کی انگلی پر ناچ رہا ہے اسی کی انگلی میں موم ہو کر چپک جائے۔

"ایڈیٹر"

میں ہی سب میں ہوں ساری - اور حقیقت میں میں ہی سب ہوں
مظہر بھی میں ہی مظہر بھی میں ہی سب میں ہی سب میں ہی میں ہی

صیغہ بھی میں ہی مصدر بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
دولہا بھی میں ہی دلھن بھی میں ہی بچہ بھی میں ہی دایہ بھی میں ہی

شوہر بھی میں ہی زوجہ بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
لڑکا بھی میں ہی لڑکی بھی میں ہی عاشق بھی میں ہی معشوق بھی میں ہی

طالب بھی میں ہی مطلوب بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
گویا بھی میں ہی شنوا بھی میں ہی بینا بھی میں ہی عالم بھی میں ہی

خالق بھی میں ہی خلقت بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
گلشن بھی میں ہی غنچہ بھی میں ہی پھل پھول میں ہی پتا بھی میں ہی

عابد بھی میں ہی معبود بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
عارف بھی میں ہی معروف بھی میں ہی واصف بھی میں ہی موصوف بھی میں ہی

کاشف بھی میں ہی مکشوف بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
ساجد بھی میں ہی مسجود بھی میں ہی شاکر بھی میں ہی مشکور بھی میں ہی

سورج بھی میں ہی انجم بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
اعلیٰ بھی میں ہی ادنیٰ بھی میں ہی مداح بھی میں ہی ممدوح بھی میں ہی

شاہد بھی میں ہی مشہود بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
اول بھی میں ہی آخر بھی میں ہی ظاہر بھی میں ہی باطن بھی میں ہی

مومن بھی میں ہی کافر بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی

مسجد بھی میں ہی معبد بھی میں ہی نیوٹن بھی میں ہی کرشن بھی میں ہی
عیسیٰ بھی میں ہی موسیٰ بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
مجنوں بھی میں ہی لیلیٰ بھی میں ہی وامق بھی میں ہی عذرا بھی میں ہی
افلاطوں بھی میں ہی لقماں بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
شرزہ بھی میں ہی آہو بھی میں ہی اژدر بھی میں ہی مچھلی بھی میں ہی
چیونٹی بھی میں ہی مکھی بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
قاتل بھی میں ہی مقتول بھی میں ہی ساقی بھی میں ہی میکش بھی میں ہی
مجرم بھی میں ہی زنداں بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
دیول بھی میں ہی دیوی بھی میں ہی ہندو بھی میں ہی مسلم بھی میں ہی
سایہ بھی میں ہی پیکر بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
معلوم میں ہی مجہول میں ہی محسوس میں ہی معقول میں ہی
موجود میں ہی موصول میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
دانا بھی میں ہی ناداں بھی میں ہی محرم بھی میں ہی بیگانہ میں ہی
ہم شمع و ہم پروانہ میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
نزدیک میں ہی اور دور میں ہی موسیٰ بھی میں ہی اور طور میں ہی
ہوشیار میں ہی مخمور میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی
گلشن بھی میں ہی صحرا بھی میں ہی دنیا بھی میں ہی عقبیٰ بھی میں ہی
قطرہ بھی میں ہی دریا بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی

ہم ذات میں ہی ہم صفت میں ہی ہم فعل میں بھی ہم اثر میں ہی
ہم تن بھی میں ہی ہم جان بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی

ہم خاص میں ہی اور عام میں ہی ہم کفر میں ہی اسلام میں ہی
آغاز میں ہی انجام میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی

سالک بھی میں ہی مجذوب بھی میں ہی شاہد بھی میں ہی محبوب بھی میں ہی
صانع بھی میں ہی صنعت بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی

صنم بھی میں ہی صمد بھی میں ہی ازل بھی میں ہی ابد بھی میں ہی
احد بھی میں ہی صمد بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی

بیچوں میں ہی باچوں میں ہی مسرور میں ہی مکنون میں ہی
الفاظ میں ہی مضمون میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی

انوار میں ہی ظلمات میں ہی مہ و سال میں ہی دن رات میں ہی
رائی بھی میں ہی مرئی بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی

منصور میں ہی اور دار میں ہی عطار میں ہی شبلی بھی میں ہی
موسیٰ بھی میں ہی اور دار میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی

نخچیر میں ہی صیاد میں ہی مقتول میں ہی جلاد میں ہی
شاگرد میں ہی استاد میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی

ہم نبی میں ہی ہم علی میں ہی ہم غوث میں ہی ہم ولی میں ہی
ہم خفی میں ہی ہم جلی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی

ہم جسم میں ہی ہم جان میں ہی ہم اسم میں ہی ہم شان میں ہی
ہم ہستی و ہم عرفان میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی

ہم مرسل و ہم جبریل میں ہی ہم وحی و ہم تنزیل میں ہی
ہم حدیث میں ہی ہم دلیل میں ہی سب میں ہم ہیں ہی سب میں ہی میں ہی

ہم قہر میں ہی ہم جلال میں ہی ہم لطف میں ہی ہم جمال میں ہی
حافظ بھی میں ہی قادر بھی میں ہی سب میں ہی میں ہی سب میں ہی میں ہی

رباعیات مشتمل بر واقعات واہیات

راؤنڈ ٹیبل کا ہے جو عمدہ سامان
پہونچے ہیں بہت شوق سے ہندی مہمان
دل کہتا ہے یہ کہتے ہوئے بیٹھیں گے
اونچی دو کان اور پھیکا پکوان

محفل میں رقیبوں کے ستم ہم نے سہے
منہ کھول کے بیدرد ہے جو کچھ کوئی کہے
یوں ہی ہوں گے ذلیل و رسوا ہر دم
سہہ سہہ کر ظلم ہم جو خاموش رہے

سب بیٹھے ہیں محفل میں مگر ہم ہیں کھڑے
یہ دیکھ کے ہم شرم سے جاتے ہیں گڑے
کیا فائدہ کچھ کہنے کا تذلیل کے بعد
ہم بھی ہیں جہاں بھر میں بے شرم بڑے

کیوں پوچھتے ہیں کہ ہے ترے منھ میں زباں؟
ہوتی نہ زباں تو آتے کیوں آج یہاں
دھڑکا یہ ہے دل میں ہم بھجوں کی بیٹھیا
گونگے کا خواب ہو نہ یہ سب سامان

ہم روتے ہیں کبھی مچل جاتے ہیں ۔ اور آپ دلاسا دے کے بہلاتے ہیں
کہتے ہیں کہ دیں گے تم کو چندا ماموں" ۔ وہ آئے وہ آئے دیکھو وہ آتے ہیں

منظور جو ہو وہ دیجیے جلد انعام ۔ نام آپ کا ہو اور ہمارا ہو کام
یہ لو وہ لو کہیے نہ دے جھنجھنی بھی ۔ ایسے کا ڈھپور سنگھ ہوتا ہے نام

کیا تاب کہیں جو ہم حکومت کو کوارڈ (بزدل ۱۲) ۔ ہم تو سرکار کے ہیں موروثی یارڈ
جو کوک بھری گئی تھی وہ ختم ہوئی ۔ تھے ہم تو گراموں کے صرف رکارڈ

کہتے ہیں یہ ریمزے نے کہ خالق کے لئے ۔ لوگوں نے پڑھاوے جو ہیں تم سب کو دیئے
دیکھو زنہار منہ پہ وہ آنے نہ پائیں ۔ چپ بیٹھے ہر ایک ہونٹ اپنے سیئے

مانا کہ حکومت نے یہ پیٹا ہے ڈھول ۔ تحریر کی کر رہی ہے وہ ہم سے ٹھٹھول
ہے گردش بخت اس کو کیا کیجیے گا ۔ ہو جاتی ہے (آزادی کی ۱۲) گول میز پہ عقل بھی گول

آزادی سے کر رہا ہے ہر ایک تقریر ۔ سامع بھی تمام چپ ہیں مثلِ تصویر
مانند کمال لچک تو دکھلائی مگر ۔ جو تیر ترازو ہو وہی ہے بس تیر

ہے موسم سرما میں یہ دیپک کی الاپ ۔ وہ آگ میں گرمی ہے نہ ہے آنچ نہ بھاپ

ہم جانتے ہیں مگر نتیجہ' کانفرنس　　لٹکائے ہوئے آئیں گے ہونٹوں کو آپ

اسپیچیں ختم۔ ہو گیا ٹھنڈا جوش　　ہو جائیں گے آپ محو خواب خرگوش
جادو کی چھڑی کا اک کرشمہ تھا یہ　　جو بن گئے گول میز پر باد فروش

ہندی ندیم

کہنہ شاعر اور نیا سال

اودھ پنچ کی دعوت اور نخاس کا مال

معلوم شد کہ دور چرخ و گردش زمانہ پر گریہ و بکا ظریفوں کی عادت میں بھی داخل ہے گزشتہ اتوار کو اینجانب علیہ الرحمہ مٹر گشتی کرتے نئے نخاس پہونچے جس میں پرانا مال اکثر مل جاتا ہے۔ ایک بیاض ملی مگر کیڑوں کی چالی ہوئی۔ نصف حصہ کرم کی خوراک ہوا باقی چاک چاک ہوا۔ خدا جانے کن صاحب نے سال کی رخصتی کا مرثیہ کہا ہے۔ بندہ یہ بھی نہیں جانتا کہ کبھی چھپا تھا یا اچھوتا ہے بہر کیف وہ غم اچھا جس کا نتیجہ خوشی ہو وہ خوشی بری جس کا انجام غم ہو۔ اب کی ریت بدل دیجیے اور حضرت رند قدیم کے ساقی نامے یا مثنوی پر اس مسدس کو مقدم رکھیے۔ خدا کرے سال کا خاتمہ بخیر ہو لکھنے پڑھنے والوں کی مرادیں بر آئیں اودھ پنچ کا بول بالا ہو۔ شاعر قدیم فرماتا ہے ؎

یہ پیر چرخ حد کا دنی اور بخیل ہے　　ہے دشمنوں کا دوست عدو کا کفیل ہے

ناشاد و نامراد و سفیہ و ذلیل ہے — محتاج کا سوادر ئیسوں کا فیل ہے

اس ٹیڑھے ترچھے منھ پہ اکڑفوں کو دیکھیے

جھک کر کماں بنا قدِ موزوں کو دیکھیے

پانی طلب کرو تو یہ دے خونِ دل سی شے — انگور مٹھاس گر تو چٹا دے مگس کی قے

راحت کے بدلے رنج دے دارو کے بدلے مے — مثل و نظیر اس کا نہ ہوگا نہ تھا نہ ہے

وسواس موت کا ہے نہ ڈر انتقام کا

یہ چرخِ پیر ایک ہی ہے اپنے نام کا

بچوں سے انس اسکو نہ بوڑھوں سے میل ہے — چیرہ بانک ہے ستم کا یہ دیدہ دلیل ہے

سر چھینا جوانوں کا تو اس کا کھیل ہے — اس پکے خونی کو نہ سزا ہے نہ جیل ہے

دن رات ایک رنگ ہے اس بدمعاش کا

شمس و قمر سے شغل ہے ہر وقت تاش کا

بھئی چار بند کیڑوں نے سنے اور دوسروں کے سننے کے لئے باقی نہ رکھے۔ بندہ صرف ناقل ہے ورنہ غائب شدہ بند بڑھا دینا کوئی بڑی بات نہیں مگر تحریف فی الظرافت ناجائز ہے۔

یہ چرخِ پیر رنگ بدلتا ہے دم بہ دم — سینے میں غم کلیجے کو ملتا ہے دم بہ دم

آنکھوں سے اشک خوںنکلتا ہے دمبدم — دل کو تڑپ پہ کوئی کچلتا ہے دم بہ دم

بیٹھے ہیں دانت بند ہے منھ حال تنگ ہے

فریاد! بے گناہ پہ قیدِ فرنگ ہے

لے اعلانِ نون بعد اضافت مقتضائے ظرافت ہے۔

باقی نہیں زمانے کی چیزوں میں کچھ بھی ست — گھی کی طرح سے اہلِ دل کی بری ہے گت
ہے صرف دھوبیوں کے تصدق میں اب یہ پت — سگریٹ شراب اور جوئے کی بڑھی ہے لت
چوری ہے سینہ زوری ہے بغض و نفاق ہے
الفت ہے میل جول ہے نے اتفاق ہے

شدت ہے مفلسی کی غریبی کا دور ہے — افلاس کا ہجوم نحوست کا جور ہے
صورت پہ بیکسی کے برسنے کا طور ہے — انصاف کا مقام ہے اور جائے غور ہے
رنگ اڑ گیا رخوں سے چمک ہے نہ روپ ہے
گرمی سے کچھ بڑھی ہوئی جاڑوں کی دھوپ ہے،

ہر سو ترقیوں پہ ہے زورِ انقلاب کا — نقشہ بگڑ گیا ہے جہانِ خراب کا
پیری کا لطف ہے نہ مزا ہے شباب کا — برہم مزاج ہو گیا ہر شیخ و شاب کا
جو ہے وہ اپنے حال میں آفت رسیدہ ہے
گوشہ کمال کا زاغ کماں سے کشیدہ ہے

(کئی بند غائب۔ مگر کہیے سبحان اللہ!)

القصہ اس کے جور کہاں تک کریں رقم — سودے چکے ہیں قط پہ رکا جاتا ہے قلم
شور تجا لفو سے سناتے ہیں رنج و غم — پھرتے ہیں اصل حال کی جانب بس اب تو ہم
مضمون نئے نئے ہیں نکلتے پٹارے سے
جو خوب چکنے چپڑے ہیں اور پیارے پیارے سے

پھر شاہد کلام کی اے دل جھلک دکھا — اے اشہبِ قلم مجھے سیدھی سڑک دکھا
اے بحرِ فکر جوششِ بحر اٹک دکھا — اے تازہ باغِ نظم گلوں کی مہک دکھا

بزمِ سخن میں لارڈ مکالے "سُنے کوچ" لوں
بلبل مقابلہ جو کرے دم کو نوچ لوں

اے قلب نامراد و حزیں سوگوار ہو — اے برق آہ کوند کے گردوں کے پار ہو
دُرہائے اشک کا مری گردن میں ہار ہو — اے نالہ سطح چرخ پہ جا بے قرار ہو
بارہ کمی ہے وفات کا غم چل کے زور کر
تھرائیں بارہ برج یہ گردوں پہ شور کر

ہے ہے وہ بارہ کون ہیں بارہ مہینے ہیں — شفاف گورے گورے بلوری نگینے ہیں
دیکھے سنے بھی ایسے تڑاقے کسی نے ہیں — کیا تازے پھول چرخ ستمگر نے چھینے ہیں
کلیاں مہک رہی تھیں کہ اک ہاتھ پڑ گیا
غنچہ ابھر کے کھلنے نہ پایا کہ سڑ گیا

یہ بچے مرنے والے اگرچہ تھے دل کے سخت — قاروں کی طرح تھے یہ دنی اور تیرہ بخت
لیکن وہ گول چہرے وہ رنگت وہ انکے رخت — کس پیڑ کے یہ میوے تھے کس باغ کے درخت
افسوس آگے پیچھے تڑا پڑ گزر گئے
بتیس دن کے بھی نہ ہوئے تھے کہ مر گئے

پہلے تو جنوری سے ملی آن کر قضا — گرتے ہی ذبح ہو گیا مانند مرغ ۔ ہا!
رگڑا ابھی وہ پڑا کہ نہ تسمہ رہا لگا — چڑیا سی جان پھر سے اڑی وا مصیبتا
کیا شاد شاد پھرتا تھا وہ چیں پیں بول کے
آخر کو پھر سے اڑ گیا پر جھپ سے تول کے

پھر فروری کو آکے دبایا یہ گرد فر — پھر مارچ کو جھپٹ کے جو مارا تو پھوٹا سر

اپریل کی فول کر کے جو پیچھے سے لی خبر　　یہ تینوں لوٹ پوٹ گئے بس بہ رنگ خر

مے کو مثال بادہ کے غٹ سے نگل گئی

جوں کی طرح سے جون کو چٹکی سے مل گئی

جولائی کو سمجھ کے یہ چولائی کھا گئی　　لقمہ کیا، اگست کو جب یہ بلا گئی

بن بھائیوں کا جبکہ ستمبر کو پا گئی　　بسکٹ کی طرح یا ؤ منٹ میں چبا گئی

منھ مارا اس طرح سے کہ سب دانت گر گئے

مرغی کے بچے بلی کے پنجے میں پڑ گئے

اکتوبر آ پھنسا تو اسے بھی ہڑپ کیا　　چینجا کیا وہ لاکھ مگر کچھ نہ بس چلا

نوچا کھسوٹا خون پیا پیٹ کو بھرا　　پھر چکھ گئی پلٹ کے نومبر کو بے حیا

دورہ کیا جو پھر تو دسمبر کی جان لی

ٹنڈٹنی حرام خورنی نے خوب تان لی

جب بارہ بارہ باٹ ہو گئے یہ بارہ ماہ آہ　　بیچارے باپ ماں کا ہوا گھر تباہ آہ

چلتے تھے پر سجھائی نہ دیتی تھی راہ آہ　　ہر بار اٹھتے بیٹھتے کرتے تھے آہ آہ

آبائے علوی سب کے لیے جاں کھوتے تھے

بادل کی طرح ساتوں فلک مل کے روتے تھے

ساری کمائی لٹ گئی جب ایک سال کی　　کچھ حد نہ تھی فراق میں رنج و ملال کی

چاروں طرف تلاش کیا دیکھ بھال کی　　ہڈی تلک ملی نہ کسی بد سگال کی

کاٹا تڑپ کے روز بسر رو کے رات کی

کنین کی طرح تلخ تھی لذت حیات کی

تھا ان کے پیارے باپ کو بھی صدمۂ عظیم — حالت و لیکن مادرِ گیتی کی تھی سقیم
رو رو کے بین کرتی تھی جس دم وہ دل دو نیم — تھا دل جو پھوڑا ڈھیروں نکلتی تھی اس سے پیم

دن سخت رات سخت کٹھن اسپہ گھڑیاں تھیں
اور سرخ منھ پہ خون کے سہرے کی لڑیاں تھیں

کہتی تھی بار بار کہ پیارو کدھر گئے — اے اپنی ماں کے راج دلارو کدھر گئے
اے بابا لوگو ماں کے سہارو کدھر گئے — اے میرے اس زمیں کے ستارو کدھر گئے

دنیا فطرت میں کالی سے اندھیر کر گئے
اے میرے گورو چٹو تم افسوس مر گئے

کیا ایک سال کے لیے آئے تھے تم یہاں — ہے ہے ہوا نہ کھائی تھی جو آ گئی خزاں
پھولے پھلے نہ چھین کیا ہائے میری جاں — قربان نثار صدقے تصدق فدا یہ ماں

برباد مجھ کو کرنے کی دل میں سما گئی
اے میرے پیارو کس کی نظر تم کو کھا گئی

آگے کیڑے چاٹ گئے عجب نہیں کہ غم کی داستان کا زہر کھا کے کیڑے بھی عدم آباد کے دور میں پھنس گئے ہوں۔ چونکہ اینجانب غم دوست نہیں لہذا ضرورت ہے کہ دو چار آخری بند اپنی طرف سے بھی گڑھ کے سال نو کا خیر مقدم فرمائیں۔

بس اے قلم کہ سب کو ہنسانا ہے تیرا کام — مصنوعی آنسوؤں پہ نہ کر ختم تو کلام
دفعِ الم کے واسطے ساقی سے مانگ جام — پی قرض کی جو دینے کو تھیلی میں ہوں نہ دام

آیا ہے تازہ سال شگون نیک چاہیے
اک گجّی اور شراب کا خم ایک چاہیے

ایسی نظم سے خدا سمجھے

خدا کے فضل سے معزز "بندے ماترم" لاہور بھی تو اب ایک روزانہ ادبی پرچہ ہو گیا ہے۔ "بندے ماترم" پر کیا منحصر ہے ابھی ہر ایک روزنامہ "ہندوستان" بھر کا [illegible] ادیبوں سے آراستہ ہے۔

چوتھی ستمبر کے "بندے ماترم" میں ایک قومی ترانہ جناب عشرت رحمانی مدیر "نیرنگ" دہلی کا نظر سے گزرا۔ واہ کیا کہنا۔ نظم کو سہل اور آسان بنانے کی کوشش پر آج کل ہر ایک اردو کا ادیب مستعد نظر آتا ہے ہم نے ارادہ کیا تھا اس تمہید کو بھی اسی وزن پر نظم کر دیں مگر پھر دل نے کہا کہ بندے ماترم کے اس نمبر میں جتنی سرخیاں ہیں سب اسی وزن پر موزوں ہو سکتی ہیں۔ تعجب ہے کہ ہمارے کرم فرما گنپت رائے صاحب غشل بی اے نے کیوں تمام سرخیاں نظم سے محروم رکھیں پہلے جناب شاعر کی طباعی ملاحظہ ہو:- فرماتے ہیں۔

قومی جھنڈا کامیاب

انقلاب

کامیاب - انقلاب

زندگی کا دور ہے — دور ہی کچھ اور ہے

مصلحت بے غور ہے — قومیت پہ ہے شباب

انقلاب

قومی جھنڈا کامیاب

کامیاب - انقلاب

چرخے کی جو دید ہے		قوم کی یہ عید ہے
رنگ یہ جدید ہے		جلوہ گر ہے آفتاب

انقلاب

قومی جھنڈا کامیاب
کامیاب - انقلاب

ہندو مسلم سکھ عیسائی[1]		سارے ہندی بھائی بھائی
دیں گے ملک کو رہائی		اٹھ چکا ہے اب حجاب

انقلاب

قومی جھنڈا کامیاب
کامیاب - انقلاب

ہوگا ہند پھر نہال		دور ہوگا یہ زوال
چھوڑ دو بدیشی مال		توڑ دو خم شراب

انقلاب

قومی جھنڈا کامیاب
کامیاب - انقلاب

دیش کا لباس ہو		ہند کو یہ راس ہو
سب بدیشی ناس ہو		یہ ثواب ہے ثواب

---

[1] یہ شعر غالباً پریم کے سوورق سے ماخوذ ہے ۱۲

انقلاب

قومی جھنڈا کامیاب

کامیاب - انقلاب

چرخے کا چلن ہو آج　　سر پہ کھادی کا ہو تاج

یہ ہے ہند کا سوراج　　ہے اسی میں رعب داب

انقلاب

قومی جھنڈا کامیاب

کامیاب - انقلاب

دور پر بہار ہے　　عشرت ترار ہے

اور خیال کار ہے　　آپ بھی کہیں جناب

انقلاب

قومی جھنڈا کامیاب

کامیاب - انقلاب

"ترانہ" باصطلاح امیر خسرو ان بے معنی الفاظ کا نام ہے جو راگ کا نقشہ کھینچنے کے لیے ارتجالاً فراہم کرلیے جائیں۔ مثلاً "توم تنانا - توم تنانا - انی درِ درِ درِ درِ تانی - تنوم"۔ مذکورۃ الصدر ترانہ بھی "کشتہ" ارتجال (زود گوئی) ہونے کے سبب سے اکثر جگہ بے معنی ہو گیا ہے تو کوئی عیب نہیں یا وزن شعری سے قطع تعلق کرکے "ایقاع" یعنی "گے" کا مرید ہو گیا تو مضائقہ ندارد۔ آواز کی گھٹ بڑھ سے بندے ماترم کی سرخیاں نظم کرنے میں ہمیں بھی ارتجال ہی سے کام لینا پڑا ہے

بلکہ ہم نے ایک اور وصف بھی اس ادبی ہر ہفت عروس میں بڑھا دیا ہے جسے کہتے ہیں "قطع کلمہ" منظوم عنوانات میں قافیہ کی پابندی مشکل تھی پھر بھی جہاں کہیں داؤں چل گیا قافیہ بھی ٹھونس دیا گیا ہے۔ اعجاز۔ اعجاز۔ واللہ اعجاز۔

ہم ہیں صادق القول اس وجہ سے اقرار کیے لیتے ہیں کہ یہ طریق نظم ہمارے دماغ کی ایجاد نہیں یہ کمال اُردو ڈرامے کے مولفین کا ہے جب انھیں "لے دار" گفتگو کی ضرورت ہوئی تو انھوں نے اپنی تالیف کو یہ سانہ رہنے دیا معنی د بے معنی کلمات "ٹھیکے" یہ کے بول سے ملا کے کٹورا ابھر دیا مثلاً:۔

صف شکن تیغ زن آؤ آؤ آؤ آؤ

پیلکن پیل تن آؤ آؤ آؤ آؤ

تہمتن گو رکن آؤ آؤ آؤ آؤ

کھٹ پھٹ گنا نادر چنّا

پتّا بیڑی لونگ سپاری

آؤ آؤ آؤ آؤ

عقلا اور صاحبان حلم نے حماقت کی جو اردو کی اس ترقی یافتہ شکل کو ہذیان سمجھے خدا سلامت رکھے جہلائے وطن کو انھوں نے ازراہ دانشمندی ابواب ترقی کی پاسبانی اور قدر افزائی فرمائی۔ دیکھ لیجیے آج یہی ہذیان ہے جس میں زمانے بھر کے ادیب مبتلا ہیں۔ اُردو زمین پر پاؤں نہیں رکھتی۔

خیر تمہید فضول ہے۔ نظم سرخیاں ملاحظہ ہوں:۔

ڑ۔ زانہ بندے ماترم

کامیاب

— ناآیاب ۔ ناآیاب

جہاز راجپوتنا سے اہل ملک درانگ ،

یہ زوں کے انم انتخاب لاجواب

ڑ۔ زانہ بندے ماترم

کامیاب

جہاتماجکا پیغم نائیاب نائیاب

چٹاکانگ کے خو فناک ہند مسلم

فساد کی مزی و تفصیلات

ڑ۔ زانہ بندے ماترم

کامیاب

نائیاب ۔ نائیاب

ابھی کرو یا ربا کل بند پڑڑا ہے

بند پڑڑا ہے بند پڑڑا ہے

ڑ۔ زانہ بندے ماترم

کامیاب

پیچ تاب ۔ پیچ تاب

جہاز راجپوتانہ سے اہل ملک اور انگریزوں کے نام جہاتماجی کا پیغام

چٹاکانگ کے خوفناک ہندو مسلم فساد کی مزید تفصیلات ۔ ابھی کاربار بالکل بند پڑا ہے

بارودولی کے معاہدہ کی خلاف ورزیوں کی تحقیقات ۱۵ ستمبر سے شروع ہوجائیگی

بارودولی کے معا ے کی خلاف ورزیوں
کی تحقیقات پندرہ ستامبر سے شروع
ہوجائے گی

ڈ۔ زانہ بندے ماترم
کامیاب
التھاب ۔ انتساب

کانگریس اور گورنمنٹ دونوں کے گواہ پیش ہونگے اوران گواہوں پر جرح کیجائے گی

کانگریس اور گو رنمنٹ دونوں کے گوا
پیش ہونگے اوران گواہوں پر جراح کی
جائے گی جائے گی

ڈ۔ زانہ بندے ماترم
لاجواب
نایاب ۔ کامیاب کامیاب

فیڈرل کمیٹی کا اجلاس ملتوی اب پندرہ ستمبر کو ہوگا

فیڈرل کمیٹی کا اجلاس ملتوی
آپندرہ ستمب کو ہوگا ہوگا ہوگ ہو
اجتناب

ڈ۔ زانہ بندے ماترم
بے شمار بے حساب
کامیاب

گول میز کا نفی رنس کے برطانوی
ڈلی گٹوں کو وازی رہند کی طرف سے
داعِ وات

ژ۔ ژانہ بندے ماترم
بے حساب کامیاب

[گول میز کانفرنس کے برطانوی ڈیلیگیٹوں کو وزیر ہند کی طرف سے دعوت۔]

پراج چیں کاہنی کے قتل کے ملزم کی
پرے وی کون سل میں اپیل کی جائے گی
ژ۔ ژانہ بندے ماترم
کامیاب ۔ بے جناب
کامیاب ۔ کامیاب

[راج چیں کہانی کے قتل کے ملزم کی پریوی کونسل میں اپیل کی جائے گی]

صدر اسمبلی شملے پہنچ گئے پہنچ گئے
پہنچ گئے پہنچ گئے پہنچ گئے پہنچ گئے
ژ۔ ژانہ بندے ماترم
کامیاب ۔ بے جناب
کامیاب
لاجواب ۔ فرش خواب

[صدر اسمبلی شملے پہنچ گئے]

ہندو کاشمیر ڈے پر۔ رنا جائے
زقیود ۔ کامیاب پُر عذاب پُر عتاب
پُر شباب

[ہندو کشمیر ڈے پر ناجائز قیود۔]

ڈ۔ زانہ بندے ماترم

انقلاب

اضطراب۔ کامیاب

امرت سر کے قالین بافوں اور مالکوں
میں سمجھوتا ہو گیا مزدور کام پر واپس
آ گئے

امرت سر کے قالین بافوں
اور مالکوں میں سمجھوتا ہو گیا
مزدور کام پر واپس آ گئے

کامیاب۔ انقلاب

آفتاب

ر۔ زانہ بندے ماترم

معاملات کاشمیر میں بیرونی مسلما
نوں کی مداخلت میں لمانان اسے نا

معاملات کشمیر میں بیرونی مسلمانوں
کی مداخلت۔ مسلمانان کشمیر
اسے ناپسند کرتے ہیں
سری نگر۔ ۲۰ ستمبر

بے حجاب

رعب داب کامیاب

منجلاب

ر۔ زانہ بندے ماترم

پسند کرتے ہیں سری نگر سری نگر

بیس میں ستام بر کی سب سے خبر

ناصواب

انقلاب - شیخ و شاب

ر۔ زانہ بندے ماترم

مولانا شوکت علی یروشلم میں

ملانا شوکتل لی (آیروشلم تو ندلی)

پہنچ گئے یروشلم یروشلم یروشلم

میں ایں

اسے جناب انقلاب

کامیاب

ر۔ زانہ بندے ماترم

برخلاف دیگر دعوے داران ظرافت کے ہم نے - اودھ پنچ کے ناظرین کے سامنے "ہفوات" کے نمونے کبھی پیش نہیں کیے نہ وہ اس کے عادی ہیں کہ علم و حسن اخلاق و اصلاح ملک و قانون نہ ادب کے فوائد جن مضامین میں نہ ہوں ان کی جانب دیر تک متوجہ رہیں اس لیے خیال ہے کہ لوگ آزردہ خاطر نہ ہو جائیں، صرف ایک ہی صفحہ کے عنوانات قلم برداشتہ نظم کر دیے گئے واللہ ذرسی جو محنت کرنی پڑی ہو - ہم بھی اس امر پر قادر ہیں کہ پورے آرٹکل کو ترانہ بنا دیں اور جو کوئی اردو سے کسی قدر واقف و ماہر ہو وہ بھی قادر ہے۔

اینجانب حیران ہیں کہ اسے ادب اُردو کی دم میں شاخسانہ سمجھیں یا قابل قدر اضافہ ان صاحبان جرائد کو خدا سلامت رکھے جو مسلسل اُردو رسالوں ....

.... اور اخباری کاغذوں کے ذریعہ سے مطبوعات کو گنجینۂ مہملات

لہ برائے بیت آید سخن ۱۲ منہ

واہیات بناتے چلے جاتے ہیں اور اس کی پروا نہیں کرتے کہ اگر کوئی صاحب عقل سلیم بقول جناب ترانہ نگار "عشرت تزاد" کے مرض میں مبتلا ہو کے لطائف ادب کا جویاں ہوا تو کمبخت کو اُردو سے نفرت ہو گی یا رغبت اور اسے ملے گا کیا؟ خاک!

برا ماننے کی بات نہیں۔ ایسے نظموں کا قدرداں بھی مصنف ہی کے بھائی بندوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

خدا سمجھے ایسی نظم سے — خدا سمجھے ایسی نظم سے
خدا سمجھے ایسی نظم سے — لاحول ولا قوۃ

راقم خاکسار ادبار الادب والجرائد

نوٹ حضرت! جب دنیا نے تھیٹر کے بے معنی الفاظ پر ناک بھوں نہیں چڑھائی اور نہ اس کے نزدیک "کھٹ پٹ گتا۔ قدرت چنا" کے سے الفاظ اردو کے حق میں مضر ٹھہرے تو یہ ترانے جن کے الفاظ بعض مواقع پر مرتبط محسوس ہوتے ہیں کیوں اردو کے لیے زہر سمجھے جائیں۔

ہاں یہ اعتراض صحیح ہے کہ صاحبانِ قلم اپنے قلمی مددگاروں کے پاس خاطر پر زبان اُردو کی صحت کو قربان کر رہے ہیں۔ خود بھی دوسروں کی نگاہ میں بدمذاق اور سخن ناشناس قرار پاتے ہیں اور دوسرے جہلا کو بھی "ادیب کامل" بے محنت اور بغیر دشواری کے بن بیٹھنے کی جرأت دلاتے ہیں۔

جب ایک نظم یا نثر بے معنی اپنوں کی خاطر سے درج کر دی گئی تو دوسرے مقلد سے یہ عذر پیش نہیں کر سکتے کہ دیدہ بھائی واللہ منہ پر کہنا خوشامد ہے تم تو نرے

مہمل گو ہو" اس کا لحاظ پہلے ہی سے کرنا تھا۔ گزشتہ نمبروں میں مسٹر حیات اللہ (حیوٰۃ اللہ) انصاری کا ایک مضمون شائع ہو چکا ہے (رسالے کی کامیابی کا راز) مضمون کے مؤلف نے ملکی ادبی رسالوں کی ایڈیٹری میں جتنی لیاقت اور استعداد کی ضرورت ہے اسے خوب واضح کر دیا ہے۔ ان رسالوں کا وجود ہی اس امر کی قوی دلیل ہے کہ بیہودہ گوئی پر تحسین و آفرین کرنے والوں کی افراط ہے۔ ابھی تک چھوٹتے ایک ادبی یا مزاحی پرچہ نکلتا ہے اگرچہ اس میں اپنے باقی رکھنے کی طاقت نہیں ہوتی پھر بھی دوسروں کا مذاق تو بگاڑ دیتا ہے، یہی کیا کم ہے۔ سعدی تو اگلے زمانے والے تھے خدا معلوم کیا سمجھ کے کہہ گئے:۔

"محال ست کہ ہنرمنداں بمیرند و بے ہنراں جائے ایشاں گیرند۔" پنچ

اقبال کے طنزیہ اشعار

کہا مجاہد ترکی نے مجھ سے بعد نماز
طویل سجدہ ہیں کیوں اسقدر تمہارے امام

وہ سادہ مرد مجاہد وہ مومن آزاد
خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نماز غلام

طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے
ورائے سجدہ غریبوں کو اور ہے کیا کام

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اسکو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اے مردِ خدا تجھکو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
بیچارہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

محکومی و مسکینی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

کہا اقبال نے شیخ حرم سے
تہِ دیوارِ مسجد سو گیا کون

ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون

کہن ہنگامہ ہائے آرزو سرد
کہ ہے مرد مسلماں کا لہو سرد

بتوں کو میری لادینی مبارک
کہ ہے آج آتش اللہ ہو سرد

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اسکی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھکر ہے یہ تیزاب — سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا — موزوں نہیں مکتب کیلئے ایسے مقالات
ہے حق میں غلاموں کے یہی تربیت اولیٰ — موسیقی و صورت گری و علم نباتات

میں بھی موجود تھا واں ضبط سخن کر نہ سکا — حق سے جب حضرت ملا کو ملا حکم بہشت
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف — خوش نہ آئینگے اسے حور و بہشت و لب کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل قال و اقوال — اور تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا — اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

اقبال کو شک اسکی شرافت میں نہیں ہے — ہر ملت مظلوم کا یورپ ہے خریدار
یہ پیر کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے — بجلی کے چراغوں سے منور کئے افکار
جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل — تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
ترکانِ جفا پیشہ کے پنجہ سے نکل کر — بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے — حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبہ کو آتش کدۂ پارس — چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ اطفال بنا کر — چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا — اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے
نہیں زمانۂ حاضر کو اس میں دشواری
جہاں قمار نہیں زن تنک لباس نہیں
جہاں حرام بتاتے ہیں شغل میخواری
بدن میں گرچہ ہے اک روح ناشکیب و عمیق
طریقۂ اب وجد سے نہیں ہے بیزاری
جسور و زیرک و پردم ہے بچۂ بدوی
نہیں ہے فیض مکاتب کا چشمۂ جاری
نظر ورانِ فرنگی کا ہے یہی فتویٰ
وہ سرزمین مدنیت سے ہے ابھی عاری

کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی
اے شیخ حرم تیری مناجات سحر کیا؟

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکہ میں ملّا ہو غازی

ڈاکٹر اقبال

مشرق میں اصول دیں بن جاتے ہیں
مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے
واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے

وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

بستے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط — آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ

ممبری امپیریل کونسل کی کچھ مشکل نہیں — ووٹ تو مل جائینگے پیسے بھی دلوائیں گے کیا
میرزا غالب خدا بخشے بجا فرما گئے — ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

اٹھا کے پھینک دو باہر گلی میں — نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ — نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں — پرانے جھوپڑوں میں ہے ٹھکانا دستکاری کا
مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا — کوئی اس شہر میں محکمہ نہ تھا سرمایہ داری کا

جوشؔ ملیح آبادی

فتنۂ خانقاہ

اک دن جو بہرِ فاتحہ اک بنتِ مہر و ماہ
پہنچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ
زُہّاد نے اٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ
ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لا الٰہ

برپا ضمیرِ زہد میں کہرام ہو گیا
ایماں دلوں میں لرزہ براندام ہو گیا

یوں آئی ہر نگاہ سے آوازِ الاماں
جیسے کوئی پہاڑ پہ آندھی میں دے اذان
دھڑکے وہ دل کہ روح سے اٹھنے لگا دھواں
ملنے لگیں شیوخ کے سینوں پہ داڑھیاں

پرتو فگن جو جلوۂ جانانہ ہو گیا
ہر مرغِ خلد حسن کا پروانہ ہو گیا

اس آفتِ زمانہ کی سرشاریاں نہ پوچھ
نکھرے ہوئے شباب کی بیداریاں نہ پوچھ

عالم تھا وہ خرام میں اس گلعذار کا
گویا نزول رحمتِ پروردگار کا

گردن کے لوچ میں خمِ چوگاں لئے ہوئے
چوگاں کے خم میں گوئے دل و جان لئے ہوئے
رخ پر لٹوں کا ابر پریشاں لئے ہوئے
کافر گھٹا کی چھاؤں میں قرآن لئے ہوئے

آہستہ چل رہی تھی عقیدت کی راہ سے
یا لَو نکل رہی تھی دلِ خانقاہ سے

آنکھوں میں آگ، عشوۂ آہن گداز کی | لہریں ہر ایک سانس میں سیلاب ناز کی
پلٹیں ہوا کے دوش پہ زلفِ دراز کی | آئینے میں دمک، رخِ آئینہ ساز کی

آغوشِ مہر و ماہ کی گویا پلی ہوئی
سانچے میں آدمی کے گلابی ڈھلی ہوئی

ساون کا ابر، کاکلِ شبگوں کے دام میں | موجیں شرابِ سرخ کی آنکھوں کے جام میں
رنگِ طلوعِ صبح، رخِ لالہ فام میں | چلتا ہوا شباب کا جادو خرام میں

انسان تو کیا یہ بات پری کو ملی نہیں
ایسی تو چال کبکِ دری کو ملی نہیں

ڈوبی ہوئی تھی جنبشِ مژگاں شباب میں | یا دل دھڑک رہا تھا محبت کا خواب میں
چہرے پہ تھا عرق، کہ نمی تھی گلاب میں | یا اوس موتیے پہ شبِ ماہتاب میں

آنکھوں میں کہہ رہی تھیں یہ موجیں خمار کی
یوں بھیگتی ہیں چاندنی راتیں بہار کی

ہاتھ اس نے فاتحہ کو اٹھائے جو ناز سے | آنچل ڈھلک کے رہ گیا زلفِ دراز سے
جادو ٹپک پڑا نگہِ دل نواز سے | دل ہل گئے جمال کی شانِ نیاز سے

پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ اک سمت پھر گئی
اک پیر کے تو ہاتھ سے تسبیح گر گئی

فارغ ہوئی دعا سے جو وہ مشعلِ حرم | کانپا لبوں پہ سازِ عقیدت کا زیر و بم
ہونے لگی روانہ بہ اندازِ موجِ یم | انگڑائی آ چلی تو بہکنے لگے قدم

انگڑائی فرطِ شرم سے یوں ٹوٹنے لگی
گویا صنم کدے میں کرن پھوٹنے لگی

ہر چہرہ چیخ اٹھا کہ ترے ساتھ جائیں گے
اے حسن، تیری راہ میں دھونی رمائیں گے
اب اس جگہ سے اپنا مصلّے اٹھائیں گے
قربان گاہِ کفر پہ ایماں چڑھائیں گے

کھاتے رہے فریب بہت خانقاہ میں
اب سجدہ ریز ہونگے تری بارگاہ میں

سورج کی طرح زہد کا ڈھلنے لگا غرور
پہلوئے عاجزی میں مچلنے لگا غرور
رہ رہ کے کروٹیں سی بدلنے لگا غرور
رخ سے جوان تو کے پگھلنے لگا غرور

ایماں کی شان عشق کے سانچے میں ڈھل گئی
زنجیرِ زہد سرخ ہوئی، اور گل گئی

پل بھر میں زلف لیلیٰ تمکیں بگڑ گئی
دم بھر میں پارسائی کی بستی اجڑ گئی
جس نے نظر اٹھائی، نظر رخ پہ گڑ گئی
گویا ہر اک نگاہ میں زنجیر پڑ گئی

طوفانِ آب و رنگ میں زہاد کھو گئے
سارے کبوترانِ حرم ذبح ہو گئے

زاہد، حدودِ عشقِ خدا سے نکل گئے
انسان کا جمال جو دیکھا پھسل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ، حسن کی گرمی سے جل گئے
کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے

القصّہ دین، کفر کا دیوانہ ہو گیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بت خانہ ہو گیا

نازک اندامان کالج سے خطاب

چھین لی تم نے نسائیت سے ہر شیریں ادا
مرحبا اے نازک اندامان کالج مرحبا

جنگ سر پر اور یہ محبوبیت چھائی ہوئی
ناز سے نیچی نگاہیں۔ چال اٹھلائی ہوئی

انکھڑیوں میں عشوۂ ترکانہ دکھلاتے ہوئے
سینٹ کی خوشبو میں روحِ ناز پر تولے ہوئے

"خال و خد" سے جذبہائے صنفِ نازک آشکار
لرزتی چہروں میں زن بننے کے ارمان بے قرار

الحذر! یہ جنبشِ مژگاں کا شیریں ارتعاش
عزت آرا کا دل ہے جس کی رو میں پاش پاش

الاماں! یہ زینتیں موزے ہیں گو اترے ہوئے
ذوق ہے گھنگرو کا گیٹس پاؤں میں پہنے ہوئے

ریشمی رومال سے ہے فرقِ نازک پر بہار
اوڑھنی پر دیدنی ہے راہ کا گرد و غبار

نازکی کا مقتضی پتلی چھڑی باندھے ہوئے
شوق کنگن کا کلائی پر گھڑی باندھے ہوئے

جنگ اور نازک کلائی پیچ میں تقدیر کے
مڑ نہ جائے گی نگوڑی بوجھ سے شمشیر کے

پاؤں رکھتے ہو دمِ گل گشت کس کس ناز سے
اے مری قمریاں رن میں نکلو گے اسی انداز سے

دیر سے توپوں کے منہ کھولے ہوئے ہے روزگار
سینۂ گیتی میں ہے جس کی چمک سے خلفشار

شغلِ زینت سے تمھیں فرصت مگر ملتی نہیں
کیا تمھارے پاؤں کے نیچے زمیں ہلتی نہیں

ماتم آزادی

اے عیش خانۂ ہندوستاں نہ پوچھ
روداد جام بخشیِ پیرِ مغاں نہ پوچھ

بربط سے کیوں بلند ہوئی ہے فغاں نہ پوچھ
کیوں باغ پر محیط ہے ابرِ خزاں نہ پوچھ

کیا کیا نہ گل کھلے روش فیض عام سے
کانٹے پڑے زبان میں پھولوں کے نام سے

ابھرے تو جوش بادہ گساراں نہیں رہا | بادل گھرے تو رنگ بہاراں نہیں رہا
راتیں کھلیں تو رقص نگاراں نہیں رہا | بوتل کھلی تو مجمع یاراں نہیں رہا

کوئی سبیل بادہ پرستی نہیں رہی
مستی کی رات آئی تو مستی نہیں رہی

عاشق جو وصل یار سے خورسند ہو گیا | فالج گرا دماغ پہ دل بند ہو گیا
اترا بخار عقل کو طاعون ہو گیا | پیدا ہوا لہو تو جگر خون ہو گیا

بخیہ ہوا تو اور بھی چادر ادھڑ گئی
بند ھن کھلے تو جسم کی رگ رگ اکڑ گئی

چلنے لگی لغت پہ چھری انتقام کی | چھانٹی گئیں تمام جو لفظیں تھیں کام کی
رحمان ہی کی بات چلی اور نہ رام کی | گدی سے کھینچ لی گئی جو زباں تھی عوام کی

حیوان بوکھلا گئے منہ کھولنے لگے
انساں بولیاں وہ نئی بولنے لگے

سرو سہی نہ ساز نہ سنبل نہ سبزہ زار | بلبل نہ باغباں نہ بہاراں نہ برگ و بار
جیحوں نہ جام جم نہ جوانی نہ جوئبار | گلشن نہ گلبدن نہ گلابی نہ گل عذار

اب بوئے گل نہ باد صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

صلح کانفرنس کی شکست اور جنگ کا آغاز

علّامہ شبلی نعمانی

دیکھا جو لیگ نے کہ ہوا خاتمہ تمام
از بسکہ دست حق طلبی اب دراز ہے

کہنے لگے ہیں سب کہ سیاست کا یہ نظام
مقبول خاص و عام نہیں، خانہ ساز ہے

تقسیم مشرقی نے عیاں کر دیا ہے سب
جو شاہ راہ حق میں نشیب و فراز ہے

جاری ہے ہر زباں پہ مساوات کا سبق
ہر خاص و عام پردہ در امتیاز ہے

مجبور ہو کے لیگ نے الٹا یا ہے ورق
جو سر بسر مرقع نیرنگ ساز ہے

چہرہ پہ ہے جو سلف گورنمنٹ کا نقاب
ہر دیدہ ور اسیر طلسم مجاز ہے

سمجھے نہ یہ کہ "سوٹ ایبل" کی جو شرط ہے
تمہید سجدہ ہائے جبین نیاز ہے

سمجھے نہ لوگ یہ، کہ یہی لفظ پر فریب
اس ملک میں طلسم غلامی کا راز ہے

سب یہ سمجھ رہے ہیں کہ اب لیگ کانگرس
دونوں کا ایک عرصہ گہہ ترکتاز ہے

× × ×

جب تک کہ لوگ حلقہ بگوش خواص ہیں
جب تک زبان قوم خوشامد طراز ہے

جب تک ہیں لوگ عالم بالا سے مستفیض
جب تک بہم یہ دور "قدح ہائے راز" ہے

احرار سے کہو کہ نہیں کچھ امید "صلح"
ٹلتا نہیں جو تفرقہ و امتیاز ہے

آزادی خیال پہ تم کو ہے گر غرور
تو لیگ کو بھی شان غلامی پہ ناز ہے

× × ×

یہ فیض ہے جماعت "احرار" کا ضرور

اب قوم کو جو شخص پرستی سے عار ہے

آزادی خیال کا جو کچھ کہ ہے اثر

یہ سب انھیں کے فیض کا منت گزار ہے

لیکن یہ دیکھنا ہے کہ یہ عزم یہ ترنگ

ہے دیرپا، کہ جوشِ جنونِ بہار ہے

× × ×

اب کے جو لکھنؤ میں دکھایا گیا سماں

سچ پوچھیے تو مضحکۂ روزگار ہے

دیکھا یہ پہلے دن، کہ ہر اک گوشۂ بساط

میدانِ رزم و عرصہ گہ گیر و دار ہے

غل ہے کہ وہ "مقدمۃ الجیش" آ گیا

اب انتظار فوج یمین و یسار ہے

احرار کی صفوں کی صفیں ہیں جمی ہوئی

مجلس تمام، عرصہ گہ کارزار ہے

اسٹیج پر ہر ایک بپھرتا ہے اس طرح

گویا حریف رستم و اسفندیار ہے

ہاتھ اٹھ رہے ہیں، یا علمِ فتح ہے بلند

چلتی ہوئی زبان ہے یا ذوالفقار ہے

ہر نوجواں ہے نشۂ آزادگی میں مست

جو ہے وہ حریت کا سر پُر خمار ہے

احرار کہہ رہے ہیں... نہ مانیں گے ہم کبھی

ویٹو کا ویسرائے کو کیا اختیار ہے

الحاق اگر نہیں ہے تو ہر سعی ہے عبث

مسلم لیگ کا لفظ خاص ہمارا شعار ہے

جو والیان ملک، کہ تھے زیب انجمن

سب دم بخود تھے کہ یہ کیا خلفشار ہے

× × ×

یا صبح دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں — نے وہ خروش و جوش نہ وہ گیر و دار ہے

ٹوٹی ہوئی ہیں صفیں، علم سرنگوں ہیں سب — بازوئے تیغ گیر جو تھا، رعشہ دار ہے

"سازش" کا ایک جال بچھایا ہے ہر طرف — ہر شخص "حکمت عملی" کا شکار ہے

× × ×

جو بات کل تلک سبب ننگ و عار تھی — وہ آج مایۂ شرف و افتخار ہے

جس بات پر کہ نعرۂ نفریں بلند تھی — اب وہ قبول خاطر ہر ذی وقار ہے

کل کہہ چکے ہیں کیا، یہ نہیں اب کسی کو یاد

اب نکتہ ہائے زیر لبی پر مدار ہے

خود آپ اپنے ہاتھ سے کھائی ہے "شکست"

کہتے ہیں پھر "یہ فتح مبیں یادگار ہے"

× ×

حیران تھے عوام کہ کیا ماجرا ہے یہ؟
یہ کیا دو رنگیٔ چمنِ روزگار ہے
"احرار" کا طریق عمل ہے اگر یہی
پھر کامیابیوں کا عبث انتظار ہے

× × ×

ظفر علی خاں

اشنان کرنے گھر سے چلے لالہ لال چند
اور آگے آگے لالہ کے ان کی بہو گئی
پوچھا جو میں نے لالہ للائن کہاں گئی
نیچی نظر سے کہنے لگے وہ بھی چو گئی
میں نے دیا جواب انھیں از رہِ مذاق
کیا وہ بھی کوئی چھت تھی کہ بارش سے چو گئی
کہنے لگے کہ آپ بھی ہیں مسخرے عجیب
اب تک بھی آپ سے نہ تمسخر کی بو گئی
"چو" ہوشیار پور میں ندی سے ہے مراد
بی بی تمیز بھی وہیں کرنے وضو گئی
میں نے کہا کہ چو سے اگر ہے مراد جو
پھر یوں کہو کہ تا نہ لب آب جو گئی

کیوں اینٹھتے ہیں ماش کے آٹے کی طرح آپ
دھوتی سے آپ کی نہیں ہلدی کی بو گئی

لطف زباں سے کیا ہو سروکار آپ کو
دامن کو آپ کے نہیں تہذیب چھو گئی

ہندی نے آ کے جسم کو چے سے بدل دیا
جو آئی کہسار میں گلشن سے جو گئی

لہجہ ہوا درشت زباں ہو گئی کرخت
لطف کلام و شستگیِ گفتگو گئی

معنی کو ہے گلہ کہ ہوا بے حجاب میں
شکوہ ہے لفظ کو کہ مری آبرو گئی

افسوس ملک میں نہ رہی فارسی کی قدر
مستی اڑی شراب سے پھولوں سے بو گئی

بوم میرٹھی

کیا کہوں شوق ہوس نے مجھکو اندھا کر دیا
کیا خبر ہے بیخودی میں میں نے کیا کیا کر دیا
کیا ذرا سی بات تھی جسکا فسانہ کر دیا
میں نے اک بوسہ لیا اور تم نے دعوی کر دیا
خود ہوئے بدنام اور مجھکو بھی رسوا کر دیا

کہہ دیا دامن پکڑ کر صاف میں نے ان سے آج
کس لئے رکھا ہے سر پر یہ مسیحائی کا تاج
پوچھنے کے واسطے آئے نہ تم میرا مزاج
ہو نہیں سکتا جو تم سے دردِ فرقت کا علاج
تم کو کس الّو کے پٹھے نے مسیحا کر دیا

رہ گیا تھا میں ہی کیا پٹنے پٹانے کے لئے
کوئی بھی آیا نہیں میرے بچانے کے لئے
اور تو ایجان تھا سب گھر میں کھانے کیلئے
صرف ترکاری نہ لایا تھا پکانے کے لئے
مارے گھونسوں کے مری بیوی نے بھرتا کر دیا

ٹھہرنے دیتا نہیں یکجا اسے ویرانِ سر
یہ کبھی اس شاخ پر بیٹھا کبھی اس شاخ پر
دیکھ لو خالی نہیں جاتا تخلص کا اثر
بوم کو کچھ بھی نہیں اپنے سر و پا کی خبر
شاعری نے اب اسے الّو کا پٹھا کر دیا

کونسل الکشن ریس

سید مقبول حسین ظریف لکھنوی

جب کونسل کے جم خانے میں سبے والی گھوڑ دوڑ ہوئی
اکتوبر میں لوکل ریسز کا حال کھلا ہم پر سارا

ہر سو تھا چماروں میں چرچا ہنس ہنس کر کہتے تھے جا کر
گھوڑے کی بدھیا بیٹھ گئی پھر یونی نے پالا مارا

جتنی ٹٹو میں عزت تھی، اتنی گھوڑے میں چالا کی
اک سوکھا سہما ڈگا سا رگ کھاتے ہوئے دانا چارا

اُن دونوں دیسی گھوڑوں میں یونی کے ٹریز کانگریسی
انگلش اصطبل کا ایک اڑیل آگے نہ بڑھا یوں جی ہارا

اتنے میں کہا اک جاکی نے اب دوسری دوڑ کا حال سنو
جس میں کہ بلٹ گئے بک میکر اتنا ہارا ہر دکھیارا

جو سن پچپن میں دوڑا تھا اس کا تھا بھاؤ برابر کا
جواب کی سال شریک ہوا اس پر تھے ایک کے دس بارا

مثلاً عربی دو گھوڑے یہ میدان میں آئے ریس کے جب
اک ان میں بانسوں آگے تھا اک پیچھے پیچھے بے چارا

کمپنو کے جواری گھبرائے، جب چار طرف سے شور ہوا
دونی اور چوپڑ دلواؤ، سبزہ جیتا مشکی ہارا
کچھ دن یہ ظریف تماشا ہے پھر آگے چل کے کچھ بھی نہیں
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہوس شہرت

گورنمنٹ کا ابر رحمت جو بھر دے
خطابوں کے چھینٹوں سے سوکھی تلیاں
ابا ہیچ کھڑے ہوں نہ پیروں پہ اپنے
ذرا گر حکومت پہ چڑھ جائے گھڑیاں
ملے سیکڑہ پھر بکیں رائے صاحب
نہ پوچھے کوئی آم جیسے بھدیاں
گورنر کا بن جائے جو خانساماں
بنائیں گے وہ قوم کی کیوں رسیاں
کریں بعض تو سجدۂ احترامی
خوشی سے پڑیں لاٹ صاحب کے پیاں
بنا دیں جو سید سے وہ خانصاحب
تو دوڑے ہر اک پوربی اور پچھیاں
لیاقت سے کیا کام شہرت سے مطلب
ہوئے نامور جیسے شہدوں میں نیاں
یہی تو ہے معراج خاں صاحبی کی
ام۔ ایل۔ سی جو بھولے سے کر دے گتیاں
بساط سیاست کی اک چال یہ ہے
نہیں گوٹ ملتی تو رکھتے ہیں ٹیاں
بڑے دن میں جو کیک کھائیں خوشی سے
مزا دیں انھیں عید کی کیا سویاں
چراگاہ کونسل کی رونق ہیں دونوں
مسیحا کی بھیڑیں کنھیا کی گیاں

ظریف ایسے کالے کلوٹوں کے صدقے
کوئی ہے ذرا بڑھ کے لے لے بلیاں

جنوں میں کیوں چلا میں دوڑ کر پھوڑا جوم میرا
حماقت کی نشانی بن گیا نقش قدم میرا
شمیم زلف مشکیں سونگھ کر نکسیر پھوٹی ہے
ترے بالوں کی بو سے ناک میں آیا ہو دم میرا
وفور شوق میں معشوق کو دے دے پٹکتا ہے
کوئی خلوت سرائے ناز میں دیکھے ادھم میرا
میاں فرہاد و مجنوں شیخ چلی ہیں جو لڑتے ہیں
یہ کہتے ہیں عرب میرا وہ کہتے ہیں عجم میرا

فلک نما ہے بلندی میں آبلا دل کا
جواب شیش محل ہے وہ منزلا دل کا
حوادثات کی چیتیں بہت کرارِی ہیں
کہیں دماغ نہ ہو جائے پلپلا دل کا
ظریف حشر میں ہو گی تلاشی اعمال
فرشتے کھول کے دیکھیں گے پوٹلا دل کا

بگولے ناچتے تھے نجد میں اور قیس عریاں تھا
یہ سب کیا تھا فقط لیلیٰ کی دلچسپی کا ساماں تھا
مرا دل ڈاک بنگلہ اور تصور خانساماں تھا
خیال یار جنٹلمین کی صورت سے مہماں تھا
جنوں اک شعبدہ تھا میرے خاک اڑتے ہوئے دل کا
کبھی گھر تھا بیاباں میں کبھی گھر میں بیاباں تھا
ظریف اس کو طلسم بحر ہستی کیا نظر آتا
جو عاشق ان کا کچھوے کی طرح سر در گریباں تھا

سرِ تپنج

عبداللہ صاحب ناصر بمبئی

مس بوزینہ دمشق کے عشق میں ہم مبتلا ہو کر
منڈائے مونچھ داڑھی پھر رہے ہیں بوزنا ہو کر
سکھائیں ہم کو بد تہذیبیاں تہذیب مغرب نے
کیا گمراہ اس ظالم نے ہم کو رہنما ہو کر
جمی ہے راکھ کوئلے پر کہ پوڈر کالے چہرے پر
عبث ہے گورا بننے کی یہ کوشش کالیا ہو کر
مس مغرب اگر تا عرش اڑتی ہے تو اڑنے دو
بتِ مشرق نہیں کچھ کم وہ دم لے گا خدا ہو کر
زبردستوں سے جب پڑتا ہے پالا زیردستوں کا
خطائیں ماننی پڑتی ہیں اپنی بے خطا ہو کر
نہیں جب پردے کے پابند مہر و ماہ اے ناصرؔ
مسز خورشید پردے میں رہی کیوں مہ لقا ہو کر

ساقی نامہ

برگیڈ الشعرا شہباز بلند پرواز (حیدرآباد) ۳۰ نومبر ۳۶ء

نہایت لطف سے آئی ہے صبح سال نو ساقی
ہمیشہ ایک دو ملتے تھے لیکن آج سو ساقی

ہزاروں آرزوئیں لیکے آئے ہیں ترے در پر
دیے جا آج تو تازہ بتازہ نو بنو ساقی

کہیں ایسا نہ ہو پھر بھیڑ لگ جائے تو رہ جائیں
سویرا ہے ابھی تو آتے ہیں کل آٹھ نو ساقی

گزشتہ سال سب گھر کا اثاثہ بیچ ڈالا تھا
ہم اب کی سال کر دیں گے مسز کو بھی گرو ساقی

بہار فاقہ مستی آئی ہے بھر بھر کے دیتا جا
کہ اب گھر میں نہ چاول ہیں نہ دالیں ہیں نہ جو ساقی

کھلا ہے جب در میخانہ کیسا نور پھیلا ہے
ہے شام نامرادی کی تجلی ریز تو ساقی

تجھے شیخ و برہمن پادری دیتے ہیں تہنیت
کوئی درشن کوئی تسلیم تجھ کو کرتے ہیں تو ساقی

اگر تو مجھ سے پوچھے زہر بھی دیدوں تو پی لیگا
قسم ہے خشت میخانہ کی میں کہدوں نگاہو ساقی

ترے رندوں پہ اب چودہ طبق کے حال روشن ہیں
ہے مہر و ماہ سے بڑھکر ترے ساغر کی ضو ساقی

چراغ صبح کے مانند کوئی دم کا مہماں ہوں
سہارا ہے فقط تیرا لگی ہے تجھ سے لو ساقی

روانی کیوں نہ ہو شہباز کے ہر شعر میں ظاہر
براندی تند ہے تیری قلم ہے تیز رو ساقی

سید محمد جعفری

اے کراچی

اے کراچی کٹھمل اور مکھی کے دیرینہ وطن
سب کو یہ دو نعمتیں ملتی ہیں تجھ سے تحفتاً
اور شہید ناز ہو جاتے ہیں گلگوں پیرہن
کب تلک ہم سے تغافل کب تلک بیگانہ پن
سرد مہری اور گرمی کا تری کیا آسرا
سندھ صوبہ کی وزارت کی طرح موسم ترا
حسن تیرا دل فریب اور دل سے سب لاچار ہیں
اس لئے تصویر محشر کوچہ و بازار ہیں
گو مکانوں کی کمی سے سب زبون و خوار ہیں
تیرے عاشق تجھ پہ مرنے کے لئے تیار ہیں
وہ نہ جائیں گے اگر بنیاد کو ڈھادے قضا
تو ہی کچھ تدبیر بتلا کیا کریں "ہاشم رضا"
ویسے کوئی مکاں خالی نہیں آتا نظر
اور نکیں دو چار دن کے واسطے جائے اگر

چھوڑ جائے شومیٔ قسمت سے خالی اپنا گھر
سونگھتے پھرتے ہیں ہمسائے ادھر کوئی ادھر
بے تکلف گھر میں گھس جاتا ہے یہ کہہ کر ہجوم
"ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم"
پگڑیاں دے کر ترے دربار میں آتے ہیں لوگ
"ہاؤس بلڈنگ یونین" سے دل کو بہلاتے ہیں لوگ
تیرے پہلو میں خیالی قلعے بنواتے ہیں لوگ
رات کو فرشِ زمیں پر تھک کے سو جاتے ہیں لوگ
گردِ غربت میں انھیں کوئی نشاں ملتا نہیں
مسجدیں کم ہیں خدا کو بھی مکاں ملتا نہیں
تیرے بازاروں کی رونق اور شہروں میں کہاں
حسن سے شرما کے بجھ جاتی ہیں اکثر بجلیاں
پر دلِ وحشی کو مل سکتی نہیں پھر بھی اماں
آ کے لٹ جاتا ہے بازاروں میں "بھولا پہلواں"
پھر نہ دنگل کام آتے ہیں نہ کوئی داؤ پیچ
ساری دنیا ہے مریضِ عشق کی آنکھوں میں ہیچ
زاہد و ملا کو یہ باتیں ہیں تیری ناپسند
رہگذر میں شعلہ رُو دل کو بناتے ہیں سپند

ان کی صحت کے لئے یہ سب ہے بے شک سودمند
خاص کر راشن سے جب ملتی ہے شکر اور قند
ہیں نمایاں وہ سپردہ زور کی لاحول سے
ان کو بھی الفت ہے محبوبوں کے اس ماحول سے
اے کراچی حسن کا تو نے لیا ان سے خراج
جو ترے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہیں با صد احتیاج
ان کے جسم و روح کے رشتے ہیں محتاج علاج
عاشقوں کا دل نہیں ہے کم تر "از سکھ بواج"
شاعروں اور عاشقوں کی آہ طوفانی سے ڈر
تو سر ساحل ہے بحرِ غم کی طغیانی سے ڈر
اور ہوں گے شہر جن میں اونٹ ہی بدنام ہے
اس زمیں پر "حضرتِ اُشتر" کا جلوہ عام ہے
اور ملکوں میں گدھا مجبور ہے ناکام ہے
"خرِ عیسیٰ" یہاں پر واجب الاحترام ہے
قدرتِ حق دیکھنی ہو تو گدھا گاڑی کو دیکھ
اس پہ چڑھ کر جا کلفٹن اور کیماڑی کو دیکھ
ٹریم بھی چلتی ہے اور چلتی ہے اس میں بھیڑ بھاڑ
یوں نظر آتی ہیں جیسے جائے انسانوں کا جھاڑ

راستے میں اس کا کنڈکٹر سے ہوتا ہے بگاڑ
وہ مسافر اور ٹکٹ چیکر کی باہم چھیڑ چھاڑ
جیب کتروں کے لیے بھی عیشِ بے اندازہ ہے
خانۂ مجنوں صحرا اگر دبے دروازہ ہے
تجھ میں گاندھی گارڈن اک سیر گاہِ عام ہے
طائرِ دل جس میں پھنس جائے یہاں وہ دام ہے
ہر نگاہِ فیصلہ کن موت کا پیغام ہے
لیک ملکس بھی ہے اس میں مجلسِ اقوام ہے
بند ہیں پنجروں کے اندر ایسی اقوامِ کہن
مورثِ اعلیٰ جنھیں کہتے تھے مسٹر ڈارون
ہیں ترے نقار خانے میں بہت سی بولیاں
اس میں چپ بیٹھی ہے تنہا طوطیِ شیریں بیاں
یعنی وہ اُردو جو ہجرت کر کے آئی تھی یہاں
جنگ آمادہ ہیں اس بیگم سے گھر کی باندیاں
اس کی قدر و منزلت سے دل ترا بیگانہ ہے
"گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے"
بس بھی چلتی ہے یہاں پر جیسے چلتی ہو ہوا
جی میں جب آیا چلیں اور جس طرف منہ اٹھ گیا

ٹھہر جائیں راہ میں موسم جو دیکھیں جانفزا
دفعتاً چل کر رکیں اور رک کے چلدیں بارہا
دور سے آئیں تو چل دیں ڈال کر ترچھی نظر
رہ گئے فٹ پاتھ پر عاشق کلیجہ تھام کر

اے کراچی، اے عروسِ ساحل، اے تاج البلاد
سینۂ صحرا پہ تو ہے جنت ذات العماد
قائدِ اعظم کو لے آئی یہاں بادِ مراد
ملک پاکستان کے مانند تو بھی زندہ باد
تو مری لیلیٰ ہے مجھ سے عشق مجنونانہ ہے
تیرے سینے میں نہاں اک گوہر یکدانہ ہے

فرقت کاکوروی

پروکیورمنٹ ۔ فراہمی غلّہ

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو دانہ
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

سنہ ۶۰ء میں میری کتاب مدآوا میں آزاد نظم لکھنے والوں پر

باندھکر اپنے رفیق شب تنہائی کو
یعنی اک اپنی پھٹی تہمد کو
اک ذرا شام سے میں لیٹ گیا
پیٹ پر باندھ کے پتھر دو چار
میں نے دم سادھ لیا۔
پہلے بنیوں کو لیا
لے کے پھر نام ہر ک بنئے کا
گالیاں دیتا رہا
اور پھر دیر تلک
کروٹیں لیتا رہا
کوستے کوستے کچھ تھک سا گیا
اور پھر اُونگھ گیا
اور پھر تین گراں ڈیل سے خواب

دل کو دہلانے لگے
اور برمانے لگے
میرے سینہ کو مرے آگ بھرے معدے کو

سوتے سوتے مجھے محسوس ہوا
جیسے اک دیو سا ہے سر پہ کھڑا
میں نے گھبرا کے کہا۔
"کون ہے —— بے۔؟
بولا۔ میں —— کوئی نہیں بنیا ہوں
کہا کیا کام ہے کیوں آئے ہو
توند کو ہاتھ سے سہلا کے ہنسا —— اور پھر
جیب بجا کر بولا —— ؟
آج کل بھاؤ ہے کیا —— ؟
میں نے جھلّا کے کہا —— ؟
ابے۔ کس چیز کا —— غلّہ کا کہ خربوزوں کا ؟
اس پہ گھبرا کے ہنسا —— اور بولا —— ؟
اور کس چیز کا —— گیہوں کے سوا ۔
میں نے رڑا کے کہا —— ؟
کیوں بے گیہوں کے چنے —— ؟

ہم بھی کیا تیری طرح بنئے ہیں
بنیا بقال سمجھ رکھا ہے ۔
یا تپانے کے لئے آیا ہے
اور ہم سوختہ سامانوں کو
خون کے گھونٹ پلانے کے لئے آیا ہے
تجھ کو معلوم نہیں ۔
سن تینتالیس کا بنگال ہیں ہم
مستقل کال ہیں ہم
زلف بنگال ہیں ہم
لا ۔ ذرا ہاتھ تو ـــــ لا ۔
دیکھ ہم پیٹ پہ کیا باندھے ہیں
تہمد ہے ـــــ ؟
ابے ۔ تہمد ہے ؟
نہیں گیہوں ہیں ـــــ ؟
اسے گیہوں ہیں ـــــ ؟
انقلاب آنے تو دے ؟
تجھ کو ہم کوس کے کھا جائیں گے ۔
جانتا ہے تو چچا غالب کو ـــــ ؟
فاقہ مستوں کے لئے چھوڑ گئے ہیں کہہ کر

"میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا"

کیوں جی تم کون ہو۔ کیوں آئے ہو۔
میں یہاں آپ کی تحصیل کا کارندہ ہوں
ڈپٹی صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔
ہاں تو پھر۔
آپ کے نام کا اک نوٹس ہے۔
تو ذرا زور سے پڑھ۔
مگر ہندی میں ہے یہ ؟
ہاں تو پھر ؟
سخت ہندی میں ہے یہ
اس میں سرکار نے لکھ بھیجا ہے
کہ ہے جو آپ کے ذمے غلّہ
اس کو کل شام تلک
آپ تحصیل میں تلوا ڈالیں
اور حضور ——
منہ زبانی یہ کہلوایا ہے
کہ جو انکار کریں۔

اطلاع آ کے کرو۔
اک ذرا ہاتھ تو لا۔
دیکھ یہ کیا ہے بندھا
گھڑی ہے
ابے گھڑی ہے
نہیں پتھر ہے۔
بس تو اب جا کے یہی کہہ دینا
کہ وہ آزاد حکومت کو لئے بیٹھے ہیں
اپنی کھٹیا پہ اداس
اور قبلہ کی طرف منہ ڈالے
آپ کی شان میں کچھ کہتے ہیں
آپ سنیئے گا تو شرمائیے گا

کہا ـــــ کیا کام ہے کیوں آئے ہو
میں ہوں جنتا کا غلام
آپ ممبر بھی تو ہیں
جی ـــــ ہیں
ممبر بھی ہوں ۔ لیڈر بھی ہوں ۔ مکھیا بھی ہوں
ووٹ لینے کے لئے آئے ہیں

جی - نہیں -

ہاں تو پھر ---؟

اسی غلّے کے لئے آیا ہوں

اک پولس میں ہے دو افسر ہیں

یہ بھی سب آئے ہیں غلّے کے لئے

خیر کوئی بات نہیں

آپ تکلیف میں ہیں

بیٹھئے میرے سرہانے اور پھر

شغل تیس سے فرمائیے میں دم لے لوں

اور جو دو چار بڑے پتھر ہیں

میرے معدے پہ بندھے

اُن کو فی الحال کسی سنٹر میں

پہلے تلوا کے مجھے دیدیجئے

پورے غلّہ کی رسید

خیر -

آپ نے اس کو ہنسی کھیل سمجھ رکھا ہے

ایک کنٹاپ کی آواز - الٰہی توبہ

گولیاں چلنے لگیں چلنے لگیں، چلنے لگیں

اور میں چیخ اٹھا۔
اس پہ بیگم نے ہلا کر شانہ
مجھ سے گھبرا کے کہا۔
کیا ہوا کیا ہوا —— کلمہ تو پڑھو۔

بچہ کشوں کے دیش میں

غلام احمد فرقت کاکوروی

ہم نشیں مت پوچھ شادی کا سماں
آہ اے ہندوستاں جنت نشاں
اس جگہ گر آج شادی کیجئے
دوسرے ہی دن سے اولادوں سے ویگن لیجئے
اور اس ویگن میں پھر
بچوں کا شور
سب کا نچوڑ
کچھ آپ کا، کچھ آپ کا، کچھ آپ کا
اور پھر اس شور میں
اس زور میں

کان میں ماں باپ دے لیں انگلیاں
بھول جائیں پی کہاں
اور گھبرا کر کہیں
یہ کیا ہوا ؟
اور اس پر سب کہیں
اچھا ہوا
دیش کی زینت بڑھی
عزت بڑھی
شہرت بڑھی
جو کیا اچھا کیا
جو کچھ ہوا ۔ اچھا ہوا
اور پھر ہر فرد کی
یہ مانگ ہو
آسماں بچوں کا ہو
سارا جہاں بچوں کا ہو
ساری زمیں بچوں کی ہو
ہر شہ نشیں بچوں کی ہو
باغ ہوں بچوں کے سارے گلستاں بچوں کے ہوں
پاسباں بچوں کے ہوں

اور باغباں۔ بچوں کے ہوں
چاندنی بچوں کی ہو
اور چاند ہو بچہ بدوش
تاکہ ہر شے دنیش کی آئے نظر بچہ فروش
اور ہر دم بس یہی اک فکر ہو
اولاد ہی کا ذکر ہو
ہر سمت چاہے کال ہو
سارا جہاں پامال ہو
بدحال ہو
بے حال ہو
کنگال ہو
بچوں سے مالا مال ہو

گھر میں اگر کھانا نہیں
پانی نہیں
دانا نہیں
دولت نہیں
ثروت نہیں
شہرت نہیں

عزت نہیں
چاہے کوئی ناشاد ہو
آباد ہو
برباد ہو
پر گود میں اولاد ہو

گھر میں اگر چلمن نہیں
روزن نہیں
آنگن نہیں
اک شمع تک روشن نہیں
آٹا نہیں ۔ راشن نہیں
پر سوچ تو اے ہمنشیں
بچہ نہیں تو کچھ نہیں

اس دیش میں جو مرد ہے
گو لاکھ چہرہ زرد ہے
بچہ کشی میں فرد ہے
دو چار کا داماد ہے
پھر بھی بڑا آزاد ہے

اور صاحب اولاد ہے

اک دن سفر کو ہم چلے
اور ریل میں ہم گھس گئے
بچوں سے ہم منہ موڑ کر
سارے کلنڈر چھوڑ کر

کچھ اس طرف
کچھ اُس طرف
اور گھیر لیں سیٹیں تمام
رکھا مگر یہ اہتمام
سارے مسافر ہوں کھڑے
ہر سمت ہوں بچے پڑے
اک شور و ہنگامہ رہے
گردش میں پیمانہ رہے
کوئی جئے چاہے مرے
اپنا سفر اچھا کٹے
بچوں کی پیدائش میں ہم
چیں پیں کی آلائش میں ہم
وقفے کبھی دیتے نہیں

دنیا سے ہم ہٹے نہیں
لڑکی ملے، لڑکا ملے
لولا ملے، لنگڑا ملے
پوتی ملے، پوتا ملے
ٹیڑھا ملے سیدھا ملے
ہر سال کچھ ملتا رہے
اور پھول اک کھلتا رہے

جب جانکی کا گھر بسا
اور آٹھواں بچہ ہوا
بولے یہ سنکر جانکی
سب دین ہے بھگوان کی
باوا نے پوچھا کیا ہوا؟
بولے کہ پھر لڑکا ہوا
بولے - چلو اچھا ہوا
اولاد کا کوٹا بڑھا
بولیں کہ یہ کیا کھائیگا؟
اس کے لئے کیا آئے گا؟
کیونکر یہ پالا جائے گا؟

بولے۔ یونہی پل جائے گا
اس کی ابھی سے فکر کیا؟
اس کا ابھی سے ذکر کیا؟
ہم سب فقیروں کو یہاں
اتنی بھلا فرصت کہاں؟
اولاد بھی پیدا کریں
اور بیٹھ کر سوچا کریں
یہ سب کہاں سے کھائیں گے
پیسے کہاں سے آئیں گے
کپڑے کہاں بنوائیں گے
یہ کام ہے سرکار کا
اس سے ہمیں کیا واسطہ

ہاں۔ گر حکومت یہ کہے
بچے نہ اب پیدا کرو
کوئی نیا دھندا کرو
اس بات پر اس سے کہو
فوراً وزارت توڑ دو
ہم کو ہمیں پر چھوڑ دو

اور کرسیاں خالی کرو
بچوں کی رکھوالی کرو
ہم سب کی نقالی کرو
یہ کام ہے اولاد کا
ماں باپ کا
یہ اپنا اپنا کار ہے
آزادیٔ اظہار ہے
سرکار پر کیا بار ہے؟
ہر فرد ذمہ دار ہے
اولاد کا
افتاد کا
غلّہ نہ ہو، پیسہ نہ ہو، کپڑا نہ ہو، لتا نہ ہو
چڑیا کا اک بچہ تو ہو

وہ جن کا بہتر حال ہے
ان کا بھی یہ احوال ہے
جب سائیکل پر چل دیے
کل فیملی اپنی لئے
دو ٹوکری میں ہیں نہاں

دو کا ہے ڈنڈے پر مکاں
شانوں کو دو پکڑے ہوئے
گردن میں دو جکڑے ہوئے
ہے کیریر پر ماں لدی
لڑکی ہے کھونٹی سے بندھی
سیکل نے فراٹے بھرے
لڑکوں نے خراٹے بھرے
پھر زن زنا زن زن زنن
زن زن زنا زن زن زنن

گویا پتہ اس سے چلا
بازار کی زینت ہیں ہم
کونین کی قیمت ہیں ہم
سڑکوں پہ جسدم کیو لئے
بچوں کا پورا ویو لئے
بازار جب جاتے ہیں ہم
احسان فرماتے ہیں ہم
جن جن کو اکساتے ہیں ہم
ان کی ڈپٹ کھاتے ہیں ہم

اِن جھڑکیوں کے زور میں
ان کھڑکیوں کے شور میں
کہتے ہیں سب دم لیجئے
واللہ اب بس کیجئے
لیکن یہ ہمت دیکھئے
یہ نیک طینت دیکھئے
اس دھُن میں آتے نہیں
دنیا سے شرماتے نہیں
چپکے چلے جاتے ہیں ہم
اک اپنا پورا اکیوٗ لئے

غلام احمد فرقت کاکوروی
پہاڑی بھوجلہ، مکان نمبر ۷۰۵
دلّی

کنہیا لال کپور

بول کبوتر بول

بول کبوتر بول
دیکھ کوئلیا کوک رہی ہے
من میں میرے ہوک اٹھی ہے
کیا تجھ کو بھی بھوک لگی ہے
بول غٹر غوں بول - کبوتر
بول کبوتر بول

بول کبوتر بول
کیا میرا ساجن کہتا ہے
کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے
کیوں میرے طعنے سہتا ہے
بھید یہ سارے کھول کبوتر
بول کبوتر بول

برہمن کا سندیس

اڑجا دیس بدیس رے کوئے، اڑجا دیس بدیس
سن کر تیری کائیں کائیں
آنکھوں میں آنسو بھر آئیں
بول یہ تیرے من کو بھائیں
مت جانا پردیس رے کوے اڑجا دیس بدیس

بینگن

چنچل بینگن کی چھب نیاری
رنگ میں تم ہو کرشن مراری
جان گئی ہیں سکھیاں پیاری
رادھا رانی آہی گئی تو
کرشن کنہیا ڈھونڈ رہے ہیں
لیکن میں تو بھول چکا ہوں
بینگن سے یہ بات چلی تھی
بھوک لگی ہے کتنی ہائے
جی میں ہے اک بھون کے بینگن
کھاؤں لیکن رادھا پیاری

رنگ کو اس کے دیکھ کے مجھ کو
یاد آتے ہیں کرشن مراری
اس لئے بھو کا رہنا بہتر
چونکہ میں ہوں پریم پجاری

خون بھر آیا دل زار میں خون نہیں
سائیکل ہو گا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمۂ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا